راہِ عمل

۱۔ نقوشِ موعظت
۲۔ حقائق اور غلط فہمیاں
۳۔ نئے مسائل، اسلامی نقطۂ نظر

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جلد اوّل



زمزم پبلشرز

راہِ عمل ①

نقوشِ موعظت

جس میں موجودہ حالات میں بین الاقوامی اور
ملکی مسائل وحالات اور خود مسلمانوں کی ذمہ داریوں
پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف حادثات اور تاریخی
واقعات کے پس منظر میں عبرت وموعظت کے
پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی

کتاب کا نام ——— زادِ عمل ۱ نقوشِ موعظت

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دار الہدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دار الاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

- **Madrassah Arabia Islamia**
  1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
  Azaadville South Africa
  Tel . 00(27)114132786

- **AL FAROOQ INTERNATIONAL**
  68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
  Tel : 0044-116-2537640

- **ISLAMIC BOOK CENTRE**
  119-121 Halliwell Road, Bolton
  BI1 3NE U.S.A
  Tel/Fax : 01204-389080

- **Azhar Academy Ltd.**
  54-68 Little Ilford Lane
  Manor Park London E12 5QA
  Phone 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے اور واقعات وحادثات کی آماجگاہ ہے، شاید کوئی دن گذرتا ہو کہ کوئی خوش کن یا غم انگیز اور مذہبی یا سماجی واقعہ پیش نہ آتا ہو، بعض واقعات ایمان وعقیدہ کا حصہ ہیں، بعض وہ ہیں جن کو تاریخ کے واسطہ سے کانوں نے سنا ہے، اور بعض وہ ہیں، جنھیں سر کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ان واقعات میں عبرت وموعظت کے نقوش تلاش کئے جائیں، اور اپنی عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کی جائے۔

چنانچہ راقم الحروف روزنامہ منصف کے کالم ''شمع فروزاں'' میں بعض اوقات اس پہلو سے بھی قلم اُٹھاتا رہا ہے، ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ''نقوشِ موعظت'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے، یہ مضامین متنوع موضوعات پر ہیں، اور ان میں قدرِ مشترک یہی ہے کہ ہر واقعہ کو عبرت آمیز اور موعظت خیز نظر سے دیکھا جائے۔

اس سے پہلے ۱۹۹۸ء میں شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کا ایک مجموعہ ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، جس میں تمام مضامین ایک ساتھ شریک اشاعت ہیں، اب کئی سال کے مضامین جمع ہوگئے تھے، اور ان کی ضخامت بھی اچھی خاصی ہوگئی، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اسے ایک مشترک نام دیا جائے، کیوں کہ اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ عمل کی دعوت دی جائے اور اپنی عملی زندگی کا احتساب کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت سے ان میں مختلف مجموعوں کی مستقل حیثیت بھی ہے، --- اس پہلے مجموعہ کی ترتیب عزیز گرامی مولانا شاہد علی قاسمی (استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے انجام دی ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو لوگوں کے لئے نافع بنائے، نیز اس حقیر کے لئے ذخیرۂ آخرت فرمائے، واللہ ہو المستعان۔

۱۳/شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹/ستمبر ۲۰۰۴ء

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرضِ مرتب

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو وجود بخشنے کے بعد جب حضرت انسان کو اس میں آباد کیا تو جہاں اس خاکی پیکر کی راحت وآرام اور اس کی جملہ ضروریات کا سامان فراہم کیا اور اس کے واسطے دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں رکھیں، وہیں ان کی ہدایت ورہنمائی کے ذرائع بھی پیدا فرمائے، تاکہ انسان اپنے خالق ومالک کی مرضیات کے مطابق زندگی گذارے۔

ان ہی ہدایات اور عبرت وموعظت کی چیزوں میں ایک کائنات کا وسیع نظام، اس میں کارفرما قانونِ فطرت اور تکوینی اصول کے تحت پیش آنے والے واقعات و حوادث بھی ہیں، یہ وسیع کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات یقیناً ایک نظام کے تابع ہیں اور محض اتفاقی نہیں، غور کریں تو ان امور میں بھی بڑی حکمتیں اور انسان کے لئے ہدایتیں پوشیدہ ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنے خالق کی بندگی کرنے کی دعوت دیتا اور قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے، گویا زمین کے سینے پر اگنے والے برگ و بار اور غنچہ وگل سراپا پیغام اور خاموش ہادی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر کائناتی نظام کے ذکر کے بعد اس سے سبق حاصل کرنے کا حکم دیا ہے: "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

یہی حال دنیا میں رونما ہونے والے معمولی وغیر معمولی حوادث وواقعات کا ہے، یہ واقعات تکوینی نظام کے تحت پیش آتے ہیں، لیکن ان کے اندر بھی ہمارے لئے بڑا پیغام ہوتا ہے، یہ ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں، آئندہ ان سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور بعض واقعات تو اسی لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ خدا کی نافرمانیوں میں مشغول بندہ جاگے اور اپنے خالق کو یاد کرے، پس ایک مسلمان کا

شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ واقعات وحوادث کے ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ اس کے اصل عوامل کو دیکھے، آئندہ اس سے سبق حاصل کرے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہو۔

استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (اللہ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے) کئی سال سے اردو کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ'' منصف'' حیدرآباد کے منارۂ نور ایڈیشن میں ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھ رہے ہیں، آپ کا یہ کالم بڑے شوق وذوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس کی شہرت ومقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس دن کا اخبار دیگر ایام کے مقابلہ کئی ہزار زیادہ شائع ہوتا ہے اور قارئین کی بڑی تعداد ان مضامین کی فائل بنا کر محفوظ رکھتی ہے۔ یہ مضامین اصلاحی ہوتے ہیں، ان میں مسلمانوں کی رہنمائی بھی ہوتی ہے اور ان کے مسائل کا تجزیہ بھی، معاشرتی مسائل پر اظہار خیال بھی اور نئے مسائل کا حل بھی، مسلمانوں کی پستی کے اسباب بھی بیان کئے جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا راستہ بھی دکھایا جاتا ہے۔

یہ گلہائے رنگا رنگ اور بیش قیمت صدف ریزے روزنامہ'' منصف'' کی فائلوں میں منتشر تھے، راقم نے انہی فائلوں سے کچھ جواہر پاروں کو جمع کیا ہے جو'' نقوش موعظت'' کے عنوان سے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں، اس مجموعہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو حالات و واقعات سے متعلق ہیں اور جنہیں استاذ محترم نے درس عبرت کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان میں موجود درس وموعظت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے، اسی طرح چند مضامین دعوت سے متعلق بھی ہیں جن میں غیر مسلموں میں دعوتی کام کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور اس اہم فریضہ کی ضرورت واہمیت بتاتے ہوئے اس کی طرف سے بے توجہی کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ مضامین بہت اہم اور قیمتی ہیں، شستہ اور ادبی چاشنی سے بھرپور زبان کے ساتھ استاذ محترم کا سوز دروں اور اندرونی تڑپ بھی بین السطور سے جھلکتا نظر آتا ہے، امید ہے کہ قارئین اسے شوق کے ہاتھوں لیں گے اور حضرت الاستاذ مدظلہ کی دیگر کتابوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبول عام وخاص ہوگا۔

۱۵/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

شاہد علی قاسمی

یکم/اکتوبر۲۰۰۴ء

(استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

دو کردار

قرآن مجید ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے۔ اس کے ہر لفظ کی تہہ میں ہدایت کا نور موجود ہے، اس نے دو اہم کردار پیش کئے ہیں، انسانیت کے باپ اور اللہ کے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا اور شیاطین کے سردار ابلیس کا!

ابلیس بھی ''جن'' نامی مخلوق ہی سے تعلق رکھتا ہے، اللہ نے جب یہ حسین و جمیل اور آراستہ و پیراستہ دنیا بنائی تو پہلے اس کو جنوں سے بسایا، مگر انہوں نے خدا کے سامنے جھکنے کے بجائے سرکشی کا ثبوت دیا اور تکبر کی راہ اختیار کی، اس لئے خدا کے حکم سے جنوں کو ازراہِ سرزنش پہاڑوں اور جنگلوں میں قیام کا حکم دیا گیا، انہیں میں ابلیس تھا، یہ بظاہر اپنی قوم سے جداگانہ مزاج رکھتا تھا، مطیع و فرمانبردار اور عبادت گزار، اللہ تعالیٰ گو اس کی باطنی کیفیت سے واقف تھے، لیکن ظاہری حالات کی رعایت سے اس کا درجہ بلند کیا گیا اور اسے عالم بالا میں جگہ دی گئی، اب یہ فرشتوں کا مصاحب تھا اور مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ رہتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آب و خاک کی اس دنیا میں نئی بستی بسانے کی غرض سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، جہاں مٹی کو آپ کا مادہ تخلیق بنایا، وہیں علم و تحقیق کی صلاحیت حضرت انسان کی سرشت میں داخل فرمائی، پھر خالق کائنات کی طرف سے انسان کی عظمت اس طور ظاہر کی گئی کہ قدسیانِ عالم بالا کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ ریز ہونے کا حکم فرمایا گیا، یہ حکم فرشتوں کو بھی ہوا اور شیطان کو بھی، فرشتے تو فوراً ہی سربسجود ہوگئے، لیکن ابلیس کی ''انا'' (جواب تک بہ تکلف دبی ہوئی تھی) نے اب انگڑائی لی، اس نے آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کبر پر اتر آیا، پھر جب اللہ کی طرف سے

دھتکارا گیا اور زمین پر اس کا اخراج عمل میں آیا، جب بھی اسے کوئی پشیمانی نہیں ہوئی اور کبر و علم کے احساس سے وہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کر پایا: بلکہ ایک حد تک اس نے باری تعالیٰ کو قصوروار قرار دینے کی جسارت کی کہ آدم تخلیقی اعتبار سے اس سے کم تر ہے، اس لئے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اس کی تحقیر و اہانت اور گویا اس کے ساتھ ناانصافی ہے، اس نے یہ نہ سمجھا کہ رب کائنات ہی تمام مخلوقات کا مالک ہے اور وہ جس کے لئے جو درجہ و مقام متعین کرے، وہی اس کا صحیح اور اصل مقام ہے۔ یہ ایک کردار ہے جس میں کبر ہے، اپنے ''انا'' کی پرستاری ہے، اعترافِ حقیقت سے پہلوتہی اور خسران و محرومی کے اسباب کو اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

دوسرا کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اس اعزاز و اکرام کے بعد جنت میں رکھے گئے، جنت صرف راحتوں اور نعمتوں کی جگہ ہے، جہاں نہ غمِ امروز ہے اور نہ فکرِ فردا، لیکن انسان ''اُنس'' سے ماخوذ ہے، اس لئے وہ کسی ''انیس'' کے بغیر ہمیشہ بے سکون ہی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک ''اُنسی'' بھی عطا فرمایا اور آپ علیہ السلام ہی سے آپ کے جوڑے حضرت حوا کی تخلیق فرمائی، اب اس وسیع و عریض جنت میں اس جوڑے کو سب کچھ میسر تھا، وہ بھی جو سوچا جائے اور وہ بھی جو تصور سے بالاتر ہو، البتہ ایک پھل کھانے کی ممانعت تھی، شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہو چکا تھا، وہ گو آسمان سے نکالا گیا تھا، مگر دامِ وسوسہ اب بھی آسمان بلکہ جنت تک پھینک سکتا تھا، آخر اس بھولے بھالے انسانی جوڑے نے بھول کی اور وسوسہ شیطانی کا شکار ہو کر اس شجر ممنوعہ سے کھالیا، پھر کیا تھا؟ پہلے لباسِ جنت اُترا اور پھر'' بڑے بے آبرو ہو کر تیری جنت سے ہم نکلے!'' کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام زمین پر اُتارے گئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہندوستان ہی کے جنوبی علاقہ یا سری لنکا میں ہوا تھا۔ حدیث میں آیا کہ حضرت آدم تو اتنا روئے، لجائے، گڑگڑائے، خدا کے سامنے جھکے اور بچھے، ہاتھ پھیلایا اور دستِ عفوخواہی دراز کیا کہ شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ یہ بھی عرض کر سکتے تھے کہ اس میں میرا کیا قصور، یہ تو سب شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے، لیکن

حضرت آدم ﷤ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، پیغمبر سے بڑھ کر نہ کوئی خدا شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کا مرتبہ شناس، حضرت آدم ﷤ نے دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کی ناخوشنودی کی وجہ کو تلاش کیا اور نہایت فروتنی سے عرض گزار ہوئے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر خود ہی بڑا ظلم کیا ہے، اگر آپ ہمیں معاف نہ فرمادیں اور رحم و کرم کا معاملہ نہ فرمائیں تو ہم بے شک سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔'' (الاعراف:۲۳) غور کیجئے! اس دُعاء میں کس قدر عجز و انکسار اور اقرار و اعتراف ہے! سراپا اعتراف و اقرار، نہ ایک حرفِ کبر، نہ کوئی کلمۂ پندار!!

یہ دونوں کردار صرف حضرت ﷤ آدم اور ابلیس کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا میں ہر انسان ان دو میں سے ایک کردار ادا کرتا ہے۔ جس شخص میں حقیقی آدمیت جتنی زیادہ ہوگی وہ حقیقتوں کے اعتراف میں اسی قدر وسیع الظرف ہوگا، عجز و فروتنی اس کے ایک ایک عمل سے نمایاں ہوگی، اس کے بول بھی انکسار کا مظہر ہوں گے، اس کی چال بھی شرافت اور بندگی کی شہادت دے گی، وہ دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا عادی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل و توجیہ کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا داعی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل و توجیہ کے بجائے سیدھے سادے طریقہ پر اعتراف کا مزاج رکھے گا، وہ اپنی خطاؤں پر نادم اور پشیماں ہوتا جائے گا، خطائیں اور لغزشیں اس کو فوراً جھکا دیں گی، خدا کے سامنے بھی اور خلق خدا کے سامنے بھی، جس شخص میں آدمیت کا عنصر جتنا کم ہوگا اور وہ شیطان کے مزاج سے جس قدر قریب ہوگا، اس میں ''انا'' کا جذبہ اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسے اپنی غلطیوں کے اعتراف اور زیادتیوں کے اقرار کا حوصلہ نہ ہوگا، وہ ہمیشہ کسی واقعہ میں ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے گا، اسے لوگوں کے سامنے جھکنے میں اور حق اور حقیقت کا اعتراف کرنے میں عار ہوگی، اُصولوں کا پابند رہنے میں اسے تنگی محسوس ہوگی، اس کی رفتار و گفتار سے ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے تئیں بڑے ہونے کا احساس رکھتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔

اعتراف اور تواضع سے آدمی کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور وہ خدا اور خلق خدا دونوں

کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے، اور انکار و کبر کی وجہ سے کبھی اس کی شخصیت کی اصلاح نہیں ہوتی، خدا بھی اس سے ناراض ہوتا ہے، اور گو خلق خدا وقتی طور پر کسی مجبوری کی وجہ سے زبان نہ کھولے، لیکن وہ اس کی نگاہ میں مغضوب ہی ہوتا ہے، ہر شخص ان دو کردار میں سے ایک سے قریب ہے۔ آیئے! ہم اپنا محاسبہ کریں کہ ہمارا رویہ حضرت آدم سے کتنی مطابقت رکھتا ہے اور اگر ہم اپنے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے اُسوہ سے دور ہیں تو کیا ہم اپنی اصلاح کے لئے تیار ہیں؟؟

(۲۳ر جنوری ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

قرآن مجید اور ہماری ذمہ داریاں

امام عبد اللہ بن مبارک اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محدث ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں ہیں، اور کتنے ہی محدثین وفقہاء کی چشم عقیدت کا سرمہ ہیں، انہوں نے اپنے آپ پر گذرا ہوا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کو بہاء الدین (م:۸۵۰) نے اپنی معروف کتاب ''المستطرف'' (۱/۶۷۔۲۴۷) میں ذکر کیا ہے، یہ ایک بار حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، واپسی میں راستہ میں ایک جگہ دور سے کوئی چیز نظر آئی، قریب پہنچے، اور پہچانا، تو دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو اونی کرتے اور اونی دوپٹے میں ملبوس ہیں، امام عبد اللہ بن مبارک نے سلام کیا، خاتون نے سلام کا جواب ایک قرآنی فقرہ سے دیا ''سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰس:۵۸) سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے ارشاد ہے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا: یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟ کہنے لگیں: مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (الاعراف:۱۸۶) جسے اللہ راستہ نہ دکھائے، اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔'' یعنی یہ راستہ بھٹک گئی ہیں، ابن مبارکؒ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے'' کہنے لگیں: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی (الاسراء:۱) ''یعنی یہ حج کر چکی ہیں اور بیت المقدس کا ارادہ ہے، ابن مبارکؒ نے استفسار کیا کہ کتنے دنوں سے آپ اس مقام پر پڑی ہوئی ہیں؟ خاتون نے کہا: ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (مریم:۱۰) یعنی مسلسل تین راتوں سے، ابن مبارکؒ نے کہا: آپ کے پاس کھانے کا کچھ سامان نہیں ہے؟ خاتون نے جواب دیا: هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ (الشعراء:۷۹) یعنی اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ وضو کس طرح کرتی ہیں جب کہ پانی بھی ساتھ نہیں ہے؟ فرمایا: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (النساء:۴۳) یعنی قرآن کا حکم ہے کہ پانی نہ

ملے تو تیمم کرو، اس پر عمل کرتی ہوں، امام ابن مبارکؒ نے کھانے کی پیش کش کی، تو کہنے لگیں: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی اللَّیْلِ (البقرۃ:۱۸۷) یعنی میں روزہ کی حالت میں ہوں، ابن مبارکؒ نے کہا کہ یہ رمضان کا مہینہ تو ہے نہیں؟ فرمایا: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ (البقرۃ:۱۵۸) یعنی جو یہ بطورِ نفل مزید عمل کرے تو اللہ تعالیٰ قدر داں ہے اور واقف ہے، ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ سفر میں تو ویسے بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:۱۸۴) یعنی روزہ رکھ لینا بہرحال بہتر ہے۔

امام عبداللہ بن مبارکؒ کے حیرت واستعجاب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جاتا تھا، آپ نے دریافت کیا کہ جس طرح میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں آپ بھی اس طرح کیوں نہیں کرتیں؟ جواب ملا: مَا یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (ق:۱۸) یعنی جب بھی انسان کوئی بات کرتا ہے تو نگراں فرشتہ اس پر موجود ہوتے ہیں، گویا بات خوب احتیاط اور تول کر کرنی چاہئے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا کہ آپ کا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟ فرمایا: ولا تقف مالیس لک بہ علم (الاسراء:۳۶) کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، گویا ابن مبارکؒ کے اس سوال پر بوڑھی خاتون نے ناگواری ظاہری کی، امام عبداللہ نے معذرت کی، اور کہا کہ مجھے معاف کردیجئے، جواب ملا: لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم (یوسف:۹۲) کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تم کو معاف کردے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں: میں نے دریافت کیا کہ کیا میں آپ کو اپنی اونٹنی پر سوار کردوں تاکہ آپ اپنے قافلہ سے جاملیں، کہنے لگیں: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰہُ (البقرۃ:۱۹۷) جو بہتر کام کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔ ابن مبارکؒ نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا تاکہ وہ سوار ہوں، کہنے لگیں: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور:۳۰) یعنی ابن مبارکؒ کو نگاہ پست کرنے کے بارے میں اشارہ فرمایا، چنانچہ آپ نے نگاہ پست کرلی اور کہا کہ سوار ہوجائیں، سوار ہونے لگیں تو اونٹنی بدک گئی، اور اس خاتون کا کچھ کپڑا پھٹ گیا تو قرآن کی آیت پڑھی: وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (الشوریٰ:۳۰) یعنی جو

بھی مصیبت انسان کو پہنچتی ہے وہ اپنی شامت اعمال کی وجہ سے، امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں، میں پہلے اونٹنی کو باندھ دوں، خاتون نے کہا: **ففهمناها سليمان** (الانبیاء:.....) امام ابن مبارکؒ فرماتے ہیں: میں نے اونٹنی کو باندھ دیا اور ان سے کہا کہ سوار ہو جائیں، جب سوار ہوئیں تو سواری کی دعاء پڑھی جو قرآن مجید کی آیت ہے: **سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَ اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ** (الزخرف:۱۳،۱۴)

اب سفر شروع ہوا، امام ابن مبارکؒ نے اونٹنی کی لگام تھامی، اور اونٹنی کو تیز ہنکانے کے لئے کسی قدر بلند آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھے، خاتون نے کہا: **وَاقْصِدْ فِیْ مَشْيِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ** (لقمان:۱۹) یعنی رفتار معتدل رکھو اور آواز پست، ابن مبارکؒ نے آہستہ آہستہ **مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ** (مزمل:۲۰) پڑھا کہ آپ کو بڑا خیر عطا کیا گیا ہے، کہنے لگیں: **وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ** (البقرۃ:۲۶۹) کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں، امام ابن مبارکؒ نے کچھ آگے بڑھنے کے بعد دریافت کیا کہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: **يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ** (المائدۃ:۱۰۱) اے ایمان والو! ایسی چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو تم پر ظاہر کیا جائے تو تمہیں ناگواری ہو۔ یعنی اپنے بیوہ ہونے کی طرف اشارہ کی۔

امام ابن مبارکؒ نے پھر کوئی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ قافلہ تک پہنچ گئے، پہنچنے کے بعد خاتون سے دریافت کیا کہ یہاں آپ کے کون لوگ ہیں؟ کہنے لگیں: **اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (الکہف:۴۶) یعنی اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے بچے اور سامان اس قافلہ میں ہیں، میں نے دریافت کیا، حج میں ان کے بچے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگیں: **وَ عَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ** (النحل:۱۶) یعنی ان کے بچے حجاج کے قافلہ میں راستہ بتانے اور منزل کی رہنمائی کا کام کرنے پر مامور تھے، ابن مبارکؒ سواری خیموں تک لائے، اور استفسار کیا کہ یہ خیمے ہیں، آپ کے متعلقین کون ہیں؟ خاتون نے کہا: **وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا** (النساء:۱۲۵) **وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا**

(النساء:۱۶۴) یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (مریم:۱۲) یعنی ابراہیم موسیٰ اور یحییٰ میرے بچوں کے نام ہیں، ابن مبارکؒ نے ان ہی ناموں سے ندا لگائی، کہ تین نوجوان چاند کی طرح روشن دوڑے آئے، اور جب بیٹھنے لگے تو ماں نے کہا فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ هٰذِهٖٓ اِلَی الْمَدِیْنَةِ فَلْیَنْظُرْ اَیُّهَآ اَزْکٰی طَعَامًا فَلْیَاْتِکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ،(الکہف:۱۹)''اپنے میں سے کسی کو یہ پیسے لے کر شہر بھیجو کہ وہ دیکھے کہ کون پاک وصاف کھانا فروخت کرنے والا ہے، پھر وہ تم لوگوں کے پاس کھانے کی چیز لے کر آئے، چنانچہ بچوں میں سے ایک بازار گیا، کھانے کی کچھ چیز خرید کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا کہنے لگیں: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ (الحاقہ:۲۴) خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے جو تم نے پچھلے دنوں میں کئے ہیں۔

امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے ان خاتون کے صاحبزادوں سے کہا کہ جب تک تم ان خاتون کے بارے میں مجھے نہ بتاؤ میں کھانا نہیں کھا سکتا، لڑکوں نے کہا: یہ ہماری والدہ ہیں، چالیس سال کے عرصہ سے انہوں نے سوائے قرآن کے کوئی اور کلام اپنی زبان سے نہیں نکالا کہ کہیں اپنی طرف سے بولنے میں کچھ زیادتی ہو جائے اور اللہ ناراض ہو جائے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جسے چاہیں عطا فرمائیں، اور اللہ یقیناً بڑے فضل والے ہیں، ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (الجمعہ:۴) یہ واقعہ نشانِ عبرت اور حرفِ موعظت ہے کہ معمولی خاتون کو بھی قرآن سے کیسی مناسبت ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا کیسا اعلیٰ درجے کا ذوق حاصل ہوتا تھا، کاش ہم یہ اور اس طرح کے عبرت خیز واقعات کو اپنے لئے آئینہ بنائیں، اور اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں کہ قرآن مجید سے ہمارا کیا تعلق ہے؟

(۲۹/۱۱/۲۰۰۲ء)

انٹرنیٹ کے ذریعہ تحریفِ قرآن کی سازش

اللہ تعالیٰ نے جب اس وسیع کائنات میں انسانوں کی بستی بسائی، تو جیسے ان کی مادری غذا کا سروسامان کیا ویسے ہی اس کی روحانی غذا اور نشو ونما کا بھی انتظام کیا، اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے انسان ہی میں سے اپنے رسول بھیجے، حضرت آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے، ویسے ہی پہلے نبی بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنی کتابیں بھی اتاریں، لیکن انسان کی گنہ گار طبیعت نے ہمیشہ اپنی آمیزشوں اور ملاوٹوں کے ذریعہ ان کتابوں کو گویا گم کر دیا، نبوت اور نزولِ کتاب کا یہ مبارک سلسلہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اختتام کو پہونچا اور کتابِ ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن مجید کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوا، چونکہ یہ خدا کی آخری کتاب ہے، اور انسان کو قیامت تک ہدایت کے لئے اس کتاب کی ضرورت ہے، اس لئے خالقِ کائنات نے خود ہی اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اور ارشاد ہوا، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (الحجر:۹) کہ ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، یہ خدائی وعدہ آج تک اتنے عظیم الشان طریقہ پر پورا ہو رہا ہے کہ کوئی بھی حقیقت پسند شخص اگر صرف حفاظت قرآن کے اس الٰہی نظام پر غور کرے تو شاید یہی اس کے ایمان کے لئے کافی ہو جائے۔

قرآن مجید اس دور میں نازل ہوا جو کاغذ اور پریس کا دور نہیں تھا، اور خاص کر عرب کا علاقہ تو اتنا غیر متمدن تھا کہ تحریر و کتابت کے ذوق سے قریب قریب بالکل ہی نا آشنا تھا، چند گنے چنے لوگ تحریر سے واقف تھے، عربی تحریر کا فن بھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا، بہت سے حروف ایسے تھے کہ ان کے درمیان باہم کوئی امتیاز نہیں تھا، حروف کی حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کی کوئی علامت نہیں تھی، عربی زبان کے قواعد بھی مرتب نہیں ہوئے تھے، قرآن مجید نہ صرف خدا کی آخری کتاب ہے، بلکہ یہ عربی زبان کی پہلی کتاب بھی ہے، قرآن سے پہلے

عربی زبان میں شعراء کے دیوان اور خطباء کے زریں اقوال سینہ بہ سینہ نقل ہوتے آرہے تھے، لیکن کسی باضابطہ کتاب کا کوئی وجود نہیں تھا۔

قرآن کے نازل ہونے کا سلسلہ جب شروع ہوا تو تحریر کا ذوق بڑھا، اور ایسا بڑھا کہ تین درجن سے زیادہ تو صرف کاتبین وحی کا نام ملتا ہے، پھر جب قرآن عرب کی حدود سے نکل کر عجم کے علاقوں تک پہونچا تو حروف کی شناخت کے لئے نقطے ایجاد ہوئے، حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لئے زبر، زیر، پیش، سکون اور تشدید کی علامتیں قائم ہوئیں، اور جو اہلِ زبان نہیں تھے، ان کی آسانی کے لئے عربی گرامر کی ترتیب عمل میں آئی، یہ سب کچھ پیغمبر اسلام کی وفات کے کم وبیش نصف صدی کے اندر ہی ایجاد پذیر ہوا، اور عربی خط کو ایسا ارتقاء حاصل ہوا، کہ جو آرٹ آج عربی تحریر میں ہے، اور جو تنوع اس کے خطوط میں ہے، کسی اور زبان میں شاید اس کا پچیس فیصد بھی نہ ہو، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

پھر قرآن کی حفاظت بھی کس شان سے ہوئی، اگر ذرا تدبر سے کام لیجئے تو بے اختیار قدرتِ خداوندی پر حمد وستائش کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں، حافظوں نے اس کے الفاظ کی حفاظت کی، آج آپ دنیا کے کسی بھی کونہ میں چلے جائیں، کتنے ہی حافظِ قرآن آپ کو مل جائیں گے، ان میں بہت سے کم عمر بچے بھی ہوں گے، جو ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن کا ایک ایک حرف ان کے سینے میں محفوظ ہے، اگر کسی نماز میں حافظ نے قرآن پڑھنے میں غلطی کی تو کتنے ہی زبانیں لقمہ دینے کے لئے آگے بڑھتی ہیں، اور کسی بڑے مجمع میں قرآن پڑھنے میں غلطی ہوئی تو سینکڑوں آوازیں اصلاح وتصحیح کے لئے بول پڑتی ہیں، اگر کسی مطبع نے ایک لفظ کے چھاپنے میں غلطی کی تو خطوط اور اعتراضات کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ معذرت چاہے بغیر چارہ نہیں۔

جیسے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا سروسامان حفاظ کے ذریعہ ہوا، اسی طرح قرآن کے لب ولہجہ اور اس کے اسلوب تلاوت کی حفاظت مجودین اور قاریوں کے ذریعہ عمل میں آئی، تجوید کیا ہے؟ اس طرز ادا کی نقل وحکایت، جو مہبط وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا، پھر قرآن کا خط بھی ایسا نہیں کہ جس میں ہم آزاد ہوں، بلکہ اس کا رسم الخط بھی توقیفی

ہے، اوراس خط کی بھی ابتدائی دور سے آج تک حفاظت ہوتی رہی ہے، محدثین اور مفسرین نے قرآن کے معنی کی حفاظت کا ذمہ اپنے سرلیا، اورکسی رعایت کے بغیر ہر دور میں گمراہ اورآوارہ فکر اہلِ قلم پر گہری نظر رکھی، اور معنوی اعتبار سے باطل کی آمیزش سے معانی قرآن کو محفوظ رکھا، عربی زبان اور عربی زبان کے اس لب ولہجہ کا آج تک محفوظ رہنا جس میں قرآن مجید نازل ہوا، بجائے خود ایک بڑا معجزہ ہے۔

دنیا میں کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہ خود اس مذہب کے ماننے والے بھی اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ قرار دیں، ہندو بھائیوں کے یہاں سب سے معتبر کتابیں ویدیں ہیں، لیکن ویدوں کی تعداد اور جن ویدوں کو آج کل معتبر مانا جاتا ہے، ان کے اشلوکوں کی تعداد میں بھی سخت اختلاف ہے، پھر یہ بھی متعین نہیں کہ یہ کتابیں ان کے عقیدہ کے مطابق کن شخصیتوں پر اُتاری گئیں، پھر جن شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے، وہ نہ صرف تاریخ کے اعتبار سے تاریکی میں ہیں، بلکہ خاص ان کی کتابوں میں بھی اس اہمیت کے ساتھ ان کا ذکر نہیں ملتا، مسلمانوں کے سوا دنیا میں دو آسمانی مذاہب ہیں، ایک یہودی، دوسرے عیسائی، مجموعی طور پر یہ تو میں بائبل کو الہامی کتاب قرار دیتی ہیں، لیکن خود اہلِ مذہب کے نزدیک ان کتابوں کا تحریف شدہ ہونا قریب قریب ایک مسلم امر ہے، اوراس سلسلہ میں اتنی ساری خارجی اور داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، نیز یہ خود بھی معترف ہیں کہ یہ کتابیں جس زبان میں نازل ہوئیں، اب اس زبان میں ناپید ہیں۔ اوران کا ترجمہ در ترجمہ نئی اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ تھوڑے دنوں پر شائع ہورہا ہے۔

دنیا میں قرآن ہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے، جو بالکل بے آمیز اور محفوظ ہے، قرآن مجید کا وہ نسخہ جسے حضرت عثمان ﷛ نے لکھایا تھا اور شہادت کے وقت آپ اسے تلاوت کررہے تھے، توپ قاپی سرائے میوزیم استنبول (ترکی) میں ابھی تک محفوظ ہے، جو ہرن کی جھلیوں پر ہے۔ اوراس میں سورۂ بقرہ کی آیت ''فسیکفیکم اللہ'' پر حضرت عثمان ﷛ کے خونِ شہادت کی چھینٹیں موجود ہیں، اس نسخہ میں اور آج کے مروجہ نسخہ میں کہیں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اس چیز نے اسلام سے عناد رکھنے والی قوموں کو ہمیشہ حسد میں مبتلا رکھا ہے، انہوں نے

کبھی قرآن کی صحت کو مشکوک کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی معنی میں تغیر و تبدیلی کی، اور کبھی الفاظ میں ملاوٹ و تحریف کی، شاید اہلِ دانش ابھی اس واقعہ کو نہ بھولے ہوں کہ جب مصر میں جمال عبد الناصر حکمراں تھے تو اسرائیل نے بڑی تعداد میں تحریف شدہ قرآن مجید طبع کیا، اور اسے پھیلانے کی کوشش کی، اور غالبًا ان کا یہ عمل قابلِ تعجب نہیں، کیونکہ انبیاء کی اہانت اور آسمانی کتابوں میں تحریف و ملاوٹ ان کے آباء و اجداد کا قدیم شیوہ رہا ہے، اس موقع پر جمال عبد الناصر نے قرآن مجید کے درست نسخے بڑی تعداد میں چھاپ کر عالمِ اسلام اور عالمِ اسلام سے باہر بڑی مقدار میں شائع کیا، غالبًا حجاج ثانی جمال عبد الناصر کے نامۂ اعمال میں یہی ایک عمل خیر کا ہوگا، اور اگر کوئی عمل اس کے لئے وسیلہ مغفرت ہوسکتا ہے، تو شاید وہ یہی عمل ہو۔

اب یہودی اور نصرانی قوموں کا بغض ایک نئی صورت میں سامنے آرہا ہے، اور یہ کام نہ نظر آنے والے ہاتھوں سے کرایا جارہا ہے، اور یہ ہیں'' انٹرنیٹ کے ہاتھ'' انٹرنیٹ کی ویب سائٹ WWW.DIASPACE.DIAL.PIPES.COM/TOWN/PARK/GEQ96/ORIGINAL پر قرآن کی سورتوں کے عنوان سے مختلف من گھڑت، بے معنی، زبان و بیان کے اعتبار سے رکیک اور فکر و نظر کے اعتبار سے گمراہ کن عبارتیں آرہی ہیں، اس وقت ایک دردمند بھائی کے بھیجے ہوئے فوٹو اسٹیٹ صفحات میرے سامنے ہیں، جن میں سورۃ الایمان، سورۃ المسلمون، سورۃ الوصایا، اور سورۃ التجسد کے عنوان سے عبارتیں ہیں، ان کو قرآنی اصطلاح'' سورۃ'' کہتے ہوئے دل خون ہوتا ہے، لیکن محض حکایت واقعہ کے طور پر یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے، الایمان میں دس، المسلمون میں گیارہ، الوصایا میں سولہ، اور التجسد میں پندرہ فقرے ہیں، یہ قافیہ بند فقرے ہیں، اور قرآن کے اسلوب پر تجع کی رعایت کے ساتھ انہیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور بکثرت قرآنی کلمات کا استعمال کیا گیا ہے، ان عبارتوں میں بار بار نعوذ باللہ حضرت عیسی علیہ السلام کے فرزند اللہ ہونے، ان کے بقول بہ طور کفارہ پھانسی پر چڑھائے جانے، رسول اللہ ﷺ کے نعوذ باللہ تالیف قرآن میں ورقہ بن نوفل سے مدد لینے وغیرہ کا ذکر ہے، غرض ان تمام بے ہودہ اور باطل افکار و خیالات کی ترجمانی ہے جو آج تحریف شدہ عیسائیت کا حصہ ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے، اس لئے

حاسدین کا حسد اور معاندین کا عناد خدا کے غیبی نظام کو سر مو نقصان نہیں پہونچا سکتا، لیکن ایک تو اپنی اس نوجوان نسل کا مسئلہ قابلِ فکر ہے جس نے نہ اسلام کو پڑھا ہے، اور نہ اسے برت رہی ہے، اور تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے، تو مغرب کے اس غیر معیاری اور تنگ نظری پر مبنی لٹریچر کو جو کوتاہ علموں کو پانی نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں سراب ہی سراب ہے، کہ قرآن کے نام پر ایسے بے ہودہ خیالات، اس کے انگریزی تراجم، اور ترجمہ وتشریح کے ساتھ بخاری وغیرہ کے مغالطہ انگیز حوالہ جات کہیں اس بے خبر نسل کو گمراہ نہ کردے، دوسرے اگر ایسی ناشائستہ اور ناروا تحریروں کو روکنے کا کوئی ذریعہ اختیار نہ کیا جائے تو خطرہ ہے کہ یہ آوارہ فکر اور آوارہ خیال لوگوں کے لئے مذہبی کتابوں پر مشق ناز کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

اس لئے مسلمانوں کا ایسے فتنوں سے باخبر اور ایسی سازشوں کے بارے میں چوکنا رہنا نہایت ضروری ہے، حکومت سے بھی نمائندگی کی ضرورت ہے، کہ اس دل آزار اور گمراہ کن ویب سائٹ کو بند کیا جائے، اگر بروقت ایسے فتنوں کی خبر نہ لی جائے، تو اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ قرآن یقیناً قیامت تک محفوظ رہے گا، اور وہ اپنی حفاظت میں ہمارا محتاج نہیں، لیکن ہم اپنی کوتاہ علمی اور کوتاہ فکری کی وجہ سے اس کے محتاج ہیں، کہ ایسی معاندانہ سازشوں کے بارے میں باشعور رہیں اور ان کے خلاف جد وجہد کر کے حفاظت قرآن کے غیبی نظام کا ایک حصہ بنیں، اور خدا کے دربار میں ہمارا شمار بھی ان بندوں میں ہو جنھوں نے اس کتاب کی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ کاوش کی ہے۔

(۲؍مارچ ۲۰۰۱ء)

شب قدر ــــــ انسانیت کی شبِ نجات

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی بات ہے، دنیا ظلم وجور کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ کوئی برائی نہ تھی جس سے انسانی سماج محفوظ ہو، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور سیاروں، چاند، سورج اور ستاروں، یہاں تک کہ انسان کے اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے بتوں اور مورتیوں بلکہ کیڑے مکوڑوں کے سامنے بھی انسان اپنی جبینِ احترام خاک آلود کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا، ہمارے ملک میں ہر طبقہ نے اپنے لئے خداؤں کی ایک فوج تیار کی ہوئی تھی، اسی شرک وبت پرستی نے لوگوں کو توہم پرست بنا دیا تھا اور ہر چیز میں ''نحس'' کے تصور نے ان کو ارادہ وعمل کی قوت اور تحقیق واکتشاف کے حوصلہ سے محروم کر دیا تھا، لیکن ظاہر ہے جو انسان کائنات کی ہر چیز کو مقدس خیال کرنے لگے، بلکہ اس کی عبادت وبندگی کرنے لگے وہ تحقیق وتفتیش کا عمل کس طرح جاری رکھ سکتا ہے؟

باہمی ظلم وجور اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ درندے بھی شرما جائیں، کمزور طاقتور کے لئے لقمۂ تر تھے، مسافروں کی نہ جان محفوظ تھی، نہ مال محفوظ تھا اور نہ عزت وآبرو، بڑے بڑے قافلوں کی رفاقت کے بغیر کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جا سکتا تھا، لوگوں نے بطورِ خود انسانیت کو مختلف طبقات میں بانٹ رکھا تھا، پیدائشی طور پر کچھ لوگ باعزت تصور کئے جاتے تھے اور کچھ لوگ ذلیل ومحروم، اس فرقہ بندی نے سب سے زیادہ جہاں اپنا رنگ جمایا وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے، یہاں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، برہمن سب سے اونچے خیال کئے جاتے تھے، ان کے بارے میں تصور تھا کہ وہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں۔ دوسرا طبقہ چھتری کا تھا، جن کے ذمہ ملک کے دفاع کا کام تھا، تیسرا طبقہ ویش جو ملک میں تجارت، بیوپار اور صنعتیں سنبھالے ہوا تھا۔

سب سے محروم وہ لوگ تھے جو ''شودر'' کہلاتے تھے۔ ان پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان

کے لئے حکم تھا کہ اگر وید کی عبارت بھی سن لیں تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے، یہ اونچی ذات کے لوگوں کے سامنے بود و باش اختیار نہیں کر سکتے تھے، جس جرم پر اونچی ذات کے لوگوں کو معمولی سزائیں دی جائیں، اسی جرم پر شودر قتل کے حقدار سمجھے جاتے، ایران میں شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کیا جاتا تھا، بادشاہ اور امراء ہیرے اور موتیوں کے تاج سے اپنے سر کو زینت دیتے اور ایران کے کسان اور مزدور سرکاری ٹیکسوں کے بوجھ سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لیتے، عرب میں عربی اور عجمی نسل کی تقسیم تھی، غیر عرب کو حقارت اور ذلت سے دیکھا جاتا تھا، غلام اور عورتیں دنیا میں سب سے زیدہ حقیر انسانی طبقات تھے، عرب کا یہ حال تھا کہ غلام کو باندھ کر ان پر نشانہ کرتے، یوروپ میں بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں درندوں کا غلاموں سے مقابلہ کرایا جاتا اور ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھا جاتا، یہ کھیل "سیافی" کہلاتا اور بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا، عورتوں کا حال یہ تھا کہ ایوان کے حکماء اور فلاسفرز کے یہاں یہ بحث جاری تھی کہ کیا عورت میں وہی روح ہے جو مردوں میں ہے؟ بائبل میں عورتوں کو گناہ کا دروازہ قرار دیا گیا تھا، ہندوستان میں بیوی شوہر کی ملکیت تھی اور وہ شوہر کے ساتھ نذرِ آتش کر دی جاتی تھی، وہ کسی جائیداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی اور نہ میراث کی حقدار تھی، پوری دنیا میں عورتوں کا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

جب انسانی تمدن پوری طرح خزاں رسیدہ ہو چکا اور جہالت کی گھٹا دنیا کے افق پر ہر سو چھا چکی تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور غالباً ستائیس تاریخ، کہ کائنات پر رحمت کی گھٹا چھائی اور ابرِ کرم "حرا" کی سمت اُترا، پیغمبر اسلام محمد ﷺ پر پہلی وحی اُتری۔ یہ خدا کا آخری پیغام تھا اور قیامت تک کے لئے تھا، اس کتاب نے سب سے پہلے انسانیت کو جس بات کی دعوت دی، وہ تھی پڑھنے کی، علم کی، سیکھنے کی، قلم پکڑنے کی، کہ جب علم کی شمع روشن ہوگی اور فکر و نظر کا چراغ جلے گا تو خود بخود تاریکیاں چھٹیں گی اور جہالت کے تمام پردے چاک ہوں گے، ظلم و ناانصافی کا دروازہ بھی بند ہوگا، شرک و اوہام پرستی کا بھی خاتمہ ہوگا اور انسانیت کو امن و آشتی، سکونِ قلب، سلامتی فکر و نظر، اُخوت و بھائی چارگی، محبت و احترام آدمیت کی متاعِ گراں مایہ ہاتھ آئے گی۔

چنانچہ قرآن مجید نے ایسا بہار آفریں انقلاب دنیا کو عطا کیا کہ یا تو اسلام سے پہلے پورے مکہ میں صرف تین یا اس سے کچھ زیادہ افراد تھے جو لکھنا جانتے تھے، یا وقت آیا کہ محض کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس سے متجاوز تھی، تحقیقِ کائنات اور سائنسی انداز سے غور وفکر کا ایک نیا دور شروع ہوا، اسلام کے اس تصور سے کہ پوری کائنات انسان کی خادم ہے، کائنات کی ہر شئے کے بارے میں تحقیق وتفتیش کا حوصلہ پیدا ہوا، انسانی مساوات و برابری کے عقیدہ نے اتنا اثر ورسوخ حاصل کیا کہ طبقاتی تقسیم اور تفریق کے تصور نے پوری دنیا میں منہ چھپانا شروع کر دیا، عورتوں کو اسلام کی تاریخ میں پہلی بار عزت واحترام کا مقام حاصل ہوا اور سماجی زندگی میں ایسا متوازن قانون عطا ہوا کہ قوانین عالم اس کی خوشہ چینی سے چارہ نہیں پاتے، غلاموں کو انسانوں کا درجہ عطا کیا گیا اور چند صدیوں میں بتدریج غلاموں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا، یہاں تک کہ جانوروں اور چرند و پرند کے بھی حقوق متعین ہوئے اور ان کے بارے میں بھی انسان کو بے قید نہیں رکھا گیا۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ بنیادی طور پر اس کتاب نے دو باتوں کی دعوت دی: وحدت الٰہ اور وحدتِ انسان، یعنی اللہ ایک ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں جو عبادت کے لائق ہو، اور انسانیت بھی ایک ہے، نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، حکمراں ہو یا رعایا، دولت مند ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، خالق کائنات کی نگاہ میں یہ سب برابر ہیں، البتہ ہر انسان کے عمل اور اس کی نیکیوں کے اعتبار سے خدا کے یہاں اس کا درجہ متعین ہوگا، شب قدر در اصل اسی عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور شب قدر کی عبادت اسی انعامِ خداوندی پر اللہ کا شکر بجالانا ہے، اس لئے یہ صرف دُعا کی قبولیت ہی کی رات نہیں، بلکہ تمام انسانیت کے لئے شبِ نجات ہے، اوہام سے نجات کی رات، انسانی غلامی سے نجات کی رات، طبقاتی ظلم وجور سے نجات کی رات اور جہل وگمراہی سے نجات کی رات!

(۲۶/جنوری ۱۹۹۸ء)

ہمدردی وغم گساری کا مہینہ

ایک بار ایک صاحب خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، وہ بھوکے تھے، آپ ﷺ سے فاقہ مستی کا ذکر کیا اور کھانے کے خواستگار ہوئے، آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے یہاں خبر بھیجی، قاصد ایک ایک کے یہاں گیا، اور واپس آیا کہ حرمِ نبوت میں کسی کے یہاں سوائے پانی کے کھانے کی کوئی اور چیز نہیں، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خواہش کی کہ کوئی ان کی مہمان نوازی کرے، ایک صحابیؓ اپنے ساتھ لے گئے، گھر جا کر احوال معلوم کئے، بیوی نے بتایا کہ گھر میں صرف بچوں کی ضرورت کے مطابق کھانے کا سامان ہے، اتنا بھی نہیں کہ ہم لوگوں کے لئے گنجائش نکل پائے، فرمایا: کچھ حرج نہیں، بچوں کو سلا دو، جب بچے سو جائیں تو کھانا تیار کرو، کھانا لا کر رکھو اور چراغ درست کرنے کے بہانے چراغ بجھادو، مہمان خیال کریں کہ ہم لوگ بھی کھانے میں شریک ہیں، حالاں کہ ہم لوگ کھانے میں شریک نہ ہوں، چنانچہ خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کی خواستگار اور شوہر کی اطاعت گزار بیوی نے ایسا ہی کیا، مہمان رسول ﷺ نے سیر ہو کر کھایا، میزبان خود بھی بھوکے رہے، اور ان کے بچے بھی، اور مہمان پر بارِ خاطر بھی نہ ہونے دیا کہ وہ دوسروں کو بھوکے رکھ کر خود آسودہ ہو رہے ہیں: صبح کو جب میزبان صحابیؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آج شب تم پر ہنسے، تم سے خوش ہوئے اور یہ آیت نازل فرمائی کہ کچھ لوگ ہیں جو باوجود خود فاقہ مستی سے دوچار ہونے کے اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور جو شخص بخل سے بچالیا جائے وہی کامیاب ہے۔ (بخاری: ۱/۵۳۵)

یہ کوئی معمولی کردار نہیں، لیکن اسلام کے عہدِ اوّل میں ہر جگہ ایسے تابندہ نقوش ملتے ہیں، محبت وغم گساری کے ایثار، ہمدردی اور انسانیت کی غم خواری کے، اور خود سہہ

کر دوسروں کو سکھ پہونچانے کے، اس کی وجہ یہ تھی کہ توحید اور خدا کی بندگی کے بعد آپ ﷺ سب سے زیادہ جس بات پر زور دیتے تھے، وہ یہی انسانی ہمدردی اور غم گساری ہے، آپ ﷺ کوئی موقع اس کا ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے خاص طور پر غم گساری اور مساوات کا مہینہ قرار دیا، اس مہینہ میں انفاق اور اللہ کے بندوں کی اعانت و مدد کی خاص کر تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ اس ماہ مبارک میں انفاق اس قدر بڑھ جاتا کہ گویا تیز ہوا ہو، رمضان المبارک میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد اور اعانت کی خصوصی تاکید و اہتمام کی وجہ ظاہر ہے، مسلمان غریب ہو یا مالدار، روزہ ہر ایک کو رکھنا ہے، اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے بھوک و پیاس سہنی ہے، یہ بھوک و پیاس اپنے غریب بھائیوں کی فاقہ مستی کی تلخ کامیوں کا احساس دلاتی ہے، جب انسان خود اس راہ سے گزرتا ہے تو ان سے لوگوں کی مشقتیں اس کے لئے ایک ''ذاتی تجربہ'' بن جاتی ہیں، جن کو بار بار اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور آپ بیتی انسان پر جگ بیتی سے زیادہ اثر ڈالتی ہے، اسی کو کلیم عاجز نے کہا ہے:

پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے
پریشانی ہماری کا گُلِ محبوب جانے ہے

مواسات و غم گساری کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ہر شخص کے لئے اس کی حیثیت کے لحاظ سے ہے، تاجر ہو تو گاہک کا خیر خواہ ہو، اسے دھوکہ نہ دے، مناسب سے زیادہ قیمت نہ لے، ڈاکٹر اور معالج ہو تو مریض کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، علاج کرتے ہوئے خدمتِ خلق کے جذبات کو بھی دل کا رفیق بنائے رہے، غریب مریضوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے، اور تند خو بیماروں کو سہے، پڑوسی ہو تو دیکھے کہ اس کے پڑوس پر کیا گذرتی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص جو خود آسودہ ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا، اس طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، جس کا پڑوسی اس

کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا ہو، یتیموں کی خبر گیری، اور ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنا، بیواؤں اور بے کسوں کی مدد کے لئے آگے بڑھنا، بوڑھوں کو سہارا دینا، اور مظلوم وستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار، یہ سب ''مواسات'' میں داخل ہے، غرض انسان کی خدمت کو خدا کی عبادت کا سا درجہ دیا ہے، غور فرمایئے! اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھ سکتا تو ہر روزہ کے بدلہ ایک محتاج کو دن اور رات کا کھانا کھلانا ہے، اگر جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ایک روزہ کا کفارہ ساٹھ روزہ رکھنا ہے، اور روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ محتاج شخص کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے، گویا روزہ جیسی عبادت کو ایک غریب شخص کی مدد کے ہم پلہ رکھا گیا۔

اللہ کی محبت سے اللہ کی مخلوق کی محبت بڑھتی ہے، اور انسان کو غریبوں کی جھونپڑیوں اور بے کسوں کے غربت کدوں میں اللہ کو ''پانے'' کا یقین پیدا ہوتا ہے، وہ دوسروں کی ضرورتوں کے مقابلہ اپنی ضرورت کو بھول جاتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اپنے دوسرے بھائی کی مدد کی راہ میں کھو دینا پانے سے زیادہ لذیذ ہے، مکہ سے جب اہلِ ایمان کا لٹا پٹا قافلہ مدینہ پہونچا تو ان کے پاس کچھ نہ تھا، نہ گھر، نہ در، نہ مال ومتاع، نہ سامان واسباب، اہل مدینہ بھی کچھ بہت اہل ثروت نہیں تھے، کچھ باغات اور معمولی سی کھیتیاں، بہتوں کا گزر اوقات مزدوری پر تھا، لیکن آپ ﷺ کی مبارک تعلیمات اور مسعود صحبتوں سے تنگ دستی کے باوجود دل کشادہ رکھتے تھے، اور مواسات وایثار گویا ان کی طبیعتوں میں داخل ہو گیا تھا، اس لئے ''غریب ہٹاؤ'' مہم چلانے کی حاجت نہ پڑی اور مدینہ کے حوصلہ مندوں نے اپنی پوری کائنات آپ ﷺ کے قدموں میں رکھ دی، اس لئے ''انصار'' کے لقب سے نوازے گئے، اور نصرت واعانت کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ شاید ہی اس زمین کے سینہ اور آسمان کے سایہ میں اس کی کوئی اور مثال مل سکے۔

''روزہ'' اگر سحر وافطار کا اہتمام پیدا کر دے، چند دنوں کسی قدر نماز کی رغبت بھی

ہو جائے، عید کے نئے کپڑے سلائے اور پہنے جائیں، لیکن مواسات وغم خواری کا جذبہ پیدا نہ ہو، بھوکوں، پیاسوں کے دکھ سے دل میں کوئی ٹھیس نہ اٹھے، غریبوں اور محتاجوں کی محبت کی کوئی لہر موجزن نہ ہونے پائے اور پریشان حال بھائیوں اور سماج کے دبے، کچلے لوگوں کے لئے دل دکھی اور آنکھیں اشکبار ہونا نہ سیکھیں، تو شاید روزہ خدا کی ترازو میں ناتمام ہی سمجھے جائیں!!

(۸رنومبر۲۰۰۲ء)

نیکیوں کی فصلِ بہار

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، جونیکیوں کی فصلِ بہار ہے اور تہی دامانِ عمل کو بقدرِ توفیق اس فصل گل سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو اس ماہِ مبارک کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کی آمد سے پہلے ہی آپ ﷺ لوگوں کو اس ماہ کی برکتوں اور سعادتوں کے بارے میں خبردار فرماتے اور عبادت کی طرف خاص طور پر انہیں متوجہ کرتے۔ اس ماہ کا اصل اور بنیادی عمل روزہ ہے، یعنی صبح طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے، پینے اور دوسرے نفسانی تقاضوں سے اپنے آپ کو باز رکھنا، یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے، انسان کے لئے گھنٹے دو گھنٹے بھی بھوکا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، بیمار ہو تو پرہیز مشکل ہو جاتا ہے، دنیا کی ساری لذتیں انہی خواہشات سے متعلق ہیں، آدمی بطورِ خود اپنے آپ کو ان سے روک لے، حالاں کہ اس کو روکنے کے لئے نہ کوئی چوکیدار ہو، نہ کوئی قانونی پہرہ دار اور نہ جسمانی مضرت ونقصان کا اندیشہ۔

یہ انسان کی تربیت کا نہایت مؤثر اور بے مثال طریقہ ہے، جس سے محض روحانی مقاصد کے تحت اپنے آپ پر قابو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لئے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ نفس کے گھوڑے کے لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھے، جو شخص نفس کی آواز کو دبانے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لے اس کے لئے کسی بھی گناہ سے بچنا چنداں دشوار نہیں، اسی لئے روزہ کو تقویٰ کا باعث قرار دیا گیا اور رمضان کے مہینہ کو صبر کا مہینہ فرمایا گیا۔

لیکن دنیا کی ہر چیز میں صورت اور حقیقت کا ایک فرق پایا جاتا ہے، شیر کی تصویر میں شیر کی طاقت اور آگ کی تصویر میں آگ کی حرارت نہیں آسکتی، شیر کی خوفناک اور بھیانک اسٹیچوں سے دن رات بچے کھیلتے ہیں اور آگ کی تصویر سے لوگ اپنے گھر

سجاتے ہیں، لیکن اگر جاں بہ لب زندہ شیر بھی ہو تو اچھے اچھے بہادر بھی قریب جانے کی ہمت نہیں پاتے اور آگ کی ایک چنگاری بھی ہو تو پورے مکان کو سلگانے کے لئے کافی ہے۔

ہاں عبادات میں بھی صورت اور حقیقت کا فرق ہے، محض بھوکا پیاسا رہنا روزہ کی صورت ہے نہ کہ حقیقت، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو جھوٹ بولے اس کا روزہ نہیں، جو غیبت کرے اس کا روزہ نہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزہ داروں کو روزہ سے بھوک و پیاس کے سوا کوئی چیز حاصل نہیں، یہ روزہ کی صورتیں ہیں، ایسی صورت جو روح اور زندگی سے خالی ہیں، روزہ تو اس لئے ہے کہ انسان کا سینہ خدا کی محبت سے معمور ہو جائے، اس کا دل سب کچھ کھو کر خدا کو پانے کے جذبہ سے لبریز ہو اور گناہوں کی نفرت اس کے دل میں سما جائے، اس کی نگاہ ایک پاک دامن نگاہ ہو، اس کی زبان قند و نبات کی مٹھاس سے ہم کنار اور ہر طرح کی بدگوئی سے محفوظ ہو، اس کے اعضاء و جوارح کو نیکی سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا ایک عاشق ہے جو اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے بھوکا، پیاسا اور دنیا کی لذتوں سے بیگانہ بنا ہوا ہے، اگر روزہ اس کیفیت کے ساتھ رکھا جائے تو یقیناً اس سے نفس کی تربیت ہوگی، انسان کے اندر برائی سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور انسان اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو سکے گا، یہ تربیتی نظام اسے آئندہ گیارہ مہینوں میں بھی خدا کی مرضیات پر قائم رکھے گا، اس لئے روزہ کو حقیقت کی سطح پر رکھنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ خدا کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنے کا ایک عنوان ہے!

اس ماہِ مبارک میں رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید کے ایک ختم کا آپ ﷺ سے مذاکرہ فرماتے، جس سال وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دو دور فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس ماہ کو قرآن مجید سے ایک خاص مناسبت ہے، اسی لئے اس مہینہ میں خاص طور پر تراویح کی نماز رکھی گئی، کہ اس

میں پورا قرآن مجید ختم کیا جائے، تہجد میں بھی زیادہ طویل قیام اور اسی نسبت سے قراءت کا معمول مبارک تھا، اسی لئے سلف صالحین کے یہاں اس ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت کا بھی خاص اہتمام رہا ہے۔ اس لئے جہاں رمضان کے دن روزہ کے نور سے منور ہوں، وہیں رمضان کی راتیں تلاوتِ قرآن سے آباد ہونی چاہئے، یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ خدا کی آخری اور کائنات میں موجودہ واحد سچی کتاب اس امت کے پاس ہے، جس کا حق یہ تھا کہ مسلمان کا کوئی دن اس کی تلاوت سے خالی نہ ہو، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ پورا سال گذر جاتا ہے اور بہت سے بے توفیقوں کو قرآن مجید کے ایک ختم کی توفیق بھی میسر نہیں آتی، اس لئے یوں تو پورے سال تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم رمضان کو تو ضائع نہ ہونے دیا جائے، عام طور پر بیس منٹ میں ایک پارہ مکمل ہو جاتا ہے، اگر روزانہ صرف ایک گھنٹہ تلاوت کا وقت رکھا جائے تو بآسانی ہر دس دن میں ایک ختم ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی وقت ایک گھنٹہ قرآن کے ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کے لئے بھی رکھ لیا جائے تو یہ کیا کہنا ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ سال بھر ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کا اہتمام ہو، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم سے کم رمضان میں کسی ایک بڑی سورت، یا منتخب سورتوں ہی کا مطالعہ کر لیا جائے، تا کہ بندہ یہ جان سکے کہ اس کا خدا اس سے کیا کہہ رہا ہے، یہ کیسی محرومی ہے کہ ہمارا خدا ہم سے مخاطب ہو اور ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ وہ ہم سے بات کرے اور ہم اپنے کان بند کر لیں، اس کا کلام اپنی جلوہ فرمائیوں کے ساتھ ہم پر آشکار ہو اور ہم اپنی آنکھیں موند لیں، کیا اس سے زیادہ حق ناشناسی کی بھی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟

رمضان المبارک کا تیسرا اہم عمل دعاء ہے، یہ دعا کی قبولیت کا مہینہ ہے، رمضان کی راتوں میں اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے، کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں، کوئی ہے رزق کا خواستگار کہ میں اسے روزی دوں، ہے کوئی ضرورت مند کہ میں اس کی حاجت روائی کروں؟ اس سے زیادہ کم نصیبی کیا

ہوگی، کہ داتا خود سائل کو طلب کرے اور سائل اپنا دستِ سوال نہ پھیلائے، تہجد کا وقت دعا کی قبولیت کا ہے، افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ جس میں شبِ قدر کا امکان ہے، دعا کی قبولیت کی خاص ساعتوں پر مشتمل ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ پوری ملتِ اسلامیہ زخم سے چور ہے اور پورا عالمِ اسلام یہود و نصاریٰ کے پنجہ استبداد سے کراہ رہا ہے، خود ہندوستان میں مسلمانوں کے گرد فرقہ پرست تنظیمیں گھیرا تنگ کرتی جارہی ہیں، ان حالات میں دعا مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مگر بدقسمتی سے افطار کے لئے ایک سے ایک کھانے کا انتخاب اور دستر خوان کو خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن یہ وقت دعا کی قبولیت اور اللہ سے مانگنے اور اپنے خالق کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا ہے، اسی کو فراموش کردیا جاتا ہے، اس لئے ہم اس ماہ کو دعا کا مہینہ بنالیں، خدا سے مانگنے اور خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا مہینہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اس ماہ کو غم گساری کا مہینہ (شہر المواساۃ) بھی فرمایا ہے، یعنی جیسے یہ خدا کو راضی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کا مہینہ ہے، اسی طرح یہ خدا کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور بہتر برتاؤ کا مہینہ بھی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سخاوت اس ماہ میں تیز ہوا سے بھی بڑھ جاتی تھی، اسی لئے بعض صحابہؓ اس ماہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے اور آج کل بھی لوگ خاص طور پر اسی مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن زکوٰۃ تو ایک لازمی فریضہ ہے اور انفاق کا وہ کم سے کم درجہ ہے جس سے انسان جوابدہی سے بچ سکتا ہے، لیکن جیسے رمضان میں فرائض کے ساتھ نوافل کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کے ساتھ عمومی انفاق پر بھی توجہ ہونی چاہئے بہت سے لوگ محتاج وضرورت مند ہوتے ہیں، لیکن زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے، بہت سے دینی کام ایسے ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، ایسے مواقع پر عمومی انفاق امت کے لئے ایک ضرورت ہے اور اصحابِ ثروت کو محسوس کرنا چاہئے کہ یہ بھی ان پر ایک حق ہے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مال میں زکوۃ کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں، ان في المال لحقا سوى الزكوٰة۔

آیئے ہم عہد کریں کہ ایمان وعمل کی اس فصل بہار سے ہم اس کے تقاضہ کے مطابق فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی عملی زندگی کو اس کی خوشبو سے عطر بار کریں گے!

(۱۶ر نومبر ۲۰۰۱ء)

صبر کی تربیت

''صبر'' کے اصل معنی عربی زبان میں ''رکنا'' اور ''روکنے'' ہیں، (القاموس المحیط: ۱/۵۴۱) اسی مناسبت سے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنے کو بھی ''صبر'' کہا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اکثر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں کسی فرد، جماعت یا قوم کے لئے قوت برداشت، تحمل اور صبر کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے ۱۰۷ مواقع پر مختلف انداز سے صبر کی تلقین یا تعریف کی ہے، یا کم سے کم اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید نے ایک موقع پر اللہ سے مدد لینے کا دو نکاتی طریقہ بتایا ہے، ان میں ایک نماز ہے، جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا عنوان ہے اور دوسرا ''صبر'' ہے، پھر صبر کی مزید تاکید اور اہمیت کے اظہار کے لئے آگے ارشاد ہوا کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔''

''صبر'' کا ایک سادہ سا مفہوم ہے، جو سماج میں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی شخصی زندگی میں بعض اوقات دل دکھانے والے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ کسی عزیز کی موت، کسی کی بیماری، مالی نقصان۔ ایسے واقعات پر آہ وزاری کرنے کے بجائے فیصلہ خداوندی سمجھ کر اس پر خاموشی اختیار کرنا یقیناً یہ بھی صبر ہے، لیکن صبر صرف اس کا نام نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ خدا کا حکم بجالانے میں اگر کوئی بات خلاف طبع ہے تو اس کو خوشی سے برداشت کیا جائے۔ جو لوگ نماز کے عادی نہ ہوں، ان کے لئے پنج وقتہ نماز کا اہتمام بھی دشوار ہوتا ہے، گرما میں تپش سے گذر کر ظہر کی نماز میں مسجد پہنچنا اور ٹھنڈک میں خشک ہواؤں کو برداشت کرتے ہوئے نمازِ فجر کا اہتمام کرنا خدا کی محبت کے بغیر آسان نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنا طبیعت پر گراں گذرتا ہو اور اپنی خو سے باز آنے کو دل تیار نہ ہو، لیکن انسان اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھنا

سیکھ لے اور رضاءِ خداوندی کی قربان گاہ پر اپنی چاہتوں کو بھینٹ چڑھادے، کوئی شخص شراب کا عادی ہے، اس بری عادت کو چھوڑنا، طبیعت نہیں مانتی، ایسے مواقع پر اپنی طبیعت پر قابو پانا اور شریعت کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنا صبر میں داخل ہے، اسلام نے نکاح کو سادہ اور آسان رکھا ہے، نہ گانا بجانا، نہ رقص وسرور، تکلفات اور تعیشات سے خالی و عاری، لیکن دوستوں کی، بزرگوں کی، عورتوں کی، بچوں کی اور کسی قدر خود اپنی خواہش گدگدا رہی ہے کہ آج بھی نغمہ و رقص کی مجلس نہ سجائی گئی، قہقہوں اور روشنیوں کا دریا نہ بہایا گیا، پٹاخوں سے فضا گرمائی نہ گئی اور کچھ اپنی دولت وثروت کے نقوش دل و ذہن پر قائم نہ ہوئے تو یہ بھی کچھ شادی ہوئی؟؟ ایسے موقع پر دل خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوجائے کہ تیری خواہش ہر خواہش سے بالا ہے اور تیری رضا جوئی پر ساری آرزوئیں قربان ہیں، یہ بھی صبر کے امتحان کا ایک کٹھن موقع ہے اور کم پاک نفوس ہیں جو اس امتحان میں پورے اتر جائیں!

''صبر'' اس وقت بڑا صبر آزما ہوجاتا ہے جب اس کا رشتہ بندوں کے حقوق سے ہو کسی بھائی سے زیادتی ہوگئی، انتقام کی آگ رگ وپے میں سلگ رہی ہے، انتقام پر قدرت بھی ہے، خدا جو قادر مطلق ہے اور جو ہر وقت اپنے گنہگار بندوں کی خطاؤں سے درگذر کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صبر وحلم کی شبنم سے اس شعلۂ غضب کو بجھادے، تاکہ تم بھی بارگاہِ خداوندی میں اسی سلوک کے مستحق ٹھہرائے جاؤ، اس وقت غصہ کو پی جانا اور عفوو درگذر کی راہ اختیار کرنا ''صبر'' ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص طاقتور ہے اثر ورسوخ رکھتا ہے، زبردستی کسی کا حق دبائے ہوئے ہے، مظلوم کو نہ طاقت وقوت حاصل ہے، نہ عدالت تک رسائی ہے، اس کے باوجود انسان یہ سمجھے کہ اسے اپنے ظلم کا حساب دینا ہوگا اور آج وہ جتنا طاقتور ہے خدا کے سامنے کل وہ اتنا ہی کمزور ہوگا، یہ تصور اسے لرزادے، اس کا دل کانپ اٹھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوسرے کا حق اس کے حوالہ کردے، یہ بھی ''صبر'' میں داخل ہے، کیوں کہ اس نے اپنے جذبات وخواہشات پر روک لگائی ہے اور اپنے مفادات سے محرومی کو گوارا کیا ہے۔

''صبر'' کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی مسائل سے بھی ہے۔ بعض واقعات جذبات کو بھڑکانے والے ہوتے ہیں، مخالفین چاہتے ہیں کہ آپ مشتعل ہوں، کیوں کہ جو قوم بات بات پر مشتعل ہوتی رہتی ہے، وہ کوئی ٹھوس اور تعمیری کام نہیں کرسکتی اور ہمیشہ طویل المدت منصوبہ بندی سے محروم رہتی ہے، وہ اپنی پوری قوت لایعنی مسائل میں صرف کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کو اہل مکہ نے مشتعل کرنے کی کم کوشش نہ کی، مدینہ میں یہودیوں نے براہِ راست بھی اور منافقین کے واسطہ سے بھی اشتعال پیدا کرنے اور الجھانے کا کم سامان نہیں کیا، لیکن آپ ﷺ نے کبھی ایسی حرکتوں کو ''مسئلہ'' نہیں بنایا اور اپنی اور مسلمانوں کی بہترین صلاحیت کو وقتی مسائل میں صرف نہیں ہونے دیا، بلکہ خاموشی سے اسلام کی دعوت کو دور دور تک پہنچانے، مسلمانوں کی فکری اور عملی تربیت کرنے اور طویل المدت اور دور رس منصوبہ بندی کے ذریعہ اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا سدِّ باب کرنے میں مشغول رہے، جس نے بالآخر مسلمانوں کو فتح مندی سے سرفراز کیا۔ سیرت نبوی ﷺ میں اس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں اور سب سے بڑی مثال خود ''صلح حدیبیہ'' ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی سطح پر بھی آج مسلمانوں میں ''صبر'' کی صلاحیت پیدا کرنا بہت بڑی ضرورت ہے اور یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بزدلی اور فرار دوسری چیز ہے اور خوش تدبیری اور وقتی اعراض ایک دوسری چیز، صبر بزدلی نہیں بلکہ خوش تدبیری سے عبارت ہے!

رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے صبر کا مہینہ قرار دیا (بیہقی عن سلمان فارسی ؓ) یعنی یہ مہینہ اس لئے ہے کہ آدمی صبر کرنا سیکھے۔ دن بھر کھانے پینے اور دوسری انسانی ضرورتوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنے میں صبر کی تربیت ہے۔ روزہ سے انسان میں صبر کی جو کیفیت مطلوب ہے، اس کو آپ ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا کہ روزہ دار فحش کلامی نہ کرے، بری بات نہ بولے، شور نہ کرے، اگر کوئی دوسرا شخص اسے برا کہے، گالی دے یا اس پر ہاتھ اٹھائے تو کہہ دے کہ میں برائی کا جواب برائی سے نہیں دے سکتا، کیوں کہ میں

روزہ سے ہوں ''فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی صائم '' (بخاری عن ابی ہریرۃ)
یعنی میں صبر کی تربیت پا رہا ہوں اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے اور جاہلانہ رویہ کو برداشت کرنے کی مشق کر رہا ہوں، اس لئے اس وقت کسی ردعمل کا اظہار ہمارے اس کاز کے خلاف ہے جس میں ہم مصروف ہیں۔

(۱۷ردسمبر ۱۹۹۹ء)

رمضان المبارک کا پیغام

رمضان المبارک اپنی تمام رعنائیوں اور بہاروں کے ساتھ گذرنے کو ہے، آیئے! پھر ایک بار ہم رمضان کا سبق تازہ کریں، ماہ مبارک سے ہمیں کیا کیا سبق ملتا ہے؟ اس ماہ کے تقاضے کیا تھے؟ اور ہماری زندگی میں ان کا کیا اثر ہونا چاہئے؟ آیئے ہم اپنا احتساب کریں، اور اپنی عملی زندگی کو اس آئینہ میں دیکھ کر اسے سنوارنے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں مجاہدہ کی تربیت دیتا ہے، مجاہدہ سے مراد مشقتوں اور خلاف طبیعت باتوں کو برداشت کرنا ہے، بھوک، پیاس، دوسری خواہشات سے اجتناب، زبان کی حفاظت، رات میں عام معمول سے زیادہ تراویح کی بیس رکعتوں کی ادائیگی، وہ بھی طویل قیام وقراءت کے ساتھ، دن بھر کی فاقہ مستی کے بعد کھانا، کھانے کے بعد نماز، نماز کے بعد کچھ دیر سو کر پھر اٹھ جانا، اللہ توفیق دے تو چند رکعات تہجد ورنہ کم سے کم سحری، موقع بہ موقع قرآن مجید کی تلاوت، یہ معمولات کا ایسا سلسلہ ہے جو یقیناً انسان کو تھکا دینے والا اور اس کے عام مزاج و مذاق کے خلاف ہے، اس سے ہماری تربیت ہوتی ہے، کہ ہم اپنے اندر خلاف طبیعت باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، ہم بلند مقاصد کے لئے آبلہ پائی کرسکیں، طوفان ہمارے حوصلے پست نہ کریں، آندھیاں ہمارے قدموں کو کم ہمت نہ بنادیں، نامساعد حالات ہمارے لئے زنجیر پانہ بن جائیں، بلکہ اگر ہمارے سفر کی سمت صحیح ہو تو ہم اس کے لئے ہر طرح کی مشکلات اور ابتلاؤں کو سہنے کے لئے تیار ہوں، یہ حوصلہ مندی اور آبلہ پائی ہماری شخصی زندگی کے لئے بھی ضروری ہے اور قومی زندگی کے لئے بھی، افراد واشخاص کے لئے بھی ضروری ہے، اور جماعتوں اور تنظیموں کے لئے بھی، کامیابی کسی مادی مقصد کو حاصل کر لینے کا نام نہیں، بلکہ خدا کی خوشنودی کی راہ پر چلنے کا نام ہے، اس راہ میں کھونا بھی

پانا اور اس راہ میں مرنا بھی جینا ہے۔

رمضان المبارک ہمیں قرآن مجید سے وابستگی کا سبق دیتا ہے، اس ماہ میں قرآن نازل ہوا، تراویح نزولِ قرآن ہی کی یادگار ہے، شب قدر اور اعتکاف کا مقصد بھی نزول قرآن کی مبارک شب کو پانا ہے، عید الفطر اسی نزول قرآن کا جشن عام ہے، پس یہ مہینہ قدم قدم پر ہمیں قرآن مجید سے مربوط کرتا ہے، قرآن محض ایصال ثواب اور مردوں کے لئے بخشش ومغفرت کی کتاب نہیں، بلکہ یہ آئینہ حیات ہے، جس میں ہم اپنی عملی زندگی کی صورت گری کریں، اور اس کے خط وخال درست کریں، ہم اپنا جائزہ لیں کہ قرآن سے ہمارا تعلق کس قدر کمزور ہو چکا ہے، ہم تلاوتِ قرآن کے ذوق سے محروم، قرآن ہم سے کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس کے جاننے کی خواہش سے عاری، عملی زندگی میں قرآن کی پیروی کرنے کے بجائے، ہماری خواہشات اور مفادات ہماری رہبر ہیں، قرآن پوری انسانیت کے لئے امانت خداوندی ہے، اس کا حق تھا کہ ایک ایک بندۂ خدا تک اس کتاب کو پہونچایا جاتا، لیکن ہم نے صدیوں اس ملک میں رہنے کے باوجود اپنے برادرانِ وطن تک ان کی اس امانت کو پہونچانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، غرض کہ ہم گو حاملانِ قرآن ہیں، لیکن نہ قاریِ قرآن اور نہ عاملِ قرآن، نہ عالمِ قرآن اور نہ مبلغ قرآن، اس سے بڑھ کر اس کتاب کے ساتھ کیا ناانصافی ہوگی!

ہمیں چاہئے کہ ہم یہ عہد کریں کہ خود قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھیں گے، اپنے بچوں اور متعلقین کو تلاوتِ قرآن کا پابند کریں گے، کوشش کریں گے کہ خاندان میں کوئی نہ کوئی شخص حفظ قرآن مجید کی سعادت حاصل کرے، ہم اپنی عملی زندگی کو قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر استوار کریں گے، اور اپنی خواہشات اور وقتی مفاد پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھیں گے، قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں گے، اگر ہم عربی زبان سے واقف نہیں ہوں تو قرآن کے تراجم اور تفسیروں کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس کتاب میں ہم سے کیا فرماتا ہے، پھر ہم اس بات کا بھی عزم کریں کہ اپنے اہلِ تعلق غیر مسلم بھائیوں تک قرآن مجید کے تراجم پہونچائیں، تاکہ ہم دعوت کی

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکیں، جو اللہ تعالیٰ نے خیرامت ہونے کی حیثیت سے ہم سے متعلق فرمائی ہے۔

رمضان المبارک سے ہمیں مواسات اور غم خواری کا سبق ملتا ہے، جب انسان خود بھوکا رہے، تو وہ بھوک کی تکلیف کو محسوس کرسکتا ہے، اور اپنے ان بھائیوں کے دکھ کو سمجھ سکتا ہے، فاقہ مستی جن کے لئے معمولات کے درجہ میں ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس مہینہ کو "شھر المواساۃ" یعنی غم خواری کا مہینہ قرار دیا ہے، اور اس مہینہ کے ختم پر صدقۃ الفطر واجب قرار دیا گیا ہے، تاکہ اہلِ ثروت مسلمان اپنے غریب بھائیوں کو اپنی مسرت و شادمانی میں شریک کرسکیں، یہ سبق سال بھر یاد رکھنے اور یہ عمل ہر دن دہرانے کا ہے، کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے کام آئے، وہ اس کی مصیبت و پریشانی کو اپنی مصیبت و پریشانی سمجھے، وہ اس وقت تک اپنی خوشی کو نامکمل سمجھے جب تک کہ اس کا بھائی بھی اس خوشی میں شریک نہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری عملی زندگی، اسلامی اخوت کے اس تصور سے دور ہوتی چلی جارہی ہے، اہل دولت اپنی دولت کے نشہ میں سرشار ہیں، امت کے محتاج اور ضرورت مند لوگوں کا انہیں کوئی خیال نہیں، بلکہ ان کی عیش پرستی، غریب مسلمانوں کے لئے پریشانیوں کا موجب ہے، شادی بیاہ کی فضول رسمیں، اور اس میں ہونے والی فضول خرچیاں اصل میں ہمارے مالدار طبقے ہی کی دین ہیں، بیچارے کم آمدنی والے لوگ ان شاہ خرچیوں کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں، غریب خاندانوں میں پیدا ہونے والے بہت سے ذہین بچے مجبوراً تعلیم کو چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ بڑھتی ہوئی رشوت ستانیوں کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے، یہ رشوت کا بازار قوم کے دولت مند طبقہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو کچھ معاشی فراغت دی ہو وہ اپنے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں اور انہیں اونچا اٹھانے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں اوقات کی پابندی اور اسکے انضباط کا بھی سبق دیتا ہے، یوں تو اسلام

میں تمام عبادتیں وقت سے مربوط ہیں، لیکن روزہ میں تو بہت زیادہ انضباط وقت کی ضرورت پڑتی ہے، رات کے آخری پہر میں بیدار ہونا، اور صبح صادق سے عین پہلے سحری کھانا، اگر اس میں ذرا بھی تاخیر ہو اور صبح طلوع ہونے کے بعد ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا، پھر غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کرتا ہے، اگر پہلے افطار کر لیں، تو روزہ درست نہ ہو، اور دیر سے افطار کریں تو کراہت ہے، روزہ افطار کرنے اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے کہ عشاء کا وقت شروع ہوا، اب نماز عشاء پڑھنا، پھر اس کے بعد تراویح پڑھنی ہے، اگر اللہ توفیق دے تو پھر سو کر اٹھنے کے بعد نماز تہجد ادا کرنی ہے، یہ پورا نظام العمل اس قدر مشغول اور مربوط ہے کہ انضباط وقت کے بغیر ان کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔

یہ وقت کی حفاظت کا بہت بڑا سبق ہے، وقت ایسی قیمتی چیز ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، وقت کی قدر دانی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے، اور وقت کی ناقدری میں دونوں کا نقصان، اب مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہماری تقریبات نہ وقت پر شروع ہوتی ہیں، نہ وقت پر ختم، یہاں تک کہ ہماری مذہبی تقریبات اور جلسے وغیرہ بھی وقت پر شروع نہیں ہوتے، نہ معینہ وقت پر ان کو ختم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بعض دفعہ رات کے دو ڈھائی بجے تک ہماری تقریروں کا جوار بھاٹا ابلتا رہتا ہے، ایسی صورت میں کیسے امید رکھی جا سکتی ہے کہ ہمارے بھولے بھالے سامعین فجر کی نماز ادا کر سکیں گے؟ یہ وقت کے معاملہ میں فضول خرچی اور اسراف ہے، اور یہ مال و دولت کے اسراف سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔

روزہ ہمیں اس بات کا عادی بناتا ہے کہ ہم اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب کرنا سیکھیں، بھوک و پیاس انسان کی ایسی خواہش ہے کہ ان کو چند گھنٹے بھی روکنا دشوار ہے، چہ جائے کہ صبح سے شام تک، بظاہر کوئی طاقت روکنے والی نہیں، کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں، اس کے باوجود انسان کھانے پینے سے رکا رہے، اس سے بڑھ کر اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے تابع کرنے کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ یہ ایک رسمی عمل نہیں بلکہ تربیتی عمل

ہے، یہ عمل گو ایک ماہ میں فرض ہے لیکن یہ اپنی روح اور مقصد کے اعتبار سے ایک ماہ میں محدود نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ یہ کیفیت ہر مسلمان کی زندگی میں سال بھر قائم رہے، ورنہ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ روزہ دار نے صرف روزہ کی صورت کو پایا ہے، نہ کہ روزہ کی حقیقت کو، اس نے روزہ کے قالب کو حاصل کیا ہے نہ کہ اس روح کو، اور رسول اللہ ﷺ کی زبان حق ترجمان کے مطابق اس نے بھوک و پیاس برداشت کی ہے، حقیقی معنوں میں روزہ نہیں رکھا ہے۔

ہم اپنی عملی زندگی میں بار بار اس امتحان سے گذرتے ہیں، کہ ہمیں خدا کی فرماں برداری عزیز ہے یا نفس کی تابع داری، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی مطلوب ہے، یا سماجی شہرت و ناموری، نکاح کی تقریبات میں کتنی ہی خلاف شرع باتوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، فوٹوگرافی، ویڈیوگرافی، بے پردگی، مرد و عورت کا اختلاط فضول خرچی، لڑکے اور اس کے خاندان کی طرف سے مختلف مطالبات، ولیمہ میں بے جا اسراف، عام طور پر یہ سارے گناہ سماجی عزت، جھوٹی شہرت، اور متعلقین کی خوشنودی کے لئے کئے جاتے ہیں، گویا خدا کی ناراضگی کی قیمت پر خلق خدا کی خوشنودی خریدی جاتی ہے، ایسے مواقع پر روزہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ مومن نے خدا کی خوشنودی کے بدلے اپنی خوشنودی کا سودا کرلیا ہے، اس لئے اس کو یہ بات قطعاً زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے جیسے انسانوں کی مرضی پر چل کر خدا کو ناراض کرے۔

قرآن نے سود کے حرام ہونے کا اعلان کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے نہایت سختی کے ساتھ نہ صرف شراب پینے بلکہ شراب سے متعلق ہر طرح کے تعاون کو منع فرمایا ہے، لیکن آج مسلمان اہل ثروت بے تکلف اپنی رقم بینکوں میں رکھتے اور اس کا سود حاصل کرتے ہیں، بعض لوگ تو وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی آخری زندگی اس سود پر گذارتے ہیں، کس قدر افسوسناک بات ہے، کہ بڑھاپے میں گناہ کرنے والے بھی، گناہ سے باز آجاتے ہیں، اور توبہ کی راہ اختیار کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے محروم القسمت ہیں کہ زندگی بھر محنت کی حلال کمائی کھا کر آخری وقت سود خواری میں گذارتے ہیں، جس شخص کا یقین اللہ

کی رزاقیت پر ہو اور نفس کی خوشنودی پر خدا کی خوشنودی کو غالب رکھنے کی لذت اور حلاوت سے آشنا ہو وہ بھلا آخر عمر میں اس سود خواری کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ یہی مواقع ہیں جن میں انسان کی ضبط نفس کی قوت کا امتحان ہوتا ہے، کہ روزہ نے صرف اسے بھوکا، پیاسا رکھا ہے، یا اس میں روحانی اور اخلاقی انقلاب بھی پیدا کیا ہے؟

(۱۴/دسمبر ۲۰۰۱ء)

تقویٰ ـــــ روزہ کا اصل مقصود

اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں ان میں انسان کی تربیت اور اصلاح کا پہلو بھی ملحوظ ہے، روزہ بھی ان ہی عبادتوں میں سے ایک ہے، جس میں نفس کی تربیت اور تزکیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پر روزہ اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ:۱۸۳) ''تقویٰ'' کا لفظ عربی زبان میں ''وقایہ'' سے ماخوذ ہے، وقایہ کے معنی انتہائی درجہ حفاظت کے ہیں، الوقاية فرط الصيانة (تفسیر کبیر:۱/۳۸۱) تقوی کے معنی جہاں بچنے کے ہیں وہیں خوف اور خشیت کے بھی ہیں، اور قرآن مجید میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: النساء:۱، الشوریٰ:۱۰۶، آل عمران:۱۰۲) گویا محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

اسی کو سلف صالحین نے مختلف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، خود حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جب تک بندہ گناہ کی باتوں سے بچنے کے لئے از راہ احتیاط بعض جائز باتوں سے بھی اجتناب نہ کرے متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ (تفسیر کبیر:۱/۳۸۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے تقوی کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے ایک مثال کے ذریعہ تقویٰ کو سمجھایا، حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا آپ رضی اللہ عنہ کبھی کسی خاردار راستہ سے گذرے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ اس موقعہ سے آپ رضی اللہ عنہ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے پائینچے اٹھا لئے اور احتیاط سے کام لیا۔ ''تشمرت و حذرت'' حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے، (تفسیر قرطبی:۱/۱۶۲) گویا دنیا ایک رہگذر ہے جو خاردار جھاڑیوں سے گھری

ہوئی ہے، یہ جھاڑیاں خواہشات اور گناہوں کی ہیں، جو انسان کے دامن عمل سے لپٹ جانا چاہتی ہیں، متقی شخص وہ ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے دامن کو خدا کی نافرمانیوں اور عصیان شعاریوں سے بچا کر دنیا کا یہ سفر طے کر لے۔

اس طرح تقویٰ ایک جامع لفظ ہے۔ جو خیر کی تمام باتوں کو شامل ہے۔(قرطبی:۱/۲۶۲) چنانچہ مشہور بزرگ شیخ ابو یزید بسطامی نے فرمایا کہ متقی وہ ہے کہ جو کچھ کہے اللہ کے لئے کہے، اور جو کچھ کرے اللہ تعالیٰ کے لئے کرے، **من اذا قال قال لله و من اذا عمل عمل لله** (حوالۂ سابق:۱/۱۶۱)۔ تقویٰ کے اسی وسیع مفہوم کو قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان فرمادیا ہے کہ:

> متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل فرمائی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔(البقرۃ:۳،۴)

اس سے معلوم ہوا کہ تین باتوں کو تقویٰ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان میں پہلی چیز عقیدۂ و ایمان کی اصلاح ہے۔ یہ اسلام کی خشت اوّل ہے، اور اسی پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہے، ایمان کا حاصل یہ ہے کہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی ان دیکھی باتوں پر اس کا یقین ایسا ہو جیسا انسان کو دیکھی ہوئی باتوں کا یقین ہوتا ہے، "یقین" بظاہر ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت کسی بات کا یقین انسان کی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا داعی ہوتا ہے، اگر لوگوں کے مجمع میں پلاسٹک کا مصنوعی سانپ بنا کر رکھ دیا جائے یا کسی عجائب خانہ میں شیر کا بھیانک مجسمہ بنا ہوا ہو تو کتنے ہی بڑے اور چھوٹے، بچے اور جوان، مرد اور عورت اس کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں اور بعض منچلے تو اس کی سواری کرنے سے بھی نہیں چوکتے، لیکن اگر لوگوں کے مجمع میں اس سے بہت چھوٹا حقیقی اور زندہ شیر آجائے یا سانپ نکل آئے تو ہر شخص کا خوف سے بُرا حال ہوگا، اچھے اچھے

بہادروں کو بھی راہِ فرار مطلوب ہوگی۔ نہ کھیل ہوگا نہ تماشہ ہوگا، نہ تبصرہ کی ہمت ہوگی، یہ ''یقین'' کا فرق ہے۔ حالانکہ شکل وصورت کے اعتبار سے دونوں شیر اور سانپ ہیں لیکن آدمی جس چیز کے بارے میں شیر اور سانپ ہونے کا یقین نہ رکھتا ہو تو خواہ بہ ظاہر وہ کتنا ہی بھیانک نظر آئے اس سے کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوتا ہے اور جب شیر ہونے کا یقین ہو جائے تو سوچ کے انداز ہی بدل جاتے ہیں۔

''ایمان'' ایسے ہی انقلاب انگیز یقین کا نام ہے، جو دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کردے، اور فکر ونظر کی کائنات میں انقلاب کا پیغمبر ثابت ہو، خدا پر ایمان انسان میں ایسی کیفیت پیدا کردے کہ گویا وہ اپنے خالق کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے دامن کو تھامے ہوا ہے۔ خدا کی محبت اس کے دلوں سے امنڈنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر چل کر وہ اتنا خوش ہو کہ گویا اس نے سب سے بڑی نعمت پالی ہے۔ خدا کے عذاب کا خوف اس کو لرزا دے اور اس کی آنکھوں کو اشکبار کئے بغیر نہ رہے۔ اسے ایسا لگے کہ جیسے جنت اور دوزخ اس کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ خدا کی کتاب پر اس کو اس درجہ کا یقین حاصل ہو کہ آنکھوں دیکھی باتوں پر بھی آدمی کو اس درجہ اطمینان نہیں ہوتا، اسے یوں لگے کہ جیسے یہ کتاب اسی کو مخاطب کررہی اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام اور سرگوش ہے۔ اس کیفیت کے بغیر ہمارا ایمان ناقص اور ناتمام ہے۔ ایک بے روح ایمان جو نہ گناہوں سے ہمارے قدموں کو روک سکے اور نہ نیکیوں کی طرف ہمیں لے جاسکے، تقویٰ کے لئے یہ پہلا زینہ ہے!

دوسری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: ''**اقامت صلاۃ**'' یعنی نمازوں کا قائم کرنا ہے۔ نماز کیا ہے؟ اپنے آپ کو خدا کے آگے بچھا دینا، اور سر سے پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سانچہ میں ڈھال لینا! زبان خدا کے ذکر سے تر ہے، ہاتھ نیازمندانہ خدا کے سامنے بندھے ہوئے ہیں، آنکھیں ایک غلام کی طرح جھکی ہیں، جسم بے حرکت کھڑا ہے، پھر جب نمازی رکوع میں جاتا ہے تو فروتنی اور بڑھ جاتی ہے، پشت خمیدہ، سر افگندہ، زبان پر تسبیح۔ اب سجدہ کی منزل ہے جو عجز وانکسار اور بے بسی کا نقطۂ عروج ہے۔ سر، پیشانی اور ناک انسان کے عزت ووقار کا سب سے بڑا مظہر ہیں، لیکن خدا کے سامنے یہ

سب زمین پر خاک آلود ہیں۔ ہاتھ بچھے ہوئے ہیں، جسم کے ایک ایک انگ سے خود سپردگی اور غلامی و بندگی ظاہر ہے، قدم قدم پر خدا کی کبریائی کا نعرہ ہے، اس کی حمد وثناء کا زمزمہ ہے، الحاح والتجا ہے، تضرع ودعاء ہے، اپنی گنہ گاری کا اقرار واعتراف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نماز خدا کی بندگی کا ایسا فطری اور اثر انگیز طریقہ ہے کہ اس کی ایک ایک کیفیت سے روح وجد میں آئے اور انسان کو خدا سے اپنی قربت کا احساس ہونے لگے۔ اس کو یوں محسوس ہونے لگے جیسے وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

پس یہ نماز ایک عنوان ہے، اور اس کے ذریعہ انسان کو ان تمام اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنا ہے کہ خدا کا کوئی حکم مسلمان سے ٹوٹنے نہ پائے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہشات اور چاہتوں کا ایسا دیوانہ ہو جائے کہ اللہ کی مرضیات اور اس کی چاہتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، وہ خدا کے حکم کو ہر حکم پر مقدم رکھے۔ اور جہاں نفس کو گراں گذرے وہاں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلہ کو اپنے آپ پر نافذ کرے۔

متقیوں کی تیسری صفت ''انفاق'' ہے۔ انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہیں قرآن کے بیان کے مطابق تقویٰ والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی کم وبیش عطا ہوتا ہے وہ اس کا ایک حصہ اپنے غریب بھائیوں پر خرچ کرتا ہے، دراصل دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال ودولت ہے۔ اس کی حرص اولاً خدا سے بے توجہ کرتی ہے۔ پھر دولت وثروت کا نشہ دل ودماغ پر چڑھتا ہے اور کبر وغرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی کبر دین واخلاق کے لئے سم قاتل ہے۔ اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، اور وہ لوگوں کے حقوق کو ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے، ''انفاق'' اسی کا علاج ہے۔ گویا انفاق سے صرف دوسرے انسانوں کی مالی اعانت ہی مراد نہیں ہے بلکہ یہ ''**حقوق العباد**'' کے لئے ایک عنوان کے درجہ میں ہے کہ جیسے انسان خدا کے حقوق ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔ اس لئے کہ خدا کا حق اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق

کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔ اس لئے کہ اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرنا ہے، خدا انسان کی عبادت اور بندگی کا محتاج نہیں۔ اور لوگوں کے حقوق کا ادا کرنا لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر ہے کہ انسان محتاج اور ضرورت مند ہے۔ اسی لئے بعض وجوہ سے حقوق الناس کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی زیادہ ہے۔

اس طرح تقویٰ تین باتوں کو شامل ہے، دل میں ایمان ویقین کی حقیقی کیفیت کو پیدا کرنا، ایسا یقین جو دل کی دنیا کو بدل دے، اور خدا کی مرضیات کو بجالانے میں اسے لطف آنے لگے، دوسرے وہ اللہ کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو، فرائض و واجبات کو پورا کرتا ہو اور گناہوں سے بچتا ہو، تیسرے وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، مال کے ذریعہ بھی غریب بھائیوں کا تعاون کرتا ہو۔ اور اپنی زبان سے بھی لوگوں کی عزت وآبرو کو محفوظ رکھتا ہو، اس طرح تقویٰ پوری انسانی زندگی کو شامل ہے، اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔

انسان کو چاہئے کہ جیسے وہ اپنی جسمانی بیماریوں کو تلاش کرتا ہے، اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو بھی تلاش کرے اور ان کے علاج کی طرف متوجہ ہو، کسی کی بیماری ایمان وعقیدہ میں چھپی ہوئی ہے وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، لیکن توہمات کا شکار ہے اور خدا سے نفع ونقصان کے بجائے دنیا کی چیزوں سے نفع ونقصان کا یقین اپنے دل میں بٹھائے ہوئے رہے، خدا کے خزانۂ غیبی سے زیادہ دنیا کے اسباب پر اس کا یقین ہے، تو اس کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی اصلاح کرے۔ اگر ایک شخص نیکیوں کے تمام کام کرتا ہو لیکن نماز کی توفیق سے محروم ہو تو نماز کا اہتمام ہی اس کے لئے تقویٰ کی کسوٹی ہے، عبادت کا اہتمام کرتا ہو لیکن لوگوں کے حقوق میں غافل ہو، غریب بھائیوں پر خرچ کرنا اس کی ڈکشنری میں نہ ہو تو اس کے لئے تقویٰ کا معیار ''انفاق'' ہے، اگر نماز وروزہ کی بھی توفیق ہو، اللہ کے راستہ میں خرچ بھی کرتا ہو، لیکن اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں، اس کی زبان لوگوں کی عزت ریزی پر کمربستہ رہتی ہو، اس کا سینہ کینوں اور کدورتوں سے معمور ہو، لوگ اس کی ترش روئی سے گھبراتے اور اس کی تند کلامی سے خوف کھاتے ہوں تو اخلاق

میں اس کا تقویٰ چھپا ہوا ہے، اگر وہ اس کی اصلاح کر لے تو "متقی" ہے۔

غرض تقویٰ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے، اور تقویٰ کی منزل تک پہنچنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان اپنی روحانی بیماری کی شناخت کرے، اور جہاں گناہ کا پیپ ہے وہیں اصلاح کا نشتر لگائے، اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ نیکیوں کی توفیق فرمائی تو اس سے دھوکہ نہ کھائے کہ کسی مریض کے لئے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند تصور کرنے لگے۔ روزہ کا مقصد ایک مسلمان کو تقویٰ کی منزل تک پہونچانا ہے، اب کہ رمضان المبارک کے آخری ایام ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور احتساب کا آئینہ اپنے رخِ زندگی کے سامنے کر دیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے تقویٰ کی طرف سفر شروع کر دیا ہے اور اگر شروع نہیں کیا تو کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟؟

(جنوری ر ۱۹۹۹ء)

عید کا پیغام امت مسلمہ کے نام

آج عید کا دن ہے، خوشیوں اور مسرّتوں کا دن، نئے خوبصورت رنگا رنگ کپڑوں نے ایک سماں باندھ دیا ہے، بڑے چھوٹے، جوان بوڑھے، معصوم بچے، مرد اور عورت ہر ایک چہرے کھلے ہوئے ایک دوسرے کو مسکراہٹوں کی سوغات پیش کرتے ہوئے، سیوئی اور شیر خور ما کی تو گویا برسات آگئی، بڑے ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں اور ننھے منھے بچے گلی کوچوں میں کوئل کی طرح چہچہا رہے ہیں اور رنگین و خوب صورت تتلیوں کی طرح اُڑتے پھر رہے ہیں، لیکن عید کا حاصل کیا صرف یہی ہے؟ کیا عید محض ایک ساعت مسرّت ہے جو آئے اور گذر جائے؟ شاید ایسا نہیں! اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر عمل سے پیغام دیتا ہے، عبرت و موعظت کے پہلوؤں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور زندگی کے ہر واقعہ کو مشعلِ راہ بنا دیتا ہے، جس کی روشنی سے اندھے بھی دیکھنے لگیں اور لنگڑے بھی چلنے لگیں، عبادت و بندگی ہو یا لوگوں کے باہمی معاملات، اسلام کا ہر طریقہ ایک ''بولتا ہوا'' عمل ہے کہ بہرہ بھی اس کو سننے سے محروم نہ رہیں۔

عید بھی سراپا'' پیغام'' ہے، دعوت ہے، عید سب سے پہلے ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو خوشی اور مسرّت کے لحات کس طرح گذارنے چاہئیں۔ غور کیجئے کہ مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی دن نہیں، لیکن نہ رقص و سرور ہے، نہ نغمہ و رباب ہے اور نہ مستی شراب، نہ پٹاخوں کی ادھم، نہ نعروں کا شور غوغا، نہ آتش بازیاں کا سیلاب، بلکہ ہر مسلمان صبح دم اٹھتا ہے، نمازِ فجر ادا کرتا ہے، پھر نہاتا ہے، صاف ستھرے اور میسر ہوں تو نئے کپڑے بدلتا ہے اور شانہ بشانہ نمازِ عید کے لئے رواں ہے، آنکھیں جھکی ہوئیں اور زبان پر اللہ کی کبریائی اور حمد و ثنا کے کلمات، عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کرتا ہے

اوراپنی پیشانی خدا کے سامنے مٹی پر رکھ کر اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے،خوشی کے مواقع پر آدمی میں کسی قدر کبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،اس لئے بار بار اپنی بڑائی کی نفی اور خدا کی بڑائی کا اقرار واعتراف کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اصل صاحبِ ایمان وہ ہے جو خوشی و مسرّت کے وقت اترانے نہ لگے،اس کی گردن مارے کبر کے اونچی نہ ہو،اس کی زبان پر اپنی بڑائی کا کلمہ نہ ہو، بلکہ وہ خدا کے سامنے جھکتا ہوا ہو،خوشی نے اس کے تواضع وانکسار کو بڑھایا اور اپنی بڑائی کے احساس کو گھٹایا ہو اور اس وقت بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو اور اس کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم،شادی بیاہ ہو، بچہ کی پیدائش ہو، نیا مکان خدا نے دیا ہو، دکان اور روزگار کا سامان میسرّ آیا ہو،کوئی بات خوشی کی پیش آئی ہو تو مسرّت کے اظہار کا وہی طریقہ اللہ کو پسند ہے کہ مؤمن کا سر شکر کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کی زبان اللہ کے ذکر اور حمد وثنا سے تر ہو۔عید مسلمانوں کے لئے اجتماعیت اور وحدت کا بھی پیغام ہے، مالدار ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام،فرمانروا ہو یا رعایا،سماج کا معزز اور مصروف شخص ہو یا کوئی معمولی اور غیر معروف آدمی، گورا ہو یا کالا اور عربی ہو یا عجمی،ایک ساتھ شانہ بہ شانہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس کے کرم کے سوالی ہیں، یہاں کوئی امتیاز نہیں،خدا کے دربار میں سب برابر ہیں،علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے وحدت کا اور کیا پیغام ہوگا؟؟ یہ سب مسلمان ہیں،کلمۂ توحید پڑھنے والے،محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ نبوت سے وابستہ، آخرت پر سب کا یقین، قرآن مجید پر ایمان رکھنے والے جیتے اور مرتے ایک قبیلے کے حامل،فکر ونظر کا کچھ اختلاف ضرور ہے،لیکن اس کے باوجود آج یہ شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم کھڑے ہیں،کاش دوسرے دنوں میں بھی اس وحدتِ ملی کو محسوس کریں اور سوچیں کہ کس

قدر دین کی بنیادی باتوں میں ان کے درمیان اشتراک واتفاق ہے اور اگر کچھ اختلاف ہے تو اس لائق ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کے ساتھ ان کو برداشت کیا جائے۔

''عید'' ہمیں اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ وہ خوشی، خوشی نہیں جس میں پورے سماج کو شامل نہ کیا جائے، آپ کے گھر میں مسرت کا چراغ جلے بلکہ چراغاں ہو اور آپ کا پڑوسی غم کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو، اس سے زیادہ نامبارک کوئی مسرت نہیں ہوسکتی۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید الفطر کے ساتھ ساتھ ''صدقۃ الفطر'' کا بھی حکم دیا ہے کہ ہر صاحبِ گنجائش مسلمان اپنی اور اپنے زیر پرورش لوگوں کی طرف سے گیہوں کی ایک خاص مقدار یا اس کی قیمت اپنے غریب بھائی کو پہنچائے اور عید سے پہلے پہلے پہنچا دینے کی کوشش کرے، تاکہ سماج کے غریب اور پریشان حال لوگ بھی عید کی خوشی میں شامل ہوسکیں۔ ''صدقۃ الفطر'' ایک علامتی عمل ہے، یہ صرف عید ہی کے دن کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ اس بات کی تسلیم ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ہر خوشی میں سماج کے غریب بھائیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ وہ خوشی ادھوری اور ناکام ہے جو اپنے گھر تک محدود ہے اور جس میں اپنے ان پڑوسیوں کو شامل نہ کیا گیا ہو جن کو خدا نے آپ کی نگاہِ لطف کا محتاج بنایا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچہ کی پیدائش کے ساتھ ''عقیقہ'' اور شادی کے موقع سے ''ولیمہ'' رکھا گیا ہے اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے جس میں سماج کے غریب لوگوں کو شریک نہ رکھا جائے۔ مسلمان وہ ہے کہ جسے دوسروں کی فکر تڑپاتی ہو جس کو دوسروں کی پریشانی بے قرار کر دیتی ہو جس کے لئے دوسروں کا غم اپنا غم بن جاتا ہے، جو دوسرے بھائیوں کے درد کی کسک اپنے دل میں پاتا ہو، اسے اپنی لڑکیوں کے ساتھ دوسرے غریب بھائیوں کی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بھی متفکر رکھتا ہو، اسے اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم کے دوسرے بچوں کی تعلیم کی فکر بھی بے چین رکھتی ہو، جو ان

بیواؤں، یتیموں اور بیماروں کے لئے بھی اپنے دل کو بے سکون پاتا ہو جن کے یہاں فاقوں سے گذرتی ہے اور جو اپنی بنیادی غذا اور دوا کے لئے بھی کسی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔ عید اپنی ''زبانِ بے زبانی'' سے ہر شخص کو یہ پیغام دیتی ہے۔ کاش! ہم اسے دل کے کانوں سے سن سکیں!

(........ ....)

اسلامی تہوار ـــــ تہذیب وشائستگی کانمونہ

۲۴ ستمبر کو ہمارے ہندو بھائیوں کی گنیش پوجا کا اختتامی پروگرام تھا، جو حسب روایت بہت بڑے جلوس کی صورت میں انجام پذیر ہوا، یہ اس عظیم الشان جلوس کا انیس واں سال تھا، جہاں یہ جلوس اپنے شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے غالباً ملک بھر میں مثالی جلوس ہے۔ وہیں نقضِ امن، شور شرابہ اور لوٹ مار بھی اس کی روایات میں داخل ہے، جس کا مظاہرہ اس سال بھی ہوا، اور خوب ہوا، ہر سال کی طرح اس سال بھی معظم جاہی مارکٹ پر گنیش جلوس کا استقبال کیا گیا۔ اور آر، ایس، ایس سیوا پر مکھ سریش راؤ جوشی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس جلوس سے خطاب کیا۔ آر، ایس، ایس قائدین میں حقائق کو قبول کرنے اور واقعات کا اعتراف کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ کیوں کہ جو جماعت سلبی مقاصد اور منفی اغراض کے لئے قائم ہوتی ہے، اور کام کرتی ہے۔ وہ مثبت حقائق کو قبول نہیں کرسکتی، لیکن بعض اوقات غیر شعوری طور پر سچائی زبان تک آجاتی ہے، اور انسان ''ان کہی'' کو بھی کہہ جاتا ہے۔

اس کی مثال جوشی صاحب کا وہ خطاب ہے جو انہوں نے اس موقعہ سے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ '' ہندو سماج میں ڈسپلن کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ خواتین اور کم عمر بچے ہماری مذہبی تقاریب میں شرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں'' ۔ یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے، اولاً تو گنیش تہوار کی حقیقت پر غور کیجئے تو یہ خود کس قدر مضحکہ خیز ہے، بدن انسان کا اور سر کا حصہ ہاتھی کا، یہ لطافت اور پاکیزگی خیال سے خالی افسانوی کہانی تو ہوسکتی ہے، عقل ودانش کبھی ایسے وجود کو باور نہیں کرسکتی، ایک نہایت ہی غیر سائنٹفک دیو مالائی کہانی پر اس تہوار کی بنیاد ہے۔ پھر اس کو منانے کا طور وطریق بھی کتنا عجیب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ تہوار قومی وحدت کی برقراری اور مذہبی وابستگی کے اظہار کا ایک

بہترین موقعہ ہے۔ انسان اپنی انفرادی شخصیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی وابستگی کو بھی چاہتا ہے، اور یہ ایک طرح سے انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے، اسی لئے دنیا کی کوئی قوم نہیں، جو تہواروں، میلوں، بازاروں اور قومی دنوں کی صورت میں اجتماعی تقریبات منعقد نہ کرتی ہو، یہ تقریبات جہاں اجتماعیت کا مظہر اور اپنے مذہب سے وابستگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں ہیں اس مذہب کے مزاج و مذاق اور اس کے افکار و تصورات کی عکاس بھی ہوتی ہیں، اسلام سے پہلے بھی عربوں میں بعض تہوار ہوا کرتے تھے، ایران میں موسم بہار کی آمد اور واپسی کے وقت، بہت گرم جوش تقریبات منعقد ہوتی تھیں، بعض اہلِ مدینہ نے بھی آپ ﷺ سے ان ایرانی تقریبات نیروز اور مہرجان کے منانے کی اجازت چاہی، لیکن آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی اور اس کے بجائے مسلمانوں کے لئے دو عیدیں مقرر فرمائیں ،ایک عید الفطر اور دوسرے عید الاضحیٰ، اسلام میں یہی دو تہوار ہیں،

اسلامی تہوار کی کچھ خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے مذاہب کی تقریبات سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں پہلی چیز معقول بنیاد و اساس پر اس کو منانا ہے، رمضان المبارک کے تیس روزے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں رکھے جاتے ہیں، اس ماہ میں پیغمبر اسلام ﷺ پر نزول قرآن کا آغاز ہوا، عید الفطر کا مقصد کتاب الٰہی کے حاصل ہونے اور خدا کا ایک حکم بجالانے کی توفیق میسر ہونے پر اظہارِ تشکر ہے۔ اسی طرح بقرعید اللہ کے ایک پیغمبر کی طرف سے رضاء الٰہی کی قربان گاہ پر اپنے بیٹے کو بھینٹ چڑھا دینے کی کوشش کی یادگار ہے، اور اللہ تعالیٰ سے عہد وفا کی تجدید ہے کہ وہ اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے، غرض ان دو تہواروں کی بنیاد پاکیزہ اور عقل و دانش سے ہم آہنگ واقعات پر ہے۔ نہ کہ نا قابلِ فہم اور خلافِ عقل افسانوں پر۔

دوسری خصوصیت اسلامی تہواروں کی فضول خرچی سے اجتناب اور ان اخراجات کو اپنے غریب بھائیوں کی مدد میں استعمال کرنا ہے۔ عید الفطر کے موقعہ سے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر صدقۃ الفطر واجب ہے۔ جس کا مقصد اپنی خوشی میں اپنے غریب بھائیوں کو شریک کرنا ہے اس کے علاوہ ہر صاحب حیثیت مسلمان پر اس کی دولت میں ڈھائی فیصد

زکوۃ واجب ہے۔ جو عام طور پر رمضان المبارک ہی میں نکالی جاتی ہے۔ اسی لئے عیدالفطر میں غریب سے غریب گھرانا بھی نئے کپڑے سلاتا ہے۔ اور چند شام سہی، آسودہ ہو کر کھاتا پیتا ہے، بقرعید سے قربانی متعلق کی گئی ہے۔ قربانی بھی خوش حال مسلمانوں پر واجب ہے۔ قربانی کے گوشت کا ایک حصہ غرباء پر اور ایک حصہ اپنے اقرباء اور رشتہ داروں پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر جانور کی کھال فروخت کر کے اس کی قیمت بھی غریب لوگوں ہی پر صرف کی جاتی ہے۔ صحیح اسلامی طریقہ پر اگر عیدین کو منایا جائے تو اس میں فضول خرچی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ غریبوں کی اعانت خوشی کے ہر موقعہ پر ملحوظ ہے، غور فرمائیے کہ لاکھوں کی تعداد میں مورتیاں بنانے پر کتنے اخراجات آتے ہوں گے؟ پھر زیبائش و آرائش، روشنی اور گانے بجانے پر کس قدر خرچ ہوتا ہے؟ پوجا کے منتظمین اس کے لئے دکانداروں سے جبراً بھاری رقوم وصول کرتے ہیں، جگہ جگہ راہ گیروں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے۔ غریب مزدوروں تک کو نہیں بخشا جاتا، اس کے لئے جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ اس جھگڑے نے قتل و قتال کی صورت اختیار کر لی۔ پھر یہ کروڑوں روپے چند دنوں کے بعد پانی کی نذر کر دیئے جاتے ہیں، نہ خود پیسہ دینے والوں کو اس سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے، اور نہ سماج کے غریب لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ پہونچتا ہے۔ حالانکہ ان بھاری رقوم سے لاکھوں غریب انسانوں کو کئی دنوں بھوک سے بچایا جا سکتا تھا، اور ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

اسلامی تہواروں کا سب سے بڑا امتیاز نظم و ڈسپلن اور تہذیب و شائستگی ہے، نہ جلوس ہے، نہ ریلی، نہ تلوار کی نمائش ہے نہ لاٹھی کی، نہ پٹاخے ہیں نہ آتش بازی، نہ دلوں کو دہلا دینے والا شور و ہنگامہ اور نہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو گھبرا دینے والا اشتعال انگیز نعرہ، بلکہ ہر مسلمان صبح سویرے نہا دھو کر، سفید کپڑے پہن کر، خوشبو لگا کر، گھر سے عیدگاہ کی طرف نکلتا ہے، زبان پر ہلکے ہلکے بول ہیں، اس میں بھی نہ اپنی بڑائی، نہ کسی کو للکار، بلکہ خدا کی کبریائی اور حمد و ثناء، عیدگاہ پہونچے، دو رکعت نماز ادا کی، پہلے گردن جھکائی، پھر پیشانی زمین پر رکھی۔ دوگانہ شکر ادا کر کے دعائیں اور خطبہ سنا، ایک دوسرے کو مبارک باد

دی، کیا امیر کیا غریب، کیا بڑے اور کیا چھوٹے، سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اور خوشی کا چراغ ایسا جلایا کہ اس کی لو غریب پڑوسیوں کے گھر بھی پہونچی، نہ کسی کے خلاف نعرہ بازی، اور نہ کسی سے معرکہ آرائی، بوڑھے، جوان، بچے، صحت مند اور معذور سب اس تقریب میں شریک ہیں، بے خوف اور مامون، بے خطر اور محفوظ، کتنی شائستگی ہے ان تہواروں میں! اور کتنی شرافت کی مظہر ہیں یہ تقریبات!! گویا نور کا ایک سمندر ہے، جو فرحاں اور شاداں خدا کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے، اپنی ''انا'' کا انکار کرتا ہے، جھکتا ہے، خوب جھکتا ہے، اور اپنی جبین بندگی کو خاک آلود کرتا ہے۔ اخوت و بھائی چارگی اور وحدت واجتماعیت اس کے ایک ایک منظر سے نمایاں ہے۔

ہمارے برادرانِ وطن نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، قومی اخوت، اتحاد، ذات پات کے تصور کی مخالفت۔ اپنی مذہبی وابستگی کا احساس، تہذیب و ثقافت، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا سلیقہ، اور نہ جانے کیا کیا؟ کاش وہ مسلمانوں سے مذہبی تقریبات کا سبق بھی سیکھتے! تو نہ ہندو تہوار دنگے فساد کا ذریعہ بنتا، اور نہ دیوالی میں آتش بازیوں کی صورت لوگوں کی گاڑھی کمائی جل کر خاکستر ہوتی، اور نہ تہواروں کے نام پر بے حیائی اور بے شرمی کے مناظر وجود میں آتے۔ لیکن دوسروں سے کیا شکوہ، اور غیروں سے کیا گلہ! کیا یہ حقیقت نہیں کہ خود مسلمانوں نے اپنے مہذب اور شائستہ طور وطریق کو خیر آباد کہہ کر غیر مہذب اور ناشائستہ طریقے اختیار کر لئے ہیں؟ کیا ہم شب براءت میں پٹاخے اور آتش بازیاں دیوالی سے کم کرتے ہیں؟ کیا بے مقصد جلوس اور ریلی ہم نہیں نکالتے؟ کیا شور شرابے کے ساتھ ہم نے بھی بعض تقریبات ایجاد نہیں کر لی ہیں؟ مقام فکر ہے کہ دوسری قومیں اپنے ناشائستہ طور وطریق پر شرمائیں اور ہم ان ہی طریقوں کو سیکھ کر اپنے لئے وجہ افتخار تصور کریں!!

(۲۶ر مارچ ۱۹۹۹ء)

غم کے زیرِ سایہ عید

کیوں کر کہوں کہ آج عیدِ سعید کا دن ہے؟ عید دامن مراد کو بھرتی ہے، عید خوشیوں کی سوغات ساتھ لاتی ہے، عید سے مسرت کے غنچے کھلتے اور غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، عید تو قصر شاہی سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ہر جگہ خوشیاں بانٹتی ہے اور پروانۂ شادمانی بن کر کاشانوں سے آشیانوں تک ہر جا پہنچتی ہے، مگر کیا ہے کہ آج کی اس عید پر غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، آج آنکھیں خوشی کے آنسوؤں کے بجائے، اشک ہائے غم کا پیالہ بنی ہوئی ہیں، زبان پر نغمۂ مسرت کے بجائے نالۂ غم آیا چاہتا ہے، دل میں خوشی ومسرت کی خنکی نہیں، بلکہ صدمہ وافسوس کے انگارے سلگ رہے ہیں، حکمِ خداوندی کی تعمیل وتکمیل میں گو جسم پر نئے اور خوبصورت کپڑے زیب تن ہیں، لیکن یہی لباس جس پر نگاہیں تو رتیجھ جاتی تھیں، آج منہ چڑا رہی ہیں اور محرومانِ قسمت کا مذاق اڑا رہی ہیں۔

آہ! کہ یہی سرزمین ہے جہاں عرب کے بادیہ نشیں اسلام کا پیامِ محبت لے کر آئے، کوئی قافلہ مالابار کے ساحل پر اترا اور کوئی سندھ کے صحراؤں میں خیمہ زن ہوا، اس نے اس ملک کو انسانی وحدت کا پیغام سنایا، انسانوں اور انسانوں کے درمیان جس تفریق کو روا رکھا گیا تھا، اسے مٹایا، دبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھایا، عورتوں کو حیاء کی چادر عطا کی اور عزت واحترام دیا، ستی کی رسم ختم کی، اونچ نیچ کے خلاف آواز بلند کی، وحدتِ خداوندی کی صدا لگائی، انسانوں کو مخلوق کے سامنے جبینِ بندگی خم کرنے کی ذلت سے آزاد کرنے کی سعی کی، وہ جہاں گئے، محبت کے سوداگر بن کر گئے، ظلم کو روکا، جور وستم کے ہاتھ تھام لیے، مذہبی آزادی دی، کسی کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے سجدوں سے آباد کیا اور اخلاق ومحبت کے چراغ ہر جگہ جلائے، اپنے عدل وانصاف کے ذریعہ دشمنوں کو دوست بنایا اور جن تلواروں میں انتقام وخوں آشامی کے جذبات تڑپ

رہے تھے وہی ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کم و بیش آٹھ سو سال اس ملک پر اس طرح گذرے کہ ہر صبح سورج ان کی ظفر مندی و اولوالعزمی کا پیام سنانے کو طلوع ہوتا تھا۔ اگر یہ قوم دشمن کو تہہ تیغ کرنے کا مزاج رکھتی تو مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود اس تاریخ کو لکھنے کے لیے بھی شاید باقی نہیں رہتا، اگر مسلمان جبر وقہر کے ساتھ دوسری قوموں کو مسلمان بنانے کے قائل ہوتے، تو چند نسلیں ہی اس ملک کی قسمت بدلنے کے لیے کافی ہوتیں اور اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا باقی نہیں رہتا، مسلمانوں نے سیاست و جنگ کے میدان میں جتنی طالع آزمائی کی، اگر انہوں نے اس کی ایک چوتھائی، بلکہ اس سے بھی کم محنت دعوتِ اسلام کے لیے صرف کی ہوتی، تو یقیناً یہ ملک گلشنِ اسلام بن کر پوری دنیا کو عطر بار کرنے کے موقف میں ہوتا، لیکن مسلمانوں نے نہ جور و ظلم اور جبر و اکراہ کی وہ راہ اختیار کی جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے اور جو یقیناً مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں اور نہ دعوتِ دین کے اس فریضہ کی طرف توجہ دی جو اس کا منصبی فریضہ اور اس کی اساسی ذمہ داری ہے۔

اس طویل عرصۂ حکمرانی میں انہوں نے وسیع تر متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، عربوں کی فراخدلی وسادگی دی، عجم کی نزاکت اور لطافت عطا کی، ثقافت وتہذیب کے سبق دیے، معاشی استحکام بخشا اور اسے سونے کی چڑیا بنایا، پھر اس چڑیے کے بال و پر نوچنے کے بجائے اسے سنوارتے اور نکھارتے رہے، اس ملک کے چپہ چپہ کو حسین وجمیل عمارتوں، پرشکوہ قلعوں، فلک بوس میناروں اور سبزہ زار باغیچوں کے گھنوں سے سجایا اور اس کی عزت و شہرت کو دوچند کیا، لیکن چوں کہ اس بار آور سرزمین پر ایمان کی تخم ریزی نہیں کی گئی اور اس گلشن کو گلہائے ہدایت سے سنوارنے کی کوشش نہیں ہوئی، اس لیے بالآخر بلند افروزی و ظفر مندی کے سورج نے اپنا منہ پھیر لیا اور غلامی کی زنجیر نے پورے ملک کو پابہ جولاں کر کے رکھ دیا۔

اس عہد نامراد میں بدیشی دشمنوں نے اس ملک کے اصل باشندوں کے درمیان نفرت کی کھیتی لگائی اور ایک ایسی تاریخ رقم کرنی شروع کی جو بے دلیل وثبوت تھی اور جن کا

مقصد افواہوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنا تھا۔ اس جھوٹی تاریخ کا ایک حصہ بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کیا تھا، لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابلِ یقین ہے، کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا بھی ہو، بابر نے خود ترکی زبان میں ''بابر نامہ'' تحریر کیا ہے، نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر نامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور مقیم ہوا تھا، چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں۔ (بابر: ۹۳) پروفیسر آرناتھ (یونیورسٹی آف راجستھان جے پور) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا۔ (بابر: ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہے اس کی صداقت کو پرکھنے کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے۔ اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ بابر شدید مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا، منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ راجہ شیو پرساد نے اپنی کتاب ''آئینۂ تاریخ نما'' کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل وانصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دور میں نظمِ حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا تھا۔ پروفیسر آرناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جا سکے، پروفیسر شری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو۔ پروفیسر آر سی رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا۔ (بابر: ۸۰)

مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی

رواداری'' میں بابر کی عالی ظرفی اور حسن سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر بنر جی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مندر اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے۔ اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے۔ (بابر: ۸۲) یہاں تک کہ بابر نے اپنے وصیت نامہ میں گاؤ کشی سے منع کیا ہے، تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

''میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں...... رام چرت مانس یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی ہے کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنائی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرایا تھا، اکبر کو چوں کہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا، اس لیے اس نے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بنوا دی، ۱۹۴۶ء سے پہلے غالباً بابری مسجد کے محل وقوع کے سلسلہ میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۸۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ عدالت میں گیا، اس وقت مہنت رگھو بر داس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو سردی، گرمی اور برسات سے بچانے کے لیے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے، لیکن ۲۴/ دسمبر ۱۸۸۵ء کو عدالت نے یہ عرضی رد کر دی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود

ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے سے نہیں پایا جاتا تھا۔

ان سب کے باوجود سنگھ پریوار نے اس مسئلہ کو لے کر نفرت کی آگ سلگائی اور اس کے شعلے خوب بھڑکائے، یہاں تک کہ ۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ظلماً شہید کردی گئی اور اس کے بعد جو فسادات پھوٹ پڑے ان میں ہزاروں مسلمان شہادت سے سرخرو ہوئے۔ آج بھی یہ حادثہ ہندوستان کے سیکولرزم کے لیے ایک امتحان بنا ہوا ہے۔ ایسے موقع پر ایک طرف ہمیں ظاہری تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، دوسری طرف اللہ سے رجوع کرنا چاہیے کہ مؤمن کی کامیابی وسرخروئی کا اصل راستہ خدا کی مدد ہے، اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اے ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ. (بقرۃ:۱۵۳) صلوٰۃ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے رجوع اور انابت کا جلی عنوان! بے قراروں کے قرار کا سامان کرتے ہوئے قرآن نے کیا خوب کہا ہے:

''أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ.'' (نمل:۶۲)

''کون ہے جو بے قرار کی التجا سنتا ہے، جب کہ وہ اس سے دعا کرتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے، نیز کون ہے جو تم کو زمین میں اگلوں کا جانشین بناتا ہے؟؟''

پس، آیئے! کہ آج قبولیت اور استجابت کی اس گھڑی میں اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں، اس سے اپنی عجز و درماندگی کا دکھڑا روئیں، اسی کے دربار میں آنسوؤں سے وضو کریں، اس کی چوکھٹ پر سر رکھ کر ملتجی ہوں کہ الٰہی! ہمارے گناہ بہت ہیں، ہماری کوتاہیاں بے شمار ہیں، لیکن آپ کے عفو و درگذر کا دامن اس سے بھی وسیع ہے، ہماری کوتاہیاں اپنی جگہ، لیکن ہم آپ ہی کی طرف منسوب ہیں اور اسی نسبت سے مارے جاتے ہیں، لوٹے جاتے ہیں، بے آبرو کیے جاتے ہیں اور جرمِ بے گناہی کی پاداش میں بدنام کیے جاتے ہیں، خداوند! اس نسبت کا خیال فرما! اور مخالفتوں کے بھنور میں گرفتار اس امت کے

سفینہ کو ساحلِ مراد تک پہنچا! الٰہا! عید کے دن جو انعام (جائزہ) کا دن ہے، اس سوگوار امت کو خوشیوں سے ہم کنار فرما! جو امت ذلت و رسوائی کے دن دیکھتے دیکھتے اور اپنی بے توقیری کی خبریں سنتے سنتے مایوسی و ناامیدی کے دور سے گذر رہی ہے، اسے صبحِ امید سے سرفراز فرما! اور اس نئے سال کو اس کے لیے برکت و سعادت، قبول و استجابت اور عزت و وقار کا سال بنادے! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. آمین یا ربّ العالمین!

(۶ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

اسوۂ ابراہیمی

اسلام کے اصل معنی افگندگی اور تسلیم و رضا کے ہیں، انسان اپنے آپ کو خالق کے حکم کے سامنے بچھا دے، اپنی خواہشات کو خدا کی رضا جوئی کی چوکھٹ پر قربان کردے اور یہ عقیدہ و ایمان نے سے لے کر جان، مال اور اس سے بڑھ کر اولاد و عیال تک ہو جائے تو یہ بندگی کا کمال اور عبدیت کی معراج ہے۔ عبدیت و بندگی کا یہ درجہ و مقام انسان کے جس گروہ کو سب سے بڑھ کر حاصل ہے، وہ حضرات انبیاء کرام ہیں جو اللہ کے سب سے محبوب بندے اور انسان کے لئے اسوۂ کامل ہیں، ان کا ایک ایک عمل زمین پر اللہ کی مرضیات کی زندہ شہادت ہے، یہ انبیاء زمین پر ہدایت کی روشنی اور مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت انبیاء کرام میں بھی کسی قدر مرتبہ و مقام کا فرق رکھا ہے۔ نبوت کے سلسلۃ الذہب میں ایک نہایت عظیم اور برگزیدہ شخصیت ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے قربانی کی کوئی قسم نہیں جو ان سے چھوٹی ہو اور امتحان و آزمائش کی کوئی بھٹی نہیں جس میں ان کو تپایا نہ گیا۔ انہوں نے اپنے خالق کے ساتھ وفا شعاری، عبدیت و بندگی، خدا کی محبت میں خلائق دنیا سے بے نیازی، خود سپردگی، شرک سے نفرت، دعوت حق اور بیت الٰہی کی تعمیر و تجدید کے ایسے زندہ و تابندہ نقوش خدا کی زمین پر چھوڑے کہ خود خدا کو بھی اپنے اس وفا شعار بندے کی ادائیں محبوب و مرغوب ہو گئیں اور امت محمدیہ کے لئے سنن ابراہیمی کو تازہ رکھنے کا سامان کیا گیا۔ حج دراصل اللہ کے اسی نیک بندے کی یادگار اور خدا کے سامنے تسلیم و رضا کا شعار ہے۔ کعبہ جس کی بنیادیں تک مٹ چکی تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی۔ آج بھی مقام ابراہیم کعبہ کے سامنے موجود ہے، زمزم کا چشمۂ حیوان حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے نصرتِ الٰہی کی یاد دلاتا ہے، صفا اور مروہ کی سعی سے ایک بندیٔ صالحہ حضرت ہاجرہؓ کی بے چینی اور بے تابی

کی یاد تازہ ہوتی ہے، پھر منیٰ کی قربانی اس ذبحِ عظیم کی یادگار ہے، جس میں ایک پیغمبر نے اپنے لختِ دل کو اپنے تئیں خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا، جمرات کی کنکریاں عزمِ ابراہیمی اور وسوسۂ شیطانی سے پنجہ آزمائی کا اظہار ہے۔

یہی اسوۂ ابراہیمی ہے کہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی چوکھٹ پر قربان ہو جائے، اپنی اور اپنوں کی خواہش، دوستوں اور قرابت داروں کی خوشی، انسانی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ اللہ کا حکم اور ہوتا ہے، انسان کی خواہش کچھ اور، نفس چاہتا ہے کہ یہ حلال ہو مگر شریعت اسے حرام قرار دیتی ہیں، یہی وقت ہے انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے، شادی بیاہ کا موقع دیکھئے، نوشہ کی طرف سے خطیر رقم کا مطالبہ ہے، نوشہ کے والد کی خواہش ہے کہ کھانا کا خوب سے خوب تر اور اچھا سے اچھا انتظام رہے، نوشہ کی والدہ کی طرف سے زیورات کی طلب ہے، بھائی بہنوں کا شوق ہے کہ اچھی قسم کی گاڑی ضرور ملے، دوست احباب کہتے ہیں کہ اگر اس موقع سے بھی رقص و سرور نہ ہو تو تقریب میں کیا لطف آئے گا؟ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی ان سب کے خلاف ہے، شریعت اس لین دین کو رشوت قرار دیتی ہے، گانے بجانے کو منع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ موقع خدا کا شکر بجالانے کا ہے، اس کے سامنے سر جھکانے کا ہے، خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کا ہے، یہی وقت ہے کہ انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے کہ کیا وہ اپنے جذبات کو خدا کی مرضی پر قربان کرنے اور اپنے متعلقین کی خواہش کو خدا کے رسول کی خواہش کے سامنے بھینٹ چڑھانے تیار ہے؟

انسان کے لئے بڑے امتحان کا موقع کسبِ معاش کے ذرائع ہیں، ان میں حلال وحرام کا امتیاز، حرص وہوس کے اس دور میں تقویٰ کی اصل کسوٹی ہے، امام محمدؒ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، زہد وتقویٰ کے موضوع پر آپ نے قلم نہیں اٹھایا؟ امام محمدؒ نے اپنی اس کتاب کا حوالہ دیا جس میں معاملات اور کسبِ معاش کے احکام ہیں اور فرمایا کہ وہی زہد وتقویٰ کی کتاب ہے، یعنی معاش کے معاملہ میں اپنے آپ کو حلال کی حدود میں قائم رکھنا اور حرام سے بچائے رکھنا ہی انسان کی دکھتی رگ

ہےاور اس میں اپنے آپ کو حکم شریعت کا پابند بنالینا اصل تقویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان کے لئے نماز روزہ کا اہتمام آسان ہوتا ہے، آدمی حسب توفیق کچھ ذکر و تسبیح بھی کر لیتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اس نفع سے دست کش رکھنا دشوار ہوتا ہے جس کو شریعت جائز نہ رکھتی ہو اور جس کو آج کا سودی نظام حلال کئے ہوئے ہے۔ یہ مواقع ہیں کہ جہاں اسوۂ ابراہیمی ایک صاحب ایمان کے سامنے آئینہ بن کر آجاتا ہے، وہ اس میں اپنے ایمان، حکم خداوندی کے سامنے تسلیم و رضا اور شریعتِ الٰہی کے سامنے سر افگندگی کی تصویر دیکھے اور خود اپنے آپ کو تولے کہ اس نے جانور کی قربانی کر کے علامتی طور پر خدا سے خود سپردگی کا جو وعدہ کیا تھا، کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس وعدہ کو وفا کر رہا ہے؟؟

(۱۷/مارچ/۲۰۰۰ء)

ہجری کیلنڈر

لیجئے! کیلنڈر نے ایک اور صفحہ الٹ دیا، اب ۱۴۱۸ھ کے بجائے ۱۴۱۹ھ ہے۔ اسلامی کیلنڈر ''ہجری کیلنڈر'' کہلاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعہ ہجرت کی طرف اس کی نسبت ہے، عربی زبان میں ''ہجر'' کے معنی چھوڑنے کے ہیں، اسی سے ہجرت کا لفظ ماخوذ ہے، ہجرت ایک اسلامی اصطلاح ہے، ایمان کی حفاظت یا دین کی اشاعت کی غرض سے ترکِ وطن کرنے کو ''ہجرت'' کہتے ہیں۔ ''تارکین وطن'' آج کل ایک بین قومی اصطلاح ہے، ہر ملک میں تارکین وطن موجود ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، یہ وہ تارکین وطن ہیں، جنہوں نے معاشی اور سیاسی مقاصد کے تحت اپنا وطن چھوڑا ہے، ان کو مہاجرین کہنا ''ہجرت'' کے مقدس لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

ہجرت دراصل پیغمبروں کی سنت ہے۔ شاید ہی کوئی پیغمبر ہو جس کو ہجرت نہ کرنی پڑی ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام وغیرہ کی ہجرت کے واقعات تو خود قرآن مجید میں مذکور ہیں، لیکن تاریخ میں ہجرت کے نام سے جو شہرہ آپ ﷺ کی ہجرت کو ہوا، کسی اور پیغمبر کی ہجرت کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی، آپ ﷺ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے اور ٹھیک ۴۰ سال کی عمر یعنی ۶۱۱ء میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، آپ ﷺ کی صداقت و دیانت اور اخلاقی خوبیوں کا پورے مکہ میں چرچا تھا، آپ ﷺ نے اپنا بچپن اور جوانی اسی مکہ میں گزارا، نبوت کے بعد آپ ﷺ کے خلاف لوگوں نے ہر طرح کی ایذاء رسانی کا راستہ اختیار کیا، لیکن کوئی انگلی نہ تھی جو آپ ﷺ کے کردار پر اٹھے اور کوئی زبان نہ تھی جو آپ ﷺ کی دیانت و پاکیزگی پر کھلے۔

۱۳ سال آپ ﷺ نے مکہ میں دعوتِ دین کی جد و جہد فرمائی۔ یہ ۱۳ سال ایسے گزرے کہ شب و روز آپ ﷺ بے قرار رہتے کہ کسی طرح اللہ کے بندے اللہ کو پالیں اور

صحیح راستہ کی طرف آجائیں، پورا دن آپ ﷺ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر دعوت دینے میں گزارتے، ایک ایک دروازہ پر پہنچتے اور دروازۂ دل کو دستک دیتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور اس کی خوشامد فرماتے، لیکن بہت کم لوگ تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ حق کی روشنی ان کے سامنے دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل کر آگئی، مگر بت پرستی اور بے دینی کو چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں تھے، کیوں کہ یہی ان کے آباء واجداد کا مذہب تھا، اس درمیان کوئی تکلیف نہ تھی جو آپ ﷺ کو پہنچائی نہ گئی ہو، آپ ﷺ کا پورے خاندان سمیت بائیکاٹ کیا گیا، مسلمان لقمہ لقمہ کو ترستے تھے اور آپ ﷺ اپنے اہل خاندان کے ساتھ درخت کے پتے اور چھال تک کھانے پر مجبور تھے، جسم اقدس پر اونٹ کی اوجھ اور غلاظت ڈال دی گئی، گلے میں پھندہ ڈال کر جان لینے کی کوشش کی گئی، راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، جملے کسے گئے اور تالیاں پیٹی گئیں، آپ ﷺ کو فاتر العقل اور جادوگر مشہور کیا گیا۔

نبوت کے سال آپ ﷺ نے طائف کا رخ کیا، شاید ان کو قبولِ اسلام کی توفیق ہو، لیکن طائف کی زمین مکہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی، انہوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ آپ ﷺ کے پیچھے اوباش لڑکوں کو بھی لگا دیا، یہ آپ ﷺ پر پتھر پھینکتے، خاک اُڑاتے، ہنستے اور تمسخر کرتے، جسم لہولہان ہوگیا، نعلین مبارکین میں خون جم گئے، گھٹنے زخمی ہوگئے، آپ ﷺ بیٹھ جاتے، تو یہ آپ ﷺ کو کھڑا کردیتے، حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو کاندھوں پر اٹھالیا اور ایک باغ کی پناہ لی، ٹوٹے ہوئے دل اور اشکبار آنکھوں سے آپ ﷺ خدا کی طرف متوجہ ہوئے، جب مطمئن ہوگئے تو بڑی پُر درد دُعاء فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا:

> ’’الٰہا! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں، آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بے کسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں، آخر آپ مجھے کس کے حوالے کررہے

ہیں؟ کیا اس حریف بے گانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے، یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملہ پر قابو رکھتا ہے؟؟ لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے، میں اس بات کے مقابلہ میں کہ آپ کا غضب مجھ پر پڑے یا آپ کا عذاب مجھ پر نازل ہو، آپ ہی کے نور جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں، اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں، مجھے تو آپ کی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے، آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت وطاقت نہیں مل سکتی۔"

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایمان اور اسلام کی جو تخم آپ ﷺ نے مکہ اور طائف کی سرزمین میں بوئی تھی، اللہ اس سے اہل مدینہ کے دلوں کو بارآور فرما رہا تھا، بارش کہیں اور ہو رہی تھی اور ایمان کا آب حیات کہیں اور جمع ہو رہا تھا، حج کے موقع سے مدینہ کے لوگ مکہ آئے، ان کے کان آپ ﷺ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ مخلص اور حق کے متلاشی تھے، ضد اور اکڑ نہ تھی، اس لئے فوراً ہی کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ طے ہوا، ایمان لائے اور اہل ایمان کو پناہ دینے کا عہد بھی کیا، مکہ کی زمین بتدریج اہل ایمان پر تنگ سے تنگ تر ہوتی جاتی تھی، بعض مسلمانوں کو گلے میں پھندا ڈال کر گرم ریتوں پر گھسیٹا جاتا، بعضوں کو سلگتے ہوئے شعلوں پر لٹایا جاتا اور ان کے جسم سے رسنے والے لہو سے آگ بجھائی جاتی، کسی کو دھوئیں کی دھونی دی جاتی، بعضے تو بے رحمی سے شہید ہی کر دیئے گئے۔

لیکن مجال نہ تھی کہ دامنِ صبر مسلمانوں سے چھوٹ جائے اور حکم خداوندی کے بغیر وہ اپنے طور سے فیصلہ کریں، آخر خود خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آجائیں، مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ آنے لگے اور صرف وہی مکہ میں رہ گئے، جو یہاں سے جا نہیں سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ ابھی تک مکہ ہی میں مقیم تھے اور اپنے بارے میں حکم خداوندی کے منتظر، اسلام کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا، ہر قبیلہ سے ایک

ایک نمائندہ لے کر درِ دولت کا محاصرہ کرلیا، ادھر خدا کی طرف سے صورتِ حال سے آپ ﷺ کو آگاہ فرمایا گیا، آپ ﷺ پورے اطمینان کے ساتھ کچھ آیتیں پڑھتے ہوئے اور ایک مشتِ غبار محاصرین پر پھینکتے ہوئے باہر نکل آئے اور چھپتے چھپاتے کچھ دنوں میں مدینہ تشریف لائے، آپ ﷺ کے سر دھڑ پر انعام مقرر ہوا، پیچھا کرنے والوں نے پیچھا کی اور اپنے تئیں آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر کی جان لینے کی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھی، مگر خدا کی تدبیر کے سامنے ساری تدبیریں اکارت گئیں اور نبوت کا جو آفتاب مکہ میں طلوع ہوا تھا، مدینہ میں مہرِ نیم روز بن کر روشن ہوا۔

آپ ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو جشن کا منظر تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت، آقا اور غلام، بڑے اور چھوٹے، دل اور آنکھیں بچھائے پروانہ وار کھڑے تھے، زبان پر استقبالیہ نغمے، نگاہانِ شوق بے تاب، یا تو مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ تھی یا پھر مدینہ نے دل و جگر راہوں میں بچھا رکھے تھے۔ مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کو اہل مدینہ نے اپنے یہاں جگہ دی، گھر دیا، زر دیا، کھیت اور باغات نثار کئے اور سب سے بڑھ کر اتھاہ محبت اور پیار کی سوغات دی۔ اہل مدینہ نے جو ایثار کیا، شاید ہی انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ اہلِ مکہ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، وطن کی فضاؤں کو خیرباد کہا، اعزہ و اقرباء کی محبت قربان کی اور اپنی پوری دنیا سے منھ موڑ کر ایک ایسی منزل کو چل پڑے جہاں اجنبیت سے سابقہ تھا اور مستقبل موہوم تھا، اس لئے آپ آپ ﷺ نے مکہ سے ترکِ وطن کر کے آنے والوں کو ''مہاجرین'' اور مدینہ کے رہنے والوں کو ''انصار'' کا نام دیا، مہاجرین کے معنی ہیں ''دین کے لئے ترکِ وطن کرنے والا'' اور ''انصاری'' کے معنی ہیں اہل ایمان کی مدد و نصرت کرنے والا۔ مسلمانوں میں ان دو طبقوں کے سوا کسی تیسرے طبقہ کا تصور نہیں، نہ ذات پات کا، نہ قبیلہ اور برادری کا، نہ ملک اور صوبہ کا، نہ زبان کا، کوئی اور تقسیم نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کی گوارا ہو۔

ہجرت کا یہ واقعہ ایک طرف مسلمانوں کی قربانی اور دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے رفقاء عالی مقام کے ایثار وفداکاری کی یادگار ہے اور دوسری طرف آئندہ اسلام کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا مقدمہ۔ یہ محض مکہ سے مدینہ کی طرف سفر نہیں تھا، بلکہ مغلوبیت سے غلبہ وظہور کی طرف اور مقہوریت سے طاقت وشوکت کی طرف سفر تھا، بظاہر مسلمانوں پر زمین تنگ ہورہی تھی، لیکن خدا نے اسی تنگی میں آفاق کی وسعت کو سمو رکھا تھا، یہ واقعہ نا اُمیدیوں میں اُمید کی کرن سے روشناس کرتا ہے اور حوصلہ شکن حالات میں اُمید وحوصلہ کا چراغ جلاتا ہے اور اس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کیسی کیسی قربانیوں اور جاںنثاریوں سے خدا کے اس دین کو سربلند کیا گیا ہے اور کس قدر خون و لہو کے ذریعہ حق وصداقت کے اس شجرۂ طوبیٰ کی آبیاری فرمائی گئی ہے؟

حضرت عمرؓ کے سامنے بحیثیت خلیفہ ایک فائل آئی، جس میں تاریخ درج تھی، سال درج نہ تھا، آپؓ کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا اپنا کیلنڈر ہونا چاہئے۔ آپؓ نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز رکھی اور غالباً حضرت علیؓ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ اسلامی کیلنڈر واقعۂ ہجرت پر مبنی ہونا چاہئے، چنانچہ مہینوں کی ترتیب وہی قائم رہی جو اسلام سے پہلے عربوں میں مروج تھی، محرم سے آغاز اور ذوالحجہ پر اختتام، اور سال کا آغاز واقعۂ ہجرت کے سال سے مانا گیا۔ اس طرح ۱۴۱۹ھ کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعۂ ہجرت کو اتنے سال گزر چکے۔

کیلنڈر بھی کسی قوم کی اپنی شناخت ہوتی ہے، اس سے قوم وملت کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے، ہجری کیلنڈر پر غور کر جایئے، اس میں اکثر مہینوں کے نام وہ ہیں جو اسلامی عبادات اور مسلمانوں کی مذہبی روایات کی نشان دہی کرتے ہیں اور نام ہی سے ان مہینوں سے متعلق عبادات اور واقعات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، دوسری قوموں کے جو کیلنڈر مروج ہیں، وہ بھی ان کے مذہبی افکار وروایات کا مظہر ہیں، یہی حال مہینوں اور ہفتوں کے نام کا ہے، مثلاً sunday اور Monday کے الفاظ ہی پر غور کیجئے، ان کے معنی ہیں

سورج کے دن اور چاند کے دن، چوں کہ اہل یونان کے یہاں ایک دن سورج کی پرستش کے لئے مقرر تھا اور ایک دن چاند کی پرستش کے لئے، اسی لئے مختلف دیوتاؤں کے نام سے دنوں کے نام ہوا کرتے تھے، کچھ اسی طرح کا معنی مہینوں کے نام کے پیچھے بھی کارفرما ہے، اسی لئے حضرت عمرؓ نے ان کیلنڈروں کو قبول نہیں فرمایا، جو اس زمانہ میں مروج تھے۔

پس اسلامی کیلنڈر مسلمانوں کی اپنی ایک پہچان ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس کیلنڈر کو رواج دیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے پس منظر اور اس کی دینی وملی حیثیت سے واقف کرائیں، علماء نے لکھا ہے کہ ہجری کیلنڈر کے چلن کو باقی رکھنا اور اس کی ترویج کی سعی کرنا فرض کفایہ یعنی امت کا اجتماعی فریضہ ہے ــــــ یہ کیلنڈر ہمیں ہمارا تشخص یاد دلاتا ہے اور ہجرت کے عبرت آمیز اور موعظت انگیز واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

(یکم رمئی ر۱۹۹۸ء)

اسوۂ حسنین رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ اللہ کی جانب سے مصطفیٰ اور مجتبیٰ یعنی چنے ہوئے تھے، اللہ نے نبوت کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا تھا، جیسے اللہ نے آپ کو نبوت جیسی عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، اسی طرح آپ ﷺ کی رفاقت اور صحبت کے لئے بھی انسانیت کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص کا انتخاب ہوا، اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کی صحابیت کے لئے منتخب فرمایا ہے،'' **اختارهم الله لصحبة نبيه** ، اسی طرح اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کے اہل بیت اور پاک بیویاں بھی سرد و گرم کی رفاقت اور امت کے لئے خانگی اور نجی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے منتخب تھے۔ ان ہی اہلِ بیت میں آپ ﷺ کی صاحبزادیاں تھی، اور ان صاحبزادیوں میں آپ کی چہیتی اور چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے خواتین جنت کی سردار قرار دیا، اور جن کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی گواہی ہے کہ آپ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہؓ سے تھی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں حضور سے بہت زیادہ مشابہ تھیں اور آپ پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا کہ عہدِ صحابہ میں بھی شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔

حضرت فاطمہؓ کے شوہر چوتھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ جو حضور ﷺ سے نسبی اعتبار سے قریب ترین تعلق رکھنے کے علاوہ اسلام میں سبقت سے مشرف تھے، اور حضور ﷺ کی نگاہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں جس کا دوست ہوں، علی اس کے دوست ہیں، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق اور محبت کو آپ نے اپنی محبت کا معیار بنایا، اہل سنت والجماعت کے معتبر علماء کا اس

بات پر اجماع ہے کہ حضرت عثمان ﷺ اور حضرت علی ﷺ کے عہد میں کچھ یہودیوں کی سازش سے جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، اس میں حضرت علی ﷺ حق پر تھے، چنانچہ حضرت علی ﷺ کے مخالفین کو حدیث میں ''فئۃ باغیۃ'' (باغی گروہ) قرار دیا گیا، حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت حسن ﷺ اور حضرت حسین ﷺ پیدا ہوئے، جو باحیات رہے، اور ان ہی دونوں حضرات سے رسول اللہ ﷺ کی مبارک نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

حضرت حسن ﷺ اور حضرت حسین ﷺ کو رسول اللہ نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا، یہ روایت اہل سنت کے یہاں کثرت سے منقول ہے رسول اللہ ﷺ ان دونوں کو پکڑتے، اور کہتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت کیجئے (بخاری: حدیث نمبر، ۳۷۴۷) ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو مجھ سے محبت ہوگی، وہ ان دونوں سے محبت رکھے گا۔ (مجمع الزوائد، عن ابی ہریرۃ: ۱۸۰/۹) عجیب بات ہے کہ حضرت حسن ﷺ اور حضرت حسین ﷺ کو جسمانی طور سے بھی رسول پاک ﷺ سے بڑی مماثلت تھی، چنانچہ جب حضرت حسین ﷺ کی شہادت ہوئی تو صحابہؓ اور صالحین کو ناقابل بیان صدمہ پہونچا، حضرت ام سلمہؓ کو جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع پہونچی، تو اہل عراق پر لعنت بھیجی، اور ان کے لئے ہلاکت کی دعاء فرمائی، (مجمع الزوائد: ۱۹۴/۹) امام ابراہیم نخعی نے خوب فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں قاتلان حسین میں سے ہوتا اور میری مغفرت کر دی جاتی، نیز میں جنت میں داخل کیا جاتا تب بھی مجھے حضور ﷺ کا سامنا کرنے سے شرم محسوس ہوتی۔ (حوالہ سابق: ۱۹۵/۹)

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بیت سے محبت کے بغیر کوئی ایسا شخص رہ ہی نہیں سکتا، جو واقعی مسلمان ہو۔ اور جس کو رسول اللہ ﷺ سے محبت کا کوئی درجہ حاصل ہو، صحابہؓ چوں کہ سب سے زیادہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے اور آپ کی نسبت پر وارفتہ تھے، اس لئے اہلِ بیت سے ان کو خاص تعلق تھا، بنی امیہ کا حکمراں مروان ایک بار

حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے کہنے لگا کہ جب سے ہمیں آپ کی رفاقت حاصل ہوئی ہے، مجھے آپ کی کسی بات سے ناگواری نہیں، سوائے اس سے کہ آپ حسن وحسینؓ سے محبت رکھتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ ﷛ سمٹ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم لوگ حضور کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، ایک جگہ حضور نے حضرات حسنین ﷛ کے رونے کی آواز سنی، حضرت فاطمہؓ بھی ساتھ تھیں، آپ تیز تیز چل کر وہاں پہونچے، اور فرمایا کہ ہمارے بیٹوں کو کیا ہوا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا کہ یہ پیاسے ہیں، آپ ﷺ نے اپنے مشکیزے میں دیکھا تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا، پھر آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سفر سے پانی کے بارے میں فرمایا تمام ہی لوگ پانی کے برتن کی طرف لپکے، لیکن اتفاق کہ کسی کے پاس پانی موجود نہیں، تو آپ ﷺ نے باری باری حضرت حسن ﷛ اور حضرت حسین ﷛ کو اپنی زبان مبارک کو چسایا، جب انہیں سکون ہوا، تو آپ ﷺ کو اطمینان ہوا، حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے فرمایا کہ اسی لئے میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں۔ (طبرانی بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۹ / ۱۸۰) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ گلشن محمدی ﷺ کے ان غنچہ ہائے سدا بہار اور گل ہائے مشک بار سے کیسی محبت رکھتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کا خوف بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہوتا تھا۔

لیکن کیا حضرات حسنین سے امت کی یہ محبت اور دربار رسالت مآب میں ان کا یہ درجۂ ومقام صرف اسی وجہ سے تھا کہ یہ حضور ﷺ کے نواسے تھے؟____ یقیناً یہ نسبت بھی اس محبت میں کارفرما ہے، لیکن اس سے بڑھ کر حضرات حسنین کا اسوہ اور ان کا کردار ہے، جو قیامت تک کے لئے نقش لافانی ہے، حضرت ابو بکر ﷛ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ منبر اقدس پر تھے، اور آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت حسن ﷛ تھے، آپ ایک دفعہ لوگوں کی طرف دیکھتے، اور ایک دفعہ حضرت حسن ﷛ کی طرف، اور ارشاد فرماتے، میرا یہ بیٹا سید (سردار امت) ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے۔

(بخاری: حدیث نمبر: ۳۷۴۶)

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہلِ شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں آگے بڑھے، اور ادھر اہلِ حجاز اور اہلِ عراق حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، عام طور پر صحابہؓ اور اکابر تابعین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کے موقف کے مؤید تھے، اور بقول حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پہاڑوں کی طرح لشکرِ جرار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رکاب میں تھا، اور یہ ایسے جان نثار لوگ تھے، کہ بہ ظاہر ان کا پشت دکھا کر بھاگنا ہرگز متوقع نہیں تھا، بہ ظاہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غالب آنے کی توقع زیادہ تھی، لیکن جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کی پیشکش ہوئی، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بہت سے رفقاء کی مخالفت بلکہ ایک گونہ طعن و تشنیع کے باوجود اس پر لبیک کہا، اور اپنا ہاتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا، تاکہ مسلمانوں کی خونریزی نہ ہو، اور اسلامی دنیا ایک جھنڈے کے نیچے آجائے، اس طرح وہ پیشین گوئی شرمندۂ تعبیر ہوئی جسے رسول اللہ ﷺ نے آپ کے سلسلہ میں فرمائی تھی، یہ کچھ معمولی قربانی نہیں تھی، اور اس قربانی نے اسلام کی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ایسی عظمت عطاء کی، کہ اگر وہ پورے عالم اسلام کے متفق علیہ تاج ور بن جاتے، تب بھی شاید ان کو یہ مقام حاصل نہ ہوا ہوتا، اور لوگوں کے قلوب پر ان کی حکمرانی قائم نہ ہوئی ہوتی۔

چنانچہ ایک بار پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے آگیا، اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مسلمان فاتحانہ پیش قدمی کرنے لگے، اس سے کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کر سکتا کہ اس میں بنو امیہ رضی اللہ عنہ کے تدبر سے زیادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ایثار کا حصہ ہے!

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید بن معاویہ کے مقابلہ کھڑا ہونا اس لئے نہیں تھا کہ آپ حکومت کی حرص و طمع رکھتے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خانوادۂ نبوی سے نسبت کا

جو شرف حاصل تھا، اس پر ہزار حکومتیں قربان اور نچھاور تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ اسلام جس دور میں آیا، وہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا دور تھا، اس وقت کی معلوم دنیا میں جہاں بھی چھوٹی بڑی حکومت تھی، ان کی اساس خاندانی بادشاہت پر تھی، اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح کی، وہیں نظام سیاست کی بھی اصلاح کی، اور خلافت کا تصور دیا۔

خلافت میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس منصب کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے، جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہو، دوسرے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے اس کا انتخاب کیا ہو، اسی اصول پر حضرت ابوبکر ؓ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابوبکر ؓ نے اکابر صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر ؓ کو نامزد فرمایا۔ حضرت عمر ؓ نے چھ رکنی کمیٹی بنادی، اور ان حضرات نے عام مسلمانوں سے مشورہ اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعہ حضرت عثمان ؓ کا انتخاب کیا، پھر حضرت عثمان ؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل مدینہ اور اکابر صحابہؓ نے بہ اصرار حضرت علی ؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی ؓ سے جن صحابہ کو اختلاف تھا، وہ حضرت عثمان ؓ کے قصاص کے بارے میں تھا، ورنہ ان کی لیاقت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں تھا، اور اس لئے علماء اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ حضرت علی ؓ کی شہادت تک وہی خلیفۂ برحق تھے، حضرت حسن ؓ نے بھی آپ اپنی خلافت کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ اس عہد کے اکابر صحابہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جس تیس سالہ خلافت راشدہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ حضرت حسن ؓ کے چھ ماہی عہد خلافت پر مکمل ہو جاتی ہے۔

یزید کی حکمرانی سے ایک نئے طریقہ کا آغاز ہوا، کہ بعض ایسے لوگ جو اس سلسلہ میں اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے، اور ان کو براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل نہیں تھی، انہوں نے حضرت معاویہ ؓ کو باور کرایا کہ آئندہ کے لئے یزید کو خلیفہ نامزد کر دیا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ،

حضرت عبد اللہ بن عباس ﷛ اور اکابر صحابہؓ جو اس وقت موجود تھے، ان کو حکمرانی کے اس نئے طریقہ سے اس قدر اختلاف تھا، جتنا حضرت حسین ﷛ کو، لیکن بعض صحابہؓ نے فتنہ کے اندیشہ سے خاموشی اختیار کی، اور بعض نے امت کو اختلاف سے بچانے کے لئے بہ کراہت خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اب اگر تمام صحابہؓ اس صورت حال پر یہی رویہ اختیار کرتے اور کسی کی طرف سے مزاحمت پیش نہ آتی، تو آئندہ یہ بات سمجھی جاتی کہ اسلام میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ ساتھ عہدِ جاہلیت کی مروجہ ملوکیت کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ حضرت حسین ﷛ نے اس کی مزاحمت کو ضروری سمجھا، یہاں تک کہ اپنے رفقاء اور اہلِ خاندان کے ساتھ نہایت ہی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے، اور قاتلانِ حسین نے جہاں آخرت میں اپنے لئے اللہ کے عذاب اور ابدی خسران کو محفوظ کر لیا وہیں دنیا میں بھی قیامت تک کے لئے اہلِ ایمان کی نگاہ میں ملعون ومغضوب قرار پائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت حسین ﷛ کی یہ مہم بہ ظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی، لیکن حضرت حسین ﷛ کو معنوی فتح حاصل ہوئی، چنانچہ امت کے علماء وفقہاء اور اربابِ نظر آج اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام جس نظام حکمرانی کا داعی ہے، وہ خلافت ہے نہ کہ خاندانی بادشاہت، حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی بادشاہت کا ہے، لیکن اس کے باوجود آج اسے اسلامی فکر کے خلاف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور کیوں اس رویہ کو قبول نہیں کیا گیا؟ یقیناً اس میں بڑا حصہ حضرت حسین ﷛ اور آپ کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیر ﷛ کی مزاحمت اور اسی راہ میں شہادت کا ہے۔ ورنہ بعد کے لوگ سمجھتے کہ اس مدت پر مسلمانوں کا اجماع واتفاق ہو چکا ہے۔

پس حضرت حسن ﷛ کا اسوہ یہ ہے کہ امت کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی قربانی گوارا کیا جائے، اور ایثار سے کام لیا جائے، اور حضرت حسین ﷛ کا اسوہ یہ ہے کہ جب دین میں کوئی طاقت کمی بیشی کرنا چاہے اور

اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے درپے ہو تو چاہے اس کے لئے اپنی رگِ گلو کٹانی پڑے لیکن بہتر قیمت اللہ کے دین اور شریعت کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے، آج کے حالات میں یہ دونوں نمونے امت کے لئے مشعل راہ ہیں، امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے عہدہ و جاہ کا ایثار، اور دین کی حفاظت و صیانت کے لئے اپنی جان عزیز تک کی قربانی!!

(۶/اپریل/۲۰۰۱ء)

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

انسانی معاشرے میں کچھ لوگوں کا دولت منداور کچھ کا غریب ضرورت مند ہونا نظامِ قدرت اور تقاضۂ فطرت ہے، اس لئے ہر سماج کی ضرورت ہے کہ اس کے خوش حال اور اصحاب کشائش اپنے ضرورت منداور غریب بھائیوں کی مدداور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی دولت کا کچھ حصہ اسی مقصد کے لئے نکالیں، اسی لئے پہلے آسمانی مذاہب میں بھی زکوٰۃ وصدقات کا حکم فرمایا گیا، قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے اہل وعیال کوزکوٰۃ دینے کاحکم فرمایا کرتے تھے، كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم:۵۵) بنی اسرائیل سے خدانے جن باتوں کا عہد لیا تھا ان میں نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی تھا، (بقرہ:۳) حضرت مسیح نے بھی اعلان فرمایا کہ مجھے زندگی بھر اقامتِ صلوٰۃ اور اداءِ زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی ہے وَاَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا (مریم:۳۱)

ہر چند کہ بائبل میں انسانی ہاتھوں اور دماغوں نے بہت کچھ تحریف کی ہے، لیکن اب بھی اس میں کہیں مبہم اور کہیں واضح ہدایت صدقہ وانفاق کی ملتی ہے، تورات غلہ اور جانور دونوں میں دسواں حصہ واجب قرار دیتا ہے:

> اور زمین کی پیداوار کی مساوی دہ یکی (دسویں حصہ) خواہ وہ زمین کے بیج کی یا درخت کے پھل کی ہو، خداوند کی ہے، اور خداوند کے لئے پاک ہے، اور گائے، بیل اور بھیڑ، بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گذرتا ہو، ان کی دہ یکی یعنی دس پیچھے ایک ایک جانور خداوند کے لئے پاک ٹھہرے۔ (احبار:۲۷،۳۰x۳)

فی کس آدھا مثقال اس کے علاوہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئیں

ان میں ایک یہ بھی تھی کہ :

دولت مند نیم مثقال سے زیادہ نہ دے اور نہ غریب اس سے کم دے (خروج ۱۵/۳۰) دوسرے مذاہب میں بھی نذر، قربانی اور دان کا تصور موجود ہے، غرض انسانی خدمت غریبوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت برآئی مذاہب عالم اور انسانی فطرت سلیمہ کا ایک مشترک ورثہ ہے، جسے اسلام نے نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اس کو خدا کی بندگی کا ہم درجہ بنا دیا اور اس کی اہمیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو اس کا ایک مرتب نظام عطا فرمایا۔

اسلامی تعلیمات کا اولین اور مستند ترین سرچشمہ قرآن مجید ہے، قرآن مجید نے زکوٰۃ کو جو اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے بیس مقامات پر زکوٰۃ کو اسلام کے رُکن اوّل نماز کے دوش بدوش ذکر کیا ہے، بتیس مقامات پر صریحاً زکوٰۃ کا اور پندرہ مقامات پر صدقہ کا ذکر آیا ہے، مختلف سیاق میں رحمتِ خداوندی کا حق دار ہونے کے لئے ایمان وتقویٰ کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بھی شرط قرار دیا گیا (اعراف :۱۶۵) اور فرمایا گیا کہ زکوٰۃ تمہارے مال میں کمی کا سبب نہیں بلکہ برکت و اضافہ کا باعث ہے، وَمَا اٰتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: ۳۹) آخرت میں اس کا جو ثواب ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے :

> اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال اس بوئے گئے دانے کی ہے، جس میں سات بالیاں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں، دو چند کر دیتے ہیں، اور وہ وسعت والے اور علم والے ہیں (البقرہ:۲۶۱)

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہ کریں اور غریبوں کے اس حق سے پہلو تہی برتیں، ان کے لئے اسی درجہ عبرتناک سزا ہے۔

> جس دن سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر

اس سے پیشانیاں، پہلو اور پشت داغے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ
یہی مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، اب اس مال کا مزا چکھو۔

(توبہ:۳۵)

کہیں فرمایا گیا کہ اس مال کا طوق عذاب بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا (آل عمران:۱۸) واقعہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں نماز کے بعد جس تاکید و اہتمام اور کثرت و تکرار کے ساتھ قرآن مجید نے زکوٰۃ وصدقات، انفاق، انسان کی مدد، یتیموں اور حاجت مندی کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کیا ہے، کسی اور عمل پر اس اہمیت کے ساتھ زور نہیں دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کو ارکان اسلام میں نماز کے بعد درجہ دیا ہے اور بعض اوقات آپ ﷺ نے جن باتوں پر بیعت لی ان میں زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمادیا (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ۱/۱۸۸) آخرت میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر آپ ﷺ کی جو وعیدیں ہیں، وہ نہایت لرزا دینے والی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہوگی وہ زہریلے سانپ کی صورت اختیار کر کے گلے کا طوق بن جائے گا اور ڈستا رہے گا (بخاری: باب اثم مانع الزکوٰۃ) —— جن جانوروں کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہوگی وہ اس کے جسم کو روندیں گے (حوالہ سابق)، دو خواتین خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی زکوٰۃ ادا کر دی ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم کو یہ پسند ہے کہ آگ کے کنگن تم کو پہنائے جائیں؟ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی (ترمذی:۱/۱۳۸، باب ما جاء فی زکوٰۃ الحلی)

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے دنیا میں بھی زکوٰۃ ادا کرنے پر خوش خبری اور نہ ادا کرنے پر اللہ کی پکڑ کا ذکر فرمایا ہے، فرمایا کہ صدقہ سوء خاتمہ سے بچاتا ہے، (ترمذی:۱/۱۴۴) عمر میں اضافہ کرتا ہے (الترغیب والترہیب ۱/۱۶۱) ستر مصیبتوں کے دروازے بند کرتا ہے (حوالہ سابق) بلائیں صدقہ کی وجہ سے نہیں آتی ہیں **فان البلاء لا یتخطاھا** (مشکوٰۃ المصابیح:۱/۱۶۷) جس مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے، تو مال زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اصل مال بھی

ہلاک وضائع ہو جاتا ہے (مشکوٰۃ: کتاب الزکوٰۃ) جو قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی، اس پر اللہ کی طرف سے قحط کا عذاب آتا ہے (الترغیب والترہیب) دنیا میں انسان کی بداعمالیوں کا اس پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟، حضرت ابن عمر ﷛ نے اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی اثر انگیز روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے جماعت مہاجرین! پانچ گناہ ہیں کہ جب تم ان میں مبتلاء ہو جاؤ گے، (مصیبتوں میں پڑو گے) اور میں اس بات سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، کہ تم ان گناہوں میں مبتلا ہو، جس قوم میں کھلے عام بدکاریاں ہونے لگیں، ان میں طاعون اور ایسی تکلیف دہ بیماریاں پیدا ہوں گی، جو پہلے کے لوگوں میں نہیں ہوئی، ناپ تول میں کمی کریں گے تو قحط، تنگ حالی اور حکمرانوں کا جور و ظلم ان پر ہوگا، جو زکوٰۃ ادا نہ کریں گے بارش سے محروم کر دیئے جائیں گے، اور (اس بستی میں) جانور نہ ہوں تو شاید ان پر بالکل ہی بارش نہ ہو، خدا اور رسول کے پیمان کو توڑیں گے، تو دشمنوں کو جو کفار ہوں گے ان پر مسلط کر دے گا، اور وہ ان کے قبضہ سے بعض چیزیں چھین لیں گے، اور مسلمانوں کے جو حکمراں قرآن مجید کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے، اور احکامِ الٰہی کو ترجیح نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی قوت کو باہم ہی ٹکرا دے گا۔

(ابن ماجہ عن ابن عمر، ۲/۲۹۰، باب العقوبات)

غور کیا جائے تو آج اس حدیث کی تصدیق چشم سر سے دیکھی جا سکتی ہے، اقوام مغرب میں بدکاریاں، ایسے امراض کا وجود کہ جن سے کان و دل یکسر ناآشنا تھے، حکمرانوں کا ظلم و جور، قحط و خشک سالی، مسلمانوں پر ان کے دشمنوں کا غلبہ و تسلط اور باہم آویزشیں، یہ ساری حقیقتیں دوپہر کی دھوپ کی طرح سامنے ہیں!۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگ حالی اور درماندگی کا ایک اہم سبب اس امت کا فریضۂ زکوٰۃ سے غفلت و

بے اعتنائی ہے۔

غور کیجئے تو مذاہب کی تعلیم کا خلاصہ اللہ سے تعلق اور محبت ہے، راہبوں کی رہبانیت اور گھٹنوں کے بل قیام، مندروں میں بتوں کے سامنے سجود و نیاز، آتش کدوں میں آتش اعتقاد کو سلگانا اور مسلسل روشن رکھنا، ان سب کا اپنے اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق خدا سے تعلق کے اظہار کے سوا اور کیا ہے؟ اسلام نے اس مقصد کے لئے نماز کا نہایت پاکیزہ اور اثر انگیز عمل رکھا، جس میں زبان اور آنکھیں ہاتھ اور پاؤں اور جسم کا ایک ایک حصہ خدا کی بارگاہ میں حاضر اور متوجہ رہتا ہے، عجز و فروتنی کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی تک خاک پر رکھ دیتا ہے۔

لیکن تعلق مع اللہ اسی وقت اوج کمال کو پہونچ سکتا ہے، جب کہ غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو، دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے، وہ مال و دولت ہے، اس کی حرص اوّل خدا سے بے توجہ کرتی ہے، پھر دولت وثروت کا نشہ دل و دماغ پر چڑھتا ہے، اور کبر و غرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی ''کبر'' دین واخلاق کے لئے سم قاتل ہے، اس سے خودغرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، لوگوں کے حقوق کو وہ ڈھکوسلہ سمجھنے لگتا ہے، اپنی دولت کے لئے خود اپنے قوت بازو کا ثمر ہونے کا خیال جڑ پکڑتا ہے۔

''زکوۃ'' اسی مال کی محبت کو کم کرتا ہے، ''نماز'' خدا سے تعلق کا سامان تھا، اور ''زکوۃ'' غیر اللہ سے بے تعلقی کا عنوان ہے، اسی کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے، اس سے تواضع کا اظہار ہوتا ہے، ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، زکوۃ کا عمل بندہ کے اس یقین کو ظاہر کرتا ہے، کہ جو کچھ ہے، خدا کا عطیہ ہے، اس میں خود اس کی قوت وقدرت کو دخل نہیں، یہ اس بات کا اقرار ہے کہ خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر وہ دولت دنیا کو قربان کرنے کے لئے تیار ہے، یہ ایمان کی تازگی ہے، دولت و دنیا کی تطہیر ہے عقیدہ اور باطن کی صفائی ہے اور اعمال کی پاکی ہے، اس لئے اس کا نام ہی ''زکوۃ'' رکھا گیا، جس کے معنی ہی پاکی کے ہیں، قرآن نے زکوۃ میں پائے جانے والی تربیت اخلاق اور تزکیہ باطن کی خاص

صلاحیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطهرهم (توبہ: ۱۰۳) ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے، اس کے ذریعہ آپ انہیں پاک وصاف کردیں گے۔

یہ تو زکوٰۃ کا اخلاقی اور روحانی پہلو ہے، اس کے مادی اور معاشی فوائد ظاہر ہیں، کوئی بھی سماج دولت مند اور غریب طبقہ سے خالی نہیں ہوسکتا، زکوٰۃ سماج کے غریب طبقہ کو تحفظ وضمانت عطا کرتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر تمام لوگ زکوٰۃ ادا کریں تو کسی کو غذا اور لباس سے محروم ہونا نہ پڑے۔

> اللہ نے اہلِ دولت پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے، وہ اتنی مقدار ہے کہ فقراء کے لئے کافی ہو جائے، اگر یہ بھوکے، بے لباس اور پریشان رہیں تو یہ اغنیاء کے فریضۂ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کا محاسبہ کریں اور ان کو اس پر عذاب دیں۔

یقین ہے کہ اگر دولت کے اعتبار سے تین درجات کئے جائیں، ایک وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے، دوسرے وہ جو زکوٰۃ کے حقدار ہیں، پھر ان لوگوں کی دولت اور اس کی شرح زکوٰۃ کا حساب کیا جائے جن پر زکوٰۃ واجب ہے، اور ان لوگوں کی غربت کو ملحوظ رکھ کر ان کی ضروریات کا حساب لگایا جائے، تو ضرور زکوٰۃ تمام غرباء کی ضرورت پوری کردے گی، کاش اعداد وشمار کی مدد سے اس کی تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ایمان وعقیدہ کی آنکھوں سے نہیں بلکہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جاسکے گی۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا خود اہلِ ثروت کو یہ فائدہ ہوگا کہ غرباء طبقہ۔ جس کی محبت اور جفا کشی ہی ہر چراغ عیش میں شعلہ زن ہے اور جن کے دم سے ہی عشرت کدۂ حیات کی ساری بہار قائم ہے۔ میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے اور وہ ان کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھیں گے، مغربی سرمایہ داری میں زکوٰۃ کے لئے تو کیا جگہ ہوتی؟ سود

نے غرباء اور مزدوروں کی کمر توڑ رکھی ہے، یہ سود اس محتاج و محنت کش طبقہ میں اہلِ دولت کے خلاف مخالف جذبات کو جنم دیتا ہے، اور بھڑکاتا ہے، کمیونسٹ تحریک اسی ردِ عمل میں پیدا ہوئی، اسلام نے زکوۃ کے ذریعہ اس کا علاج کیا ہے، اور دولت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲۲؍ نومبر ۲۰۰۲)

اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

حضرت عمرؓ صرف خلیفہ اور فرماں روا ہی نہ تھے، بلکہ ایک مشفق، مربی اور مزاج شناس مصلح بھی تھے اور اسی نسبت سے وقتاً فوقتاً اپنے رفقاء کا امتحان بھی لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ مالک الداری سے مروی ہے کہ ایک بار چار سو دینار لیا، اسے ایک تھیلی میں رکھا اور ایک لڑکے سے کہا کہ اسے ابوعبیدہ ابن جراحؓ کو لے جا کر دے دو، دینار حوالہ کرنے کے بعد تھوڑی دیر گھر میں ٹھہرنا اور دیکھنا کے وہ کیا کرتے ہیں، لڑکا گیا اور اس نے کہا کہ امیر المومنین کہتے ہیں کہ اسے اپنی بعض ضروریات میں خرچ کر لیجئے، چار سو دینار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی، بیس دینار سونا ساڑھے سات تولے کے برابر ہوتا ہے، حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کے حق میں کچھ دعائیہ کلمات کہے، پھر باندی کو آواز دی اور فرمایا کہ یہ سات دینار فلاں کو پہونچا دو، یہ پانچ فلاں کو اور یہ پانچ فلاں کو، اس طرح اسی مجلس میں پائی پائی تقسیم کر دیا، وہ لڑکا حضرت عمرؓ کے پاس واپس آیا اور پورا واقعہ ان سے نقل کیا، حضرت عمرؓ نے چار سو دینار کی ایک اور تھیلی تیار کی اور کہا کہ اسے معاذ بن جبلؓ کے پاس لے جاؤ، وہاں بھی تھوڑی دیر رک کر دیکھنا کہ حضرت معاذؓ کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ لڑکے نے ان کے پاس بھی تھیلی پہنچائی اور کہا کہ امیر المومنین نے فرمایا ہے کہ اسے اپنی ضروریات میں خرچ کریں، انہوں نے بھی حضرت عمرؓ کے لئے دعا کے کلمات کہے، پھر ایک لڑکی کو بلایا اور تقسیم شروع کی، فلاں کے گھر اتنا پہنچا دو اور فلاں کے گھر اتنا، جب دینار ختم ہونے کے قریب آئے تو حضرت معاذؓ کی بیوی نے جھانک کر دیکھا اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم لوگ بھی مسکین ومحتاج ہیں، کچھ تو ہمیں بھی عطا فرمایئے، نحن واللہ مساکین فاعطنا، تھیلی میں صرف دو دینار رہ گئے تھے، حضرت معاذؓ نے ان کی طرف پھینک دیا، قاصد حضرت عمرؓ کے پاس واپس آیا اور آنکھوں

دیکھا حال سنایا، حضرت عمر ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ سب بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے مزاج پر ہیں۔" انهم اخوة بعضهم من بعض " (مجمع الزوائد: ۳/۱۲۵)

اسی طرح کا ایک امتحان حضرت عمر ﷺ نے اپنے ایک اور معتمد رفیق حضرت سعید بن عامر ﷺ کے بارے میں کیا۔ حضرت عمر ﷺ کو اطلاع ملی کہ وہ اپنے گھر میں کچھ جمع کر کے نہیں رکھتے، حضرت عمر ﷺ نے ان کے لئے دس ہزار بھیجے، سعید بن عامر ﷺ کے پاس جوں ہی رقم پہنچی اس رقم کی مختلف تھیلیاں بنا کر مختلف لوگوں کے پاس پہنچانے لگے، شریکۂ حیات نے پوچھا کہ یہ کہاں لے جا رہے ہو؟ فرمایا: اس کے پاس جو ہمیں اس کا نفع دے، چنانچہ اس طرح پورے پیسے تقسیم کر دیئے، تھوڑی سی رقم بیوی بچوں کے لئے بچادی، جب یہ معمولی رقم گھر کے خرچ میں کام آ گئی تو بیوی نے عرض کیا کہ جن لوگوں کے پاس نفع کے لئے رقم رکھی ہے ان کے پاس جائیں اور کچھ نفع اس کا وصول کر کے لائیں کہ گھر چلے، وہ ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، یہاں تک کہ جب زیادہ عرصہ بیت گیا اور بیوی کا مطالبہ جاری رہا، تب جا کر حضرت سعید بن عامر ﷺ نے ظاہر کیا کہ نفع دینے والے سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات تھی، جو آخرت میں بے پناہ نفع کے ساتھ اصل واپس فرمائے گا۔ (حوالۂ سابق)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور رفقاء میں انفاق کا کیسا بھر پور جذبہ تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں لٹا کر کس قدر خوش ہوتے تھے؟ اور یہ نتیجہ تھا پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی تربیت کا، خود آپ کو اس سے زیادہ کوئی چیز گراں نہ ہوتی تھی کہ آپ کے پاس پیسے جمع ہوں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ ﷺ رفقاء کے درمیان تشریف لائے، ہاتھ میں سونے کا ایک ٹکڑا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اگر محمد (ﷺ) کا انتقال ہو جائے اور اس کے پاس یہ موجود ہو تو وہ اپنے رب سے کیا کہے گا؟ پھر آپ ﷺ نے اس مجلس سے کھڑے ہونے سے پہلے اسے تقسیم فرما دیا اور اُحد پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات سے خوشی نہیں ہوگی کہ محمد (ﷺ) کے صحابہ کو اس پہاڑ کے برابر سونا اور چاندی ہوں، وہ اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کریں اور اس میں سے ایک دینار بھی نہ بچا رکھیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ نے ایک دینار یا درہم یا غلام اور باندی کچھ بھی نہیں چھوڑا، بلکہ آپ ﷺ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تیس صاع (ایک کوئنٹل سے اوپر) جو کے بدلہ میں رہن تھی، اسی جو سے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے اہل وعیال کے کھانے کی ضرورت پوری ہورہی تھی۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی: ۱۲۳/۴)

جب وفات کا وقت آیا تو سات دینار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ سونا علی کے پاس بھیج دو، آپ ﷺ کی بے ہوشی کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مشغول ہوگئیں، یہی بات بار بار پیش آتی رہی، آپ ﷺ کو ہوش آتا، آپ ﷺ دینار حضرت علی ﷺ کو بھیجنے کا حکم دیتے، پھر بے ہوشی طاری ہوجاتی، حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی دیکھ بھال میں لگ جاتیں، آخر حضرت عائشہؓ نے دینار بھجوا دیئے اور حضرت علی ﷺ نے اسے صدقہ کردیا۔ جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس دن چراغ میں تیل تک میسر نہیں تھا، حضرت عائشہؓ نے اپنے قرابت مندوں میں سے ایک خاتون کے پاس چراغ بھیجا کہ وہ اپنے برتن سے چراغ جلانے کا سامان مہیا کردیں۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی: ۱۲۴/۳) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کے یہاں کیسا انفاق تھا، کائنات آپ کے قدموں میں تھی، لیکن آپ ﷺ ہمیشہ کوشاں رہتے کہ پائے مبارک متاعِ دنیا سے آلودہ نہ ہونے پائے ﷺ۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور غریب انسان کی مدد کرنے کی جو ترغیب دی ہے، کم نیکیاں ہیں جن کی اس قدر آپ ﷺ نے ترغیب دی ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرمایئے اور دوسرا کہتا ہے کہ روک رکھنے والے کو نقصان پہنچایئے۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ ﷺ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ خود فرماتے ہیں: اے بنی آدم! خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ ﷺ) ایک بار دریافت کیا گیا کہ کون سا صدقہ اجر میں بڑھا ہوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ تو اس وقت صدقہ کرے جب صحت مند ہو، یعنی موت کے قریب نہ ہو اور فقر کا اندیشہ باقی ہو، ایسا نہ ہو کہ جب جان حلق تک پہنچ

جائے تو کہو: فلاں کو یہ اور فلاں کو یہ دے دیا جائے۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ) ایک روایت میں ہے کہ جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عبادت گذار سے بہتر ہے۔ (ترمذی عن ابی ہریرۃ ؓ) ایک بار آپ نے ارشاد فرمایا کہ: کیا میں تم کو سب سے بدترین آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ ؓ نے عرض کیا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے اللہ کا واسطہ دے کر مانگا جائے اور وہ پھر بھی نہ دے۔ (مسند احمد عن ابن عباس ؓ)

صدقہ پر نہ صرف آخرت میں ثواب ہے، بلکہ دنیا میں بھی صدقہ کے بڑے فوائد ہیں۔ حضرت علی ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدقہ کرنے میں عجلت کرو، کیوں کہ بلاء صدقہ کو پھلانگ نہیں پاتی۔ (مشکوٰۃ: حدیث نمبر ۱۸۸۷) یعنی صدقہ انسان کو ابتلاء و آزمائش سے بچاتا ہے۔ حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کی آتشِ غضب کو بجھاتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔ (ترمذی: باب ماجاء فی فضل الصدقۃ) حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے تو جب تک اس پر کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہے وہ اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ (ترمذی: عن ابن عباس، مشکوٰۃ: حدیث نمبر ۱۱۹۰)

یہ تو صدقہ کا عمومی اجر و ثواب ہے، لیکن رمضان المبارک میں صدقہ اور انفاق کا ثواب کئی چند ہو جاتا ہے۔ رمضان جہاں صبر اور ضبط نفس کا مہینہ ہے وہیں انسان کے ساتھ غم خواری اور حسن سلوک کا بھی مہینہ ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ یوں تو ہمیشہ صدقہ فرماتے تھے، لیکن رمضان المبارک کے مہینہ میں اس میں نمایاں طور پر اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے وقت کی نیکیوں کے اس موسم بہار سے فائدہ اٹھایا جائے اور آخرت کے خزانہ کو بھرا جائے۔ بقول مولانا حسام الدین فاضل ؎

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کو بھر لینا
ادھر دیا کہ اُدھر داخل خزانہ ہوا

(۲۱ رنومبر ۲۰۰۲ء)

بادشاہی میں فقیری

''حمص'' شام کا ایک شہر ہے، ایک زمانہ میں یہی شام کا پایۂ تخت تھا، عہدِ فاروقی میں گورنر شام یہیں قیام کرتے تھے۔ حمص سے ایک وفد خدمتِ فاروقی میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی مملکت کے غرباء اور حاجت مندوں کا بڑا پاس تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے واردین سے فرمایا کہ وہاں کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند لوگوں کی ایک فہرست بنائیں کہ میں ان کی کچھ مدد کر سکوں، فہرست بنی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا اس میں ایک نام ''سعید بن عامر'' بھی ہے۔ حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، جن کو آپ رضی اللہ عنہ نے شام کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اس نام پر پہنچے تو اچنبھا ہوا، خیال ہوا کہ شاید کوئی اور سعید ہوں۔ دریافت فرمایا یہ سعید بن عامر کون ہیں؟ عرض کیا گیا: ہمارے امیر و گورنر! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو تمہارے گورنر فقیر و محتاج ہیں؟ کہا گیا: بیشک، ایسے محتاج کہ مدتوں گھر میں چولھا سلگنے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلطانی میں اس درویشی کو دیکھ کر گریہ طاری ہو گیا، آنسوؤں نے آنکھوں ہی کو نہیں، داڑھیوں کو بھی تر کر دیا۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے تھیلی میں ایک ہزار دینار رکھے (جو ایک بہت بڑی رقم تھی) وفد کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو میرا سلام کہنا اور یہ تھیلی دے دینا اور بتادینا کہ یہ آپ کی ضرورت کے لئے بھیجے ہیں۔ تھیلی جب حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو آپ اسے قریب سے ہٹانے لگے اور بے ساختہ زبان سے نکلا ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' گویا کوئی مصیبت آپڑی ہو یا کوئی تکلیف دہ خبر آئی ہو۔ اہلیہ گھبرائی ہوئی آئیں: کیا امیر المومنین کا انتقال ہو گیا؟ فرمایا: اس سے بھی بڑھ کر۔ کہنے لگیں: کیا مسلمان کسی آفت اور ابتلاء میں

پڑ گئے ہیں؟ ارشاد ہوا: اس سے بھی بڑی بات پیش آئی ہے۔ اہلیہ نے بے قراری سے پوچھا: آخر کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ فرمایا: میرے پاس دنیا آ پہنچی ہے کہ میری آخرت کو خراب کر دے اور فتنہ نے میرے گھر میں قدم رکھ دیا ہے۔ اہلیہ اب تک صحیح صورتِ حال سے واقف نہیں تھی، کہنے لگیں، پھر تو اس سے نجات پانے کی کوشش کریں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے گفتگو کے اس مرحلہ کو غنیمت جانا اور دریافت فرمایا کہ کیا تم اس میں میرا تعاون کرو گی؟ بیوی نے تعاون کا یقین دلایا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اسی وقت یہ پورے دینار مختلف تھیلیوں میں رکھے اور ضرورت مندوں کو روانہ کر دیا۔

اس واقعہ پر بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے۔ دارالخلافہ حمص کے لوگ کسی قدر گلہ شکوہ کے عادی تھے، اسی لئے لوگ اس کو ''چھوٹا کوفہ'' کہا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حمص میں فروکش ہوئے تو لوگوں سے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی استفسار فرمایا۔ اہلِ شہر حسب عادت شکایت سے باز نہ رہے اور چار باتوں کی شکایت کی۔ صبح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجلاس منعقد کیا۔ پہلے لوگوں سے شکایات دریافت کیں۔ لوگوں نے کہا کہ سویرے گھر سے نہیں نکلتے، سورج چڑھتے نکلتے ہیں۔ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے جواب طلب کیا۔ فرمایا: میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا، درحقیقت میرے یہاں کوئی خادم نہیں ہے، صبح میں گھر کے کام کاج خود ہی کرتا ہوں، آٹا گوندھتا ہوں، روٹی پکاتا ہوں، پھر وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا کہ گورنر صاحب رات کو کسی سے ملاقات کے روادار نہیں ہوتے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کسی قدر تامل سے جواب دیا: افسوس کہ میں جس بات کے اظہار سے بچنا چاہتا تھا، اسی کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے، پھر فرمایا کہ میں نے دن اور رات کی تقسیم کر رکھی ہے، دن لوگوں کی ضروریات کے لئے، رات اللہ کی عبادت کے لئے۔ کہا گیا کہ مہینہ میں ایک دن تو ایسا گذرتا ہے کہ گھر سے باہر ہی تشریف نہیں لاتے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے کہ امیر المومنین! میرے پاس کوئی خادم نہیں اور کپڑا بھی صرف یہی ایک ہے جو جسم پر ہے، اس لئے ماہ میں ایک دن اسی کو دھوتا ہوں، کپڑے خشک ہونے تک

انتظار کرتا ہوں، یہاں تک کہ دن کے آخری حصہ میں باہر آتا ہوں۔

ایک شکایت یہ بھی کی گئی کہ بعض اوقات درمیانِ مجلس بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور آپ حاضرین سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ حضرت سعید ؓ نے وضاحت فرمایا کہ ایک لرزہ خیز منظر میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے: میں اس وقت ایمان سے محروم تھا اور مکہ میں اس غول میں شامل تھا جو خبیب ؓ کی مظلومانہ شہادت کا گویا ''تماشہ'' دیکھ رہے تھے، دشمن ان کے جسم کا ایک ایک انگ کاٹتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے؟ حضرت خبیب ؓ اس کرب و تکلیف کی حالت میں بھی کہتے جاتے کہ مجھے اتنا بھی گوارا نہیں کہ میں اس سے بچ جاؤں اور اس کے بدلہ آپ ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے، جب بھی میری آنکھوں میں یہ منظر آتا ہے، میں بے قرار ہو جاتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو اس دن اس جاں نثارِ رسول ﷺ کی مدد نہیں کی، شاید اس کی وجہ سے اللہ مجھے معاف نہ کرے اور یہی احساس مجھے ہوش و حواس سے محروم کر دیتا ہے!!

حضرت عمر ؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کا گمان اور انتخاب غلط ثابت نہ ہوا۔ واپس جا کر پھر حضرت سعید ؓ کے لئے ایک ہزار دینار بھیجے۔ بیوی نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اب آپ کی خدمت کی حاجت نہ رہی، اسی سے کوئی خادم خرید کر دیں۔ حضرت سعید ؓ نے استفسار فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتاؤں؟ بیوی نے وضاحت چاہی۔ فرمایا: کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دیں جو انتہائی ضرورت کے وقت ہمیں واپس کرے۔ اہلیہ نے پوچھا: اس کی کیا صورت ہوگی؟ فرمایا: ہم اللہ کو قرض حسنہ دیدیں!! بیوی بھی آخر حضرت سعید ؓ ہی کی تھیں، شوہر کی تجویز کو بہ خوشی قبول کیا۔ مجلس ختم بھی نہ ہوئی، کہ جلدی جلدی حضرت سعید ؓ نے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں دینار بھرے، یہ فلاں خاتون کے لئے، یہ فلاں مرحوم کے یتیم بچوں کے لئے، وہ فلاں فلاں غرباء کے لئے اور وہ چند لمحوں میں تھیلی بھی خالی ہوگئی اور حضرت سعید ؓ کے قناعت پسند دل کو بھی قرار آ گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کا ایک بدقسمت محسن ہے۔ محسن اس لئے کہ اسی نے

متحدہ ہندوستان کا تصور دیا اور ہندوستان کو ایسی وسعت عطا کی جو نہ اس سے پہلے اسے حاصل تھی اور نہ اس کے بعد پھر حاصل ہو سکی اور ''بدقسمت'' اس لئے کہ چند منصف مزاج مؤرخین کو چھوڑ کر تاریخ نے اس کے ساتھ ناانصافی اور احسان ناشناسی ہی کو روا رکھا۔ اس محب وطن درویش صفت بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اس نے اپنی آخری وصیت میں ہدایت کی تھی کہ اس کی سلی ہوئی ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپے دو آنے لے لیے جائیں اور اس کے کفن پر خرچ کیے جائیں اور کتابت قرآن میں اس نے جو اجرت حاصل کی تھی، اس میں تین سو پانچ روپے بچ رہے ہیں، جو اس کے ذاتی اخراجات کے بٹوے میں ہیں، یہ اس کی موت کے دن فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ واقعات نہ فرشتوں کی دنیا کے ہیں، نہ عالم بالا کی کسی مخلوق کے، یہ اسی دنیا کے واقعات ہیں اور اسی زمین پر پیش آئے ہیں۔ جب دل کی دنیا بدلتی ہے اور فکر میں انقلاب آتا ہے، تو کردار کی بلندی کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ جو آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو اور خدا کے خوف سے خالی ہو، وہ کردار کی پستی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا، اس سماج میں جو شخص جس قدر اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوگا، اسی قدر خیانت، خود غرض اور اپنے تئیں کوتاہی میں بھی وہ ''ممتاز'' ہوگا، وہ اسکامس اور اسکینڈلس کا جنم داتا ہوگا اور خدا ترسی اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے جس کو حصہ ملا ہوگا، وہ یقیناً اپنی بادشاہی کو بھی فقر و درویش کے تاج سے آراستہ رکھے گا اور اس اختیاری فقیری کی لذت و حلاوت پر متاعِ دنیا کی ساری لذتوں کو قربان کرنا اس کے لئے آسان ہوگا!!

(۷/اپریل ۲۰۰۰ء)

بہترین خطا کار

انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے، یہ نیکیوں پر قادر ہے، لیکن برائیوں سے عاجز نہیں، نہ فرشتہ ہے کہ برائی کا خیال تک دل میں نہ آئے اور نہ شیطان ہے کہ ضلالت وگمراہی سے کبھی دل خالی ہی نہ ہو، اس لئے اسے اس ''امتحان گاہ'' میں رکھا گیا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کی نیکیاں برائیوں پر فتح پاتی ہیں یا برائیاں نیکیوں پر غالب آتی ہیں، انبیاء کے سوا کوئی انسان نہیں جو غلطی اور خطا سے یکسر محفوظ ہو، گویا غلطی انسان کی سرشت میں ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو انسان فرشتہ بن جائے۔ انبیاء کے بعد سب سے کامل انسان وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو انبیاء کی رفاقت اور نصرت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، لیکن اس مقام ومرتبہ کے باوجود بعض اوقات پیغمبروں کے اصحاب سے بھی غلطیاں صادر ہوئی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کو فوراً ہی اپنے گناہ پر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اور اس طرح یہی نہیں کہ ان کی یہ ندامت اس گناہ کی تلافی کا سامان بن جاتی ہے، بلکہ ان کا اس طرح گناہ کرنا اور پھر گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے مطابق پشیمان ہونا بجائے خود امت کے لئے اسوہ قرار پاتا ہے۔

آپ ﷺ نے اسی حقیقت کو اس طرح ارشاد فرمایا کہ ہر ابنِ آدم ضرور ہی خطا کرتا ہے، لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دروازۂ مغفرت پر اپنی ندامت کی پیشانی رکھ دیں اور توبہ کرلیں، خیر الخطائین التوابون مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر خوش ہوتی ہے، اس سے اس کے جذبہ انا کی تسکین ہوتی ہے اور کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات پر رحمت کا غلبہ اور وہ رحمان ورحیم اور غفور وکریم ہے، اسی لئے اسے گنہ گاروں اور کوتاہ کاروں کو معاف کرکے

خوشی ہوتی ہے، انسان انتقام کے لئے بہانے ڈھونڈتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہانوں سے مغفرت کے فیصلے فرماتے ہیں، کسی نے حج کرلیا تو پچھلی پوری زندگی کا گناہ معاف کردیا، عمرہ کرلیا تو ایک عمرہ سے دوسرا عمرہ کے درمیان کے گناہ معاف ہوگئے، بعض روزے ہیں کہ پورے صغیرہ گناہوں کے کفارہ ہیں، نمازیں بھی جسم سے گناہوں کے میل کو صاف کرتی ہیں، صدقات بھی گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ چھوٹے چھوٹے عمل کی بنیاد پر انسان کے گناہ معاف ہوتے جائیں۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو ''عفو'' یعنی بہت معاف کرنے والا قرار دیا ہے، عربی زبان میں ''عفو'' کے اصل معنی مٹانے کے ہیں (القاموس المحیط: ۱۱۸۱) پس ''عفو'' کے معنی مٹا دینے والے کے ہوئے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف کرتے ہیں ان کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں اور شاید نامۂ اعمال سے بھی محو فرما دیتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی شانِ کریمی ہے! انسان کسی کو معاف بھی کردے تو وہ غلطی کو لوحِ قلب سے مٹانے کو تیار نہیں ہوتا، وہ وقتی طور پر جذبۂ انتقام کو دبا لیتا اور جب کبھی تعلقات میں ناہمواری آئی تو پھر اس کو اس کا نامہ اعمال دکھانے اور چھپے ہوئے واقعات کو منظر عام پر لانے کے لئے کمر کس لیتا ہے، سیاست کی دنیا میں تو اکثر اسکینڈل اسی طرح ظہور میں آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں درگذر کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جب اللہ کسی بات کو معاف فرماتے ہیں تو اس کو ریکارڈ سے ہی حذف کردیتے ہیں۔

توبہ کا تصور جہاں آخرت میں انسان کے لئے نافع ہے، وہیں دنیا میں بھی کچھ کم نافع نہیں۔ اگر ایک کے اندر ناامیدی اور مایوسی پیدا ہوگی، جرم کا حوصلہ بڑھے گا اور جرم پیشہ اذہان سوچنے لگیں گے کہ جب دوزخ مقرر ہی ہو چکی ہے تو دنیا ہی کی لذت اٹھالی جائے اور جہاں ایک دفعہ جرم کا ارتکاب ہوا دس اور سہی، اس سے جرم کو بڑھاوا ملے گا اور سماج میں زندگی اجیرن ہو جائے گی، اس لئے توبہ کا تصور دنیا میں بھی ایک بڑی رحمت ہے اور اس سے سماج کا امن و آشتی متعلق ہے۔

توبہ کے لئے اصل محرک اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے، انسان اپنے

گناہ پر ندامت اور پشیمانی محسوس کرے، اپنے گناہوں کو یاد کر کے اس کا دل لرزنے لگے، خدا کے سامنے اس کے ہونٹ کپکپانے لگیں، آنکھوں کے آنسو دل کی بے چینی اور اضطراب کی گواہی دیں اور اس کا ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو دبا ہوا محسوس کرے، اس پشیمانی اور سچی ندامت کے بغیر محض زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں۔ انسان پر اپنی قلبی کیفیت کے لحاظ سے گناہ کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کو آپ ﷺ نے ایک مثال سے واضح فرمایا کہ نیک اور سچا مسلمان جب کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ ہے اور جو شخص گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے اسے گناہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مکھی ہے جو ناک پر بیٹھی ہوئی ہے، ذرا ہاتھ ہلایا اور اڑ گئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو دھل جاتا ہے اور توبہ نہ کرے تو جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے قلب پر دھبے بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے، اب انسان گناہ کرتا ہے اور اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے بے توفیقی سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔ جیسے دنیا میں بہت سے امراض ہیں جس سے آدمی دوچار ہوتا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو شاید ''جنون'' سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں، اس لئے نہیں کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس میں مریض کو اپنے مریض ہونے کا احساس نہیں رہتا، وہ بیمار ہوتا ہے، لیکن اپنے آپ کو صحت مند تصور کرتا ہے، اس کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو علاج کی ضرورت سے بری سمجھتا ہے، اسی طرح توبہ سے بے توفیقی ایک ''روحانی جنون'' ہے کہ انسان گناہ میں مبتلا ہے، سر سے پاؤں تک گناہ میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن اپنے گناہگار ہونے کا کوئی احساس نہیں کرتا اور کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ خدا کی چوکھٹ پر ندامت اور شرمندگی کی پیشانی رکھے اور التجا کی زبان کھولے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی مسلمان ایسی محرومی اور بدبختی سے دوچار ہو۔

توبہ کے لئے پچھلے کئے پر ندامت کے ساتھ مستقبل کا عزمِ مصمم بھی ضروری ہے،

آدمی اپنے دل میں یہ ارادہ رکھے کہ وہ آئندہ کبھی بھی اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا، اس بات کا نام توبہ نہیں کہ ابھی غلطی کئے دیتے ہیں پھر کبھی گناہ ہوگیا تو پھر توبہ کرلی جائے گی کہ بقول شاعر''کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی''، کیوں کہ اس طرح کی سوچ اس بات کی علامت ہے کہ وہ زبان اور دل کی رفاقت کے ساتھ پشیمانی کا اظہار نہیں کررہا ہے اور اپنی توبہ میں صادق القول نہیں ہے۔

ہر گناہ سے توبہ کا ایک ہی طریقہ نہیں، بلکہ اس کے لئے بھی شریعت نے کچھ اصول مقرر کردیئے ہیں۔ جن گناہوں کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی کفارہ مقرر کردیا گیا ہو تو ان کی توبہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کیا جائے، مثلاً کسی شخص نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ساٹھ روزے رکھنا اور اس پر قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کا کفارہ ہے (ردمحتار: ۲ر۱۰۹) قسم کھائی، لیکن اسے پورا نہ کرپایا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا ہے۔ (مائدہ: ۸۹) ان گناہوں سے توبہ یہی ہے کہ ان کا کفارہ ادا کردیا جائے۔

بعض کوتاہیوں پر شریعت نے قضا واجب قرار دی ہے، جیسے کسی شخص سے عذر کی بنا پر روزہ فوت ہوگیا تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے، ہوش وحواس کی حالت میں نمازیں قضا ہوگئیں تو ان کی بھی قضا واجب ہے، یہ گویا بندوں پر اللہ تعالیٰ کا دَین ہے، جس کی ادائیگی واجب ہے، ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے، اسی طرح بعض عبادتوں کے فوت ہونے پر فدیہ واجب قرار دیا ہے، جیسے کوئی شخص بہت ضعیف یا مریض ہو، روزہ رکھنے پر قادر نہیں اور بظاہر مستقبل قریب میں صحت یاب ہونے کی بھی توقع نہیں، تو ایسے شخص کے لئے یہ سہولت ہے کہ ہر روزہ کے عوض ایک فدیہ ادا کردے، یعنی ایک غریب محتاج شخص کو دوپہر اور رات کا کھانا کھلائے، یا صدقۂ فطر کے بقدر غلہ دے دے۔ اصل میں تو یہ حکم روزہ کے سلسلہ میں آیا ہے (البقرہ: ۱۸۴) لیکن فقہاء نے روزوں پر قیاس کرتے ہوئے نماز میں بھی اس کی اجازت دی ہے کہ جن لوگوں کی نماز فوت ہوگئی اور وہ اب نماز ادا کرنے کے لائق نہ رہے یا ان کا انتقال ہوگیا تو ان کی فوت

شدہ نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ (در مختار: ۲،۱۱۹) ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے، خاص کر جب کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو بجائے اس کے کہ لہو ولعب میں پیسے خرچ کیے جائیں ''کفارہ'' اور'' فدیہ'' ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان سے متوفی کو راحت حاصل ہوگی۔

کچھ گناہ اور کوتاہیاں بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، یہ حقوق دو طرح کے ہیں: مالی اور غیر مالی۔ انسان سے متعلق مالی حقوق میں کوتاہیوں کی توبہ یہ ہے کہ صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دیا جائے یا اس سے معاف کرالیا جائے، کسی کا دین باقی ہو، بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کر لی ہو، کسی کو اس کے حق سے محروم کر دیا ہو، میراث میں اپنے حق سے زیادہ لے لیا ہو، یہ تمام صورتیں مالی حق تلفی کی ہیں، ان کا ادا کرنا ضروری ہے اور اگر ادا کرنے کے لائق نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس سے معذرت کرے اور اس کو راضی کر کے اپنا گناہ معاف کرالے، بعض حقوق غیر مالی ہوتے ہیں، جیسے کسی کو گالی دی، کسی کا تمسخر کیا اور برا بھلا کہا، کسی کی غیبت کی، بہتان لگایا، یہ تمام باتیں حق تلفی اور گناہ کے دائرہ میں آتی ہیں، ان گناہوں کی توبہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ زیادتی کی ہے، اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی جائے، یہ ضروری نہیں کہ اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ اس نے اس کے بارے میں کیا کیا کہا ہے اور کیا کچھ زیادتی کی ہے؟ بلکہ اگر مبہم طور پر معاف کرنے والا یوں کہہ دے کہ تم سے جو کچھ بھی غلطی ہوئی ہو میں اسے معاف کرتا ہوں، تو یہ بھی کافی ہے، ایک ایک غلطی کا شمار کرانا ضروری نہیں۔ اگر اللہ کے کسی بندہ کے حق میں زیادتی ہوگئی ہو تو وہ بڑا ہو یا چھوٹا، زیادہ باعزت ہو یا کم معزز، عذر خواہی اور عفو خواہی میں تکلف نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ حقوق العباد میں ہونے والی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کریں گے، جب تک کہ خود صاحب معاملہ معاف نہ کر دے، یہاں تک کہ شہادت اور اللہ کے راستہ میں جان کی سپردگی جیسا عظیم عمل بھی انسان کو انسان کے حق میں ہونے والی کوتاہیوں سے بچا نہیں سکتا، اس لئے اس میں شرم و عار کو رکاوٹ نہ بنانا چاہئے۔

ان گناہوں کے علاوہ جو گناہ ہیں، جیسے جھوٹ بولنا، یا ایسا ملک جہاں شرعی حدود

نافذ نہ ہوتی ہوں، میں ایسے کسی جرم کا مرتکب ہونا جس پر خود اللہ کی طرف سے شرعی سزائیں مقرر ہیں، جیسے زنا، چوری، کسی مسلمان پاک دامن شخص پر تہمت اندازی، شراب نوشی وغیرہ، ان کے لئے بھی خوب گڑگڑا کر توبہ کرنا چاہیے اور یوں بھی استغفار کی کثرت رکھنی چاہئے، تاکہ یہ اس کے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کا کفارہ بن جائے، کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات ایک ہی مجلس میں ستر ستر بار استغفار فرمایا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ جہاں نفل عبادت، قرآن مجید کی تلاوت، انفاق اور دعاؤں کا مہینہ ہے، وہیں توبہ و استغفار کے لئے بھی اس سے بہتر کوئی موسم نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کا دروازۂ رحمت کھلا رہتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔

(۲۴ر نومبر ۲۰۰۰)

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے

انسان کس قدر عاجز ہے کہ ہر لمحہ اور صبح و شام جس چیز کا ضرورت مند ہے، اسے بھی وجود میں نہیں لاسکتا، نہ وہ چاول اور گیہوں کا ایک دانہ پیدا کرسکتا ہے، نہ اپنے لئے پانی کا کوئی قطرہ وجود میں لاسکتا ہے، نہ وہ ہوا اور آکسیجن کی تخلیق کرسکتا ہے، جس کے بغیر چند منٹ بھی اس کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی، !اور خدا کس قدر قادر اور عظیم ہے جس نے اتنی بڑی کائنات ہمارے لئے بچھائی ہے، اور ہر لمحہ لاکھوں پھل پھول ہیں، جن کو وہ پیدا کرتا ہے، پھر وہ مہربان اور رحم دل بھی کس قدر ہے، کہ اس نے سورج کا ایسا چراغ جلا رکھا ہے، جس کی روشنی ہر آنگن میں پہونچتی ہے، اور جس کے حکم سے گھٹائیں رحمت بہ اماں ہوکر ہر کھیت کی پیاس بجھاتی ہیں، یہ آنگن کسی مسلمان کا ہو یا کسی کافر کا، اور یہ کھیت اللہ کے فرمانبرداروں کے ہوں یا نافرمانوں کے!

جو خدا اس قدر قادر مطلق ہے، جس کے خزانۂ قدرت میں نعمتوں کی کوئی کمی نہیں، پھر جو اتنا سخی اور داتا ہے کہ دنیا میں اچھے بُرے کا فرق کئے بغیر سب کو دیتا ہے، خوب دیتا ہے اور دامن بھر بھر دیتا ہے، اس سے بڑھ کر کون اس لائق ہوسکتا ہے کہ عاجز و کمزور اور ضرورت و حاجتمندی کا پتلا انسان اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور اپنی ضرورتوں کے کشکول اس کے سامنے کھولے، کہ اللہ! اپنے ایک فقیر بے نوا اور گدائے بے آسرا پر نگاہ کرم فرما اور اپنے جود و سخا اور داد و دہش کے دربار سے اس کے عاجز ہاتھوں کو واپس نہ کر ـــــ اسی ادائے بندگی کا نام "دعاء" ہے۔

دعاء کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اہلِ ایمان سے فرمایا ہے کہ وہ اللہ سے مانگے اور اس سے دعاء کرے، (غافر:۶۵،۱۴) اللہ تعالیٰ نے یہ

بھی فرمایا کہ تم مجھ سے مانگو تو میں تمہاری دعاء قبول کروں گا'' ادعونی استجب لکم (غافر:۶۰) اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ ان کے پہلو بستر سے الگ ہوتے ہیں، اور خوف وطمع کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں (السجدۃ:۱۶) ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ سے اس کے فضل کے طلب گار رہو واسالوا اللہ من فضلہ (النساء:۳۲) رسول اللہ ﷺ نے جو عبدیت اور بندگی کا نمونہ تھے دعاء کرنے کی خوب ترغیب دی ہے، آپ نے فرمایا کہ دعاء دراصل عبادت ہے: الدعاء ھو العبادۃ (ترمذی عن نعمان بن بشیر) ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے دعاء کو عبادت کی روح اور اس کا مغز قرار دیا (ترمذی:۳۳۷۱) مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ اس سے کچھ مانگو تو ناگواری ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو دعاء سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں (ترمذی عن ابی ہریرۃ) اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں (ترمذی) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مصیبتیں آچکی ہیں، دعاء ان میں بھی نافع ہے اور جو آنے والی ہیں دعاء ان سے بھی بچاتی ہے، اس لئے اللہ کے بندو! تم پر دعاء کا اہتمام ضروری ہے (مشکوٰۃ:۲۲۳۴) حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کے لئے دعاء کا دروازہ کھل گیا، اس کے لئے رحمت کے دروازے وا ہو گئے، اور انسان اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگتا ہے، اس میں عافیت سے بہتر کچھ اور نہیں (مشکوٰۃ:۲۲۳۹)

عام طور پر لوگ مصیبت کے وقت ہی دعا کرتے ہیں، یہ بندہ کی خودغرضی کی بات ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چاہتا ہو کہ مشکل وقتوں میں اس کی دعا قبول کی جائے اسے چاہئے کہ بہتر وقت میں خوب دعا کیا کرے، (ترمذی عن ابی ہریرہ) دعا چوں کہ خود عبادت ہے، اس لئے وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی، آپ نے فرمایا: یا تو اس کی دعا اسی طرح قبول کر لی جاتی ہے، یا آخرت کے اجر کی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے، یا اسی مطلوب کے بقدر مصیبت اس سے دور کر دی جاتی ہے، (مشکوٰۃ عن ابی سعید خدری:۲۲۵۹) چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

تمہارے پروردگار بہت حیاء والے اور کریم ہیں، جب بندہ ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس سے حیاء کرتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں کو خالی واپس کردیں (مشکوٰۃ:۲۲۴۴) البتہ دعاء کے معاملہ میں عجلت اور بے صبری نہیں ہونی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان گناہ یا قطع رحمی کی دعاء نہ کرے تو اس کی دعاء قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ جلد بازی سے کام نہ لے، دریافت کیا گیا، کہ جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہے میں نے بہت دعاء کی، لیکن لگتا ہے میری دعا قبول نہیں ہوئی، چنانچہ نا اُمید ہو کر دعا کرنا چھوڑ دے، (مشکوٰۃ عن ابی ہریرۃ: ۲۲۲۷) اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ خوشحالی اور کشادگی کا انتظار بھی افضل ترین عبادت ہے، **وافضل العبادۃ انتظار الفرج** (مشکوٰۃ:۲۲۲۷)

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو دیکھئے تو صبح سے شام تک دعاؤں کا معمول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح دعا کرو کہ دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے ضرور ہی قبول فرمائیں گے،

فاسئلوہ و انتم مؤمنون بالاجابۃ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۴۸) کیوں کہ جب تک دعا کے قبول ہونے کا یقین نہ ہو وہ کیفیت وانابت پیدا نہیں ہوسکتی، جو دعا کے لئے مطلوب ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ دعا کے وقت قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، دل غافل اور لاپرواہ ہو اور زبان پر دعا کے کلمات ہوں، تو یہ دعا مقبول نہیں، حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے مروی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ غافل اور بے توجہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتے ہیں (مشکوٰۃ:۲۲۴۱) خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ دعا کرنے والے پر فروتنی کی کیفیت ہونی چاہئے، **ادعوا ربکم تضرعا وخفیہ** (الاعراف:۵۵)

قلب کے ساتھ ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی دعاء کرنے والے کو بندگی اور عجز و نیاز کا مظہر ہونا چاہئے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو ہتھیلیوں کی طرف سے نہ کہ پشت کی جانب سے یعنی ہتھیلیاں پھیلا کر رکھو نہ کہ پشت، اور پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے چہرہ پر پھیر لو (مشکوٰۃ عن ابن عباس:۲۲۴۳) حضرت عمر ﷛ کی ایک روایت ہے کہ دعا کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ مونڈھوں کے مقابل یا ان کے قریب ہو (ابوداؤد: عن عکرمہ) گویا ایک

بھکاری ہے جو اپنا ہاتھ پھیلایا ہوا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کا معمول مبارک بھی یہی تھا، (مشکوٰۃ: ۲۲۵۴) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہاتھ سینوں کے مقابلہ ہونا چاہئے، حضور ﷺ اس سے زیادہ ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ (مشکوٰۃ: ۲۲۵۷)

آپ ﷺ نے دعا کے کلمات کے بارے میں بھی آداب بتائے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنی چاہئے اور آپ ﷺ پر درود، پھر دعا کرنی چاہئے (مجمع الزوائد: ۱۰؍۱۵۵) حضرت فضالہ بن عبید سے مروی ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آئے، نماز پڑھی، پھر دعا کرنے لگے! کہ اللہ! مجھے معاف فرما، آپ ﷺ نے فرمایا: اے نماز پڑھنے والے تم نے جلد بازی کی، جب نماز پڑھو تو بیٹھو، پھر اللہ کی حمد کرو، پھر مجھ پر درود بھیجو، اس کے بعد دعا کرو، چنانچہ اس نے اسی طرح دعا کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا کرو قبول کی جائے گی، سل تعطه (مجمع الزوائد: ۱۰؍۱۵۶) دعا کرتے ہوئے آواز پست اور آہستہ ہونا چاہئے، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ دعا کے آداب میں یہ بات فرمائی ہے کہ دعا میں آواز پست ہونی چاہئے (اعراف: ۵۵) کیوں کہ پست آواز میں ریا اور دکھاوے کا اندیشہ کم ہے، آدمی اپنی ضرورت کے مطابق دعا کرسکتا ہے، اس سے رقت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، آج کل اجتماعی طور پر دعاء کا رواج بڑھ گیا ہے، اس میں بعض اوقات دعا ''رسم دعا'' بن جاتی ہے، رقت اور خشیت کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اور چوں کہ ہر شخص کی ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے انسان اپنی ضرورت کے مطابق خدا سے سوال نہیں کرپاتا، دعا کے آداب میں یہ بھی ہے کہ دعا خواہ کسی کے لئے کرنی ہو، دعا کا آغاز اپنی ذات سے کرے (مجمع الزوائد: ۱۰؍۱۵۲، باب دعاء المراء لنفسہ) کیوں کہ اس سے عجز اور اللہ کے سامنے احتیاج کا اظہار ہوتا ہے، اور دراصل یہی کیفیت دعاء کرنے والے میں مطلوب ہے۔

کچھ خاص اوقات ہیں جن میں دعاء مقبول ہوتی ہے، رات کے آخری اور تہائی حصہ میں یہاں تک کہ صبح طلوع ہوجائے (مسند احمد عن ابن مسعود) جہاد میں صفوں کے آراستہ ہونے کے وقت، بارش ہونے کے وقت، نماز کی اقامت کے وقت (ترمذی عن ابی ہریرہ)

اس کے علاوہ فرض نمازوں کے بعد، شب قدر اور بعض خاص راتیں دعاء کی قبولیت کے خاص مواقع ہیں، اسی طرح کچھ لوگ ہیں، جن کی دعاؤں کو آپ ﷺ نے خاص طور پر مقبول قرار دیا ہے، ان ہی میں مظلوم ہے گو وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے بُرا ہی کیوں نہ ہو، روزہ دار تا آنکہ افطار کر لے، اور مسافر تا آنکہ واپس آ جائے (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۲)، امام عادل کی دعاء اور باپ کی دعاء اپنی اولاد کے حق میں مقبول ہے، (مشکوۃ عن ابی ہریرۃ: ۲۲۲۸، ۲۲۲۹) کسی شخص کی غیر موجود مسلمان بھائی کے بارے میں دعاء بھی مقبول ہوتی ہے اور متعدد روایتوں میں اس کا ذکر ہے، (ترمذی عن عبداللہ بن عمر) حاجی کی دعاء گھر واپسی تک، اور مجاہد کی دعاء جہاد سے فارغ ہونے تک بھی مستجاب دعاؤں میں ہے، (مشکوۃ: ۲۲۶۰) جیسے ان لوگوں کی دعاء مقبول ہوتی ہے اور اس میں شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہئے، ویسے ہی ان کی بددعاء اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے، اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ اولاد اور مال پر بددعاء نہ کرو، کہ کہیں وہ وقت دعاء کی مقبولیت کا ہو اور یہی دعاء عند اللہ مقبول ہو جائے۔ (مسلم عن جابر)۔

بعض لوگ خود اپنے لئے دعاء کا اہتمام نہیں کرتے، اور لوگوں سے خواہش کرتے ہیں کہ میرے لئے دعاء کیجئے یہ صحیح نہیں، اپنے لئے خود بھی دعاء کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان خود اپنے لئے جس رقت اور سوز کے ساتھ دعاء کر سکتا ہے، ظاہر ہے کوئی اور نہیں کر سکتا، کیوں کہ انسان کی اپنی دعاء میں اس کا غم چوں کہ جگر کی طرح شامل ہوتا ہے، اور اللہ کے یہاں اسی جذبۂ دروں کی قدر و قیمت ہے، لیکن اگر کسی سے دعاء کی درخواست کی جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عمرہ کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے اجازت دی اور فرمایا اے میرے چھوٹے بھائی! مجھے بھی اپنی دعاء میں شریک رکھنا، اور بھول نہ جانا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا ایسا کلمہ ہے کہ اگر اس کے بجائے پوری دنیا بھی حاصل ہو جاتی تو اس سے بڑھ کر خوشی نہ ہوتی (ترمذی عن عمر رضی اللہ عنہ) بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ جو اہم چیز ہو اس کی دعاء کی جائے، معمولی چیز کیا اللہ سے مانگی جائے، یہ ناسمجھی کی بات ہے، اصل میں انسان چھوٹی سے چھوٹی

اور بڑی سے بڑی تمام ضرورتوں میں اللہ ہی کا محتاج ہے، اس لئے ہر چھوٹی، بڑی ضرورت خدا ہی سے مانگنی چاہئے، نہ کہ کسی اور سے، کیوں کہ جیسے اللہ قادر مطلق ہے، ویسے ہی انسان محتاج مطلق، چنانچہ حضرت انس ﷜ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر ضرورت اللہ ہی سے مانگنی چاہئے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ ہی سے مانگے، اور ایک روایت میں ہے کہ نمک کے لئے بھی اللہ ہی سے طلب گار ہو، (ترمذی عن انس ﷜) اور کیوں نہ ہو کہ انسان ان میں سے کسی چیز کا خالق نہیں، وہ محض اللہ کی تخلیق سے نفع اٹھاتا ہے، اس لئے قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ میں خدا کا محتاج ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ گذر رہا ہے، نیکیوں کا موسم بہار خدا کی رحمتوں اور عنایتوں کا مہینہ عفو و درگذر اور دوزخ سے نجات کا مہینہ، محرومیوں کے علاج اور بگڑی بنانے کا مہینہ، وہ مہینہ جس میں خود خدا بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کمال شفقت کے ساتھ عاجز اور گناہ گار بندوں سے دریافت کرتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے معاف کردوں، کوئی ہے روزی کا خواستگار کہ اسے روزی عطا فرماؤں، اور کوئی ہے کسی مصیبت اور ضرورت سے دوچار کہ اس کی حاجت پوری کردوں ـــــ پھر کیا داتا کی اس آواز پر بھی فقراء اپنی ضرورت کا ہاتھ نہیں پھیلائیں گے، اور زبان سوال اس کے سامنے نہیں کھولیں گے، کہ جس کے خزانہ قدرت میں سب کچھ ہے، جو دے کر خوش ہوتا ہے، اور نہ مانگنے والوں سے ناخوش؟؟ شاعر حقیقت شناس نے کیا خوب کہا ہے :

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے
مانگ میں شرمندگی اچھی نہیں

(۱۵ر نومبر ۲۰۰۳ء)

خشک سالی ـــــ شامتِ اعمالِ ما!

موسم کا معتدل اور متوازن ہونا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، عام حالات میں زمین پر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور فضاء میں شوخی سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی خنک ہواؤں کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی، لیکن جب موسم گرما میں سورج آگ برساتا ہے، گرم و خشک ہوائیں درختوں کو بے روح کر دیتی ہیں، لو کے جھونکے انسانوں کے لئے پیامِ موت ثابت ہونے لگتے ہیں اور زمین اور ماحول کی تپش سے کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں، اس وقت خوشگوار موسم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے!

اس وقت پورا ملک گرمی کی لپیٹ میں ہے، اور بہت سے علاقے ہیں جہاں خشک سالی نے زندگی کو دوبھر کر دیا ہے، راجستھان اور گجرات کے ایک علاقہ کا تو بہت ہی برا حال ہے، پینے کے پانی کے لئے لوگوں کو تپتے ہوئے ریگزاروں سے گذر کر میلوں دور جانا پڑتا ہے، جانوروں کو چارہ میسر نہیں۔ اور ان کی تصویریں دیکھ کر رحم آتا ہے، پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ ان حالات میں لوگ گندے پانی بھی استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی وجہ سے بیماریوں کا پھیلنا فطری بات ہے، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہاں تک کہ نہایت سرد علاقوں میں بھی خشک سالی اپنے قدم بڑھا رہی ہے، آسٹریلیا جیسا ہرا بھرا اور درختوں اور جنگلات کی کرامات سے پہچانا جانے والا ملک بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں۔

قحط سالی کی کچھ طبعی وجوہ ہو سکتی ہیں، طبعی وجوہ کا تعلق بھی انسان کے اپنے افعال ہی سے ہے، زمین پر جنگلات اور درختوں کا وجود قدرت کا بہت ہی خوبصورت اور انوکھا تحفہ ہے، اگر قدرت کا ہاتھ ان درختوں کی تخلیق نہ کرے اور زمین کو ان گہنوں سے آراستہ

کرنا چھوڑ دے تو کوئی طاقت نہیں جوان کو وجود میں لا سکے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زراعت اصل میں ہم کرتے ہیں یا تم کرتے ہو؟! انتم تذرعونہ ام نحن الزارعون (الواقعہ:٦٤) ان درختوں سے جہاں انسان کو غذائی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور سوکھی لکڑیوں سے وہ اعلیٰ فرنیچر بناتے ہیں اور نوع بہ نوع فائدے اٹھاتے ہیں، وہی زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے اور بارش کے نظام کو متوازن بنانے میں بھی یہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، تیزی سے جنگلات کی کٹائی نے موسم پر نہایت ہی برا اثر ڈالا ہے، دہلی میں درجۂ حرارت معمول سے ۷ تا ۸ ڈگری سلسیس بڑھ گیا ہے، اور بہ حیثیت مجموعی ۱۹۷۰ء سے اب تک تین دہوں میں زمین کھلے درجۂ حرارت میں ایک ڈگری فارن ہیٹ کا اضافہ ہوگیا ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ درختوں کی کٹائی اور جنگلات کا خاتمہ اس کا بڑا سبب ہے، اسی لئے اسلام نے شجر کاری اور کاشت کاری کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان جب کوئی درخت لگاتا ہے، تو اس درخت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا اجر لکھتے ہیں، (مسند احمد عن ابی ایوب انصاری، مجمع الزوائد:٦٧/٤) حضرت ابو درداء سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے درخت لگایا اس میں سے کوئی آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ (حوالہ سابق:٦٨/٤) درخت کو آپ ﷺ نے درخت والوں کے لئے اور ان کے بعد کی نسل کے لئے برکت کا باعث قرار دیا۔ (مجمع الزوائد:٦٨/٤) برکت میں عافیت امور حفاظت اور ہر طرح کا نفع شامل ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا ہے، عرب میں عام طور پر بیری اور ببول کے درخت ہوتے تھے، اس لئے خاص طور سے حدیث میں بیری کے درخت کا ذکر آیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ بیری کا درخت کاٹنے والے پر اللہ کی لعنت ہو، (مجمع الزوائد:۱۱۵/۸، باب، فیمن قطع السدر) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بیری کا درخت کاٹتے ہیں وہ اوندھے منہ جہنم میں

ڈالے جائیں گے۔ (حوالہ سابق بحوالہ طبرانی) اسی مضمون کی روایت عبداللہ بن حبشی سے بھی مروی ہے عمرو بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے بیری کا درخت کاٹا سوائے اس کے کہ کھیتی کے لئے کاٹے، اللہ تعالیٰ دوزخ میں اس کا گھر بنائیں گے (مجمع الزوائد ۴؍۶۹ باب فیمن قطع السدر) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگلات کی حفاظت کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ جدید صنعتوں میں گیس اور کیمیکلس کا بے دریغ استعمال اور اس کے مضر اثرات سے حفاظت کی طرف سے بے توجہی نیز زمین کے اندر موجود قدرتی وسائل کوئلے وغیرہ کا مسلسل اخراج اور فضاء میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی، یہ سب وہ اسباب ہیں جو خود انسانوں کے ہاتھوں پیدا ہو رہے ہیں، اور انسان خود اپنی تباہی کا سامان بہم پہنچا رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دنیا کو اجتماعی ضرر پہونچانے کا باعث ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اور فقہ اسلامی کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ نہ ابتداءً ضرر پہونچانے کی اجازت ہے اور نہ ردِّ عمل میں، لاضرر و لاضرار، لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے ان امور میں غیر محتاط رویہ اختیار کرنا قطعاً درست نہیں۔

یہ بھی انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ انسان اپنی تباہی کے اسباب پر ہی پوری صلاحیت خرچ کر رہا ہے، ایک سے ایک مہلک نیوکلیر ہتھیار، میزائل، ٹینک اور تباہی پھیلانے والے طیارے ہیں جو وجود میں آرہے ہیں، لیکن ماحولیاتی عدم توازن جیسے سنگین اور مہیب مسئلہ سے نمٹنے کے لئے سائنس داں ایسی مخلصانہ کوشش نہیں کر رہے ہیں جو ان کا انسانی فریضہ ہے، حکومتیں بھی مہلک ہتھیاروں کی ایجاد کے معاملہ میں ان کی جس قدر حوصلہ افزائی کرتی ہے، تعمیری مقاصد کے لے غالباً اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتیں، اس سے بڑھ کر افسوس کی بات کیا ہوگی؟

یہ تو خشک سالی کے طبعی اسباب ہیں، اور ان میں بھی انسان ہی کی شامت اعمال کو دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات میں جو بھی واقعات پیش آئیں وہ اتفاقی نہیں ہیں، بلکہ انسان کے اعمال

اور احوال کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر مبنی ہیں، انسان کی اطاعت وفرماں برداری اور معصیت ونافرمانی سے بارش کا غیبی نظام متعلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں رات میں ان پر بارش برساؤں اور دن میں ان پر دھوپ نکلا کرے، (مسند احمد، مجمع الزوائد: ۲/۲۱۱) اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے جب جمعہ کے دن بارش کی دعا کرنے کی خواہش کی گئی تو بعض روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور صحابہ سے فرمایا کہ اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، **استغفروا ربکم انه کان غفارا** (مجمع الزوائد: ۲/۲۱۶)۔ غرض، خشک سالی، قحط سامانی اور موسم کی غیر معمولی تمازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے کہ انسان اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرے، خدا فراموشی سے باز آئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے کہ اس میں نہ صرف ان کی آخرت کی بھلائی ہے، بلکہ ان کی دنیوی فلاح بھی اس سے متعلق ہے، کم سے کم مسلمانوں کے لئے تو یہ حقیقت جزء ایمان ہے، اگر مصیبتیں اور آفتیں بھی انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہیں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟؟

بارش کی کمی اور عبرت وموعظت کے کچھ پہلو

جولائی ختم ہونے کے قریب ہے اور صورت حال یہ ہے کہ گھٹائیں مستانہ وار آئی ہیں، ان کی کالی کالی زلفیں دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ آج تو چپہ چپہ کو آبیار و شاد کام کر کے ہی چھوڑیں گی، لیکن کسی روٹھے ہوئے محبوب کی طرح اٹھکھیلیاں کر کے گذر جاتی ہیں، دیہات وقریہ جات میں کسان پریشان ہیں کہ ان کی کھیت کیوں کر لہلہائیں گے اور کیسے ان کی امیدوں کے غنچے کھلیں گے؟ اور شہر میں بسنے والے بے چین ہیں کہ وہ پہلے ہی سے پانی کی کمی سے دوچار ہیں، ان کے حلق کیوں کر تر ہوں گے؟؟

اس صورتِ حال نے اس وقت ہم سب کو پریشان کر دیا ہے، یہاں تک کہ وہ حکومت بھی اب اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے، جو گذشتہ ۲۰ رسالوں سے حیدرآباد کو پانی لانے کے لئے صرف منصوبے بنا رہی ہے، اور اپنے خوش کن منصوبوں اور دل آویز تجویزوں سے نہ جانے کتنی بار اخبارات کی سیاہی اور اپنی وقتی سرخروئی کا سروسامان کر چکی ہے۔

دنیا کے لوگ کائنات میں پیش آنے والے واقعات کو طبعی اسباب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ایسی ہی تدابیر کے ذریعہ اس کے علاج کی سوچتے ہیں۔ بارش کیوں نہیں ہوتی، اس لئے کہ ہوا کا دباؤ موافق نہیں ہے، جنگلات کٹتی جارہی ہیں اور ماحولیاتی آلودگی بڑھتی جارہی ہے، ان اسباب کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن بحیثیت مسلمان ہمارے لئے یہ کافی نہیں، ہماری غور وفکر کی سرحدیں اس سے بہت پرے ہیں، ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی راحت وآرام اور زحمت ومشقت کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں، ان فیصلوں کو کوئی مخلوق اپنے قلم سے نہیں لکھ سکتی، بلکہ یہ کائنات کے خالق ومالک کے حکم کے تابع ہیں، دنیا میں جو کچھ

پیش آتا ہے، اس کے کچھ ظاہری اسباب ہیں جنہیں ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، لیکن اس کے کچھ غیبی اسباب بھی ہیں، جنہیں آج ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور ہم اپنے ظاہری حواس سے ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، لیکن انبیاء کے ذریعہ خالق کائنات نے جزاء وسزا کا جو نظام ہمیں سمجھایا اور پہونچایا ہے وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔

پانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیبی نظام کو رسول اللہ ﷺ نے بھی بیان فرمایا کہ جب لوگ اپنے مال کی زکوۃ ادا نہیں کرتے تو وہ بارش سے روک دیئے جاتے ہیں اور ان پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے، بلکہ اگر بے زبان جانور نہ ہوں تو وہ بارش سے بالکل ہی محروم کر دیئے جائیں،: **ولم یمنعوا زکوٰۃ اموالھم الامنعوا القطر من السماء و لو لاالبھائم لم یمطروا** (ابن ماجہ عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر: ۴۰۱۸)۔ نیز حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خشکی اور سمندر میں جو مال تلف ہوتا ہے وہ زکوۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے: **یا تلف مالا فی بر و لا بحر الابحبس الزکوٰۃ** (مجمع الفوائد حدیث نمبر: ۲۶۸۴، بہ سند ضعیف)۔ اس لئے بارش کی جو موجودہ صورت حال ہے، اس میں ہمیں چاہئے کہ اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں اللہ کی طرف سے یہ پکڑ تو نہیں ہے، خاص کر زکوۃ کے بارے میں اپنا محاسبہ کریں کہ جن اموال میں زکوۃ واجب ہوتی ہے کیا ہم ان سب کی زکوۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور پھر زکوۃ کی ادائے گی کا باضابطہ حساب رکھتے ہیں، اس فریضہ میں کوتاہی خدا کے غیبی نظام کے مطابق اجتماعی عذاب کو دعوت دینا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اپنی ضرورت کا ہاتھ پھیلائیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقع کے لئے مستقل طور پر استسقاء کی نماز رکھی ہے، آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں کم سے کم دو بار استسقاء فرمایا ہے، ایک بار تو باضابطہ نماز ادا فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اس موقع سے آپ بہت ہی معمولی کپڑے میں، کمال تواضع اور فروتنی کے ساتھ در دولت سے نکلے اور عیدگاہ تشریف

لائے، خوب دعاء کی، گریہ وزاری فرماتے رہے، اور پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی (ترمذی حدیث نمبر: ۵۵۸)۔ حضرت عائشہؓ کی روایت اور مختلف روایات میں اس موقع کی دعاء مذکور ہے، اور یہ بھی ہے کہ آپ کے نماز پڑھتے ہی بجلی کی کڑک اور چمک شروع ہوئی اور ایسی بارش ہوئی کہ آپ کے عیدگاہ سے مسجد نبوی پہونچنے تک نالے بہہ پڑے، صحابہ نے بھاگ بھاگ کر ایسی جگہوں کی پناہ لی جہاں بارش سے بچ سکیں، آپ ﷺ کو بے اختیار ہنسی آگئی اور ارشاد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، (ابوداؤد عن عائشہ حدیث نمبر: ۱۱۷۳)

دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے دعاء پر اکتفاء فرمایا، حضرت انس ؓ راوی ہیں کہ جمعہ کا دن تھا، آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ بارش نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے، ایک دیہاتی کھڑے ہوئے اور عرض کیا؟ جانور ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکوں مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء فرمائیے کہ ہمیں بارش سے سیراب فرمادے، رسول اللہ ﷺ نے دستِ مبارک اٹھا دیا، راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ ﷺ نے دعاء شروع کی آسمان پر کہیں بادل کا ٹکرا نہیں تھا، آپ کے دعاء کرتے ہی گھٹائیں چھا گئیں، اور بارش شروع ہوگئی، یہاں تک کہ جب آپ منبر سے نیچے اترے تو ریش مبارک سے پانی کے قطرات گر رہے تھے، یہ بارش ایک ہفتہ جاری رہی، اسی بارش کے درمیان آئندہ جمعہ آپ جمعہ کے خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اسی دیہاتی نے یا کسی اور شخص نے اپنی عرض پیش کی کہ مکانات گر رہے ہیں اور مال واسباب ڈوب رہے ہیں، دعاء فرما دیجئے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی: حوالینا ولا علینا، ہم پر یعنی مدینہ میں بارش نہ ہو اور مدینے کے گرد وپیش میں بارش ہو، آپ کی دعاء کا اثر یہ ہوا کہ مدینہ شہر سے بادل چھٹ گیا، لیکن مدینہ کے مضافات میں واقع وادیاں ایک ماہ تک بہتی رہیں (بخاری حدیث نمبر: ۱۰۳۳)۔ غرض کہ اس قحط سامانی میں اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے، جس کی حکومت پورے عالم آب وگل میں ہے، اور جس کے ہاتھوں میں پانی اور تمام نعمتوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک بار مدینہ اور حجاز کے علاقہ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ لوگ سوکھے چمڑے کھانے پر مجبور ہوئے، فاقہ کش رعایا کی کیفیت دیکھ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دردمند دل گھٹتا تھا، اور آپ لوگوں کی مدد کے لئے شبانہ روز تدبیروں میں مشغول رہتے تھے، آپ نے مصر وشام کے علاقہ سے کثیر مقدار میں غذائی اشیاء منگوائیں اور اہل مدینہ کو راحت پہونچانے کی پوری کوشش فرمائی، لیکن قحط تھا کہ کسی طور دور نہیں ہوتا تھا، انہی دِنوں ایک صحابیؓ نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی، حضور ﷺ نے فرمایا، میں تو سمجھتا تھا کہ عمر سمجھدار آدمی ہے! یہ صاحب گھر آئے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، دستک دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ کون صاحب آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں، اس جواب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بے قرار کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھولا اور ان صاحب نے اپنا خواب سنایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت متفکر ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہؓ سے دریافت کیا، کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور ﷺ کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی ہے، صحابہؓ نے کہا نہیں، اور کچھ تحسینی کلمات کہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان صاحب سے کہا کہ وہ اپنا خواب بیان کریں، خواب سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ اس جانب متوجہ فرمارہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لئے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرمارہے ہیں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نماز استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حق کو قبول کرنے کا ایسا مزاج رکھتے تھے کہ انبیاء کے بعد روحانی تاریخ میں شاذ ونادر اس کی مثال مل سکی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز استسقاء ادا فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ غرض کہ اس طرح کے صبر آزما حالات لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں، کہ انسان خدا کے سامنے گڑ گڑائے، بارگاہ ربانی میں آنسوؤں سے وضوء کرے، عجز وبندگی کے ہاتھ پھیلائے، اور جبین نیاز خدا کی چوکھٹ پر بچھائے، اگر یہ حالات بھی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ نہ کریں تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس لئے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو

نمازِ استسقاء کا اور تمام نمازوں میں عموماً اور نمازِ جمعہ میں خصوصاً دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایسا کوئی بھی کام جو لوگوں کے لئے اجتماعی نقصان کا باعث ہو، کے کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ سایہ دار درخت کے نیچے گندگی پھیلانے، اور پانی کو آلودہ کرنے کو حضور ﷺ نے منع فرمایا، بلا وجہ درختوں کو کاٹنے کی ممانعت کی گئی، اس لئے ایسے اسباب کا اختیار کرنا، درست نہ ہوگا، جو طبعی نظام کے تحت بارش کو متأثر کرتا ہو، جیسے غیر مجاز طریقے پر جنگلات کو کاٹنا، زرعی اراضی کو خواہ مخواہ آبادی والے علاقے میں تبدیل کر دینا، کہ ان سے قدرتی ماحول متأثر ہوتا ہے، اور اس کا اثر بارش پر بھی پڑتا ہے، یہ انسانی سماج کے لئے ضرر ونقصان کا باعث ہے، ضرر ونقصان کو دور کرنا شریعت اسلامی کا اہم ترین مقصد ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ افراد واشخاص کے مفاد کے مقابلہ اجتماعی مفاد کی اہمیت زیادہ ہے، اسی طرح انفرادی نقصان کی بہ نسبت اجتماعی نقصان زیادہ قابل توجہ اور مقدم ہے، اس لئے اگر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے، جن کا مقصود ماحول کا تحفظ ہو تو ہمیں اس کا پورا تعاون کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ بات اسلامی مزاج اور فکر کے عین مطابق ہے!!

زلزلہ —— خدا کی تنبیہ

پچھلے چند دنوں پہلے شہر کے کچھ حصے میں ساڑھے تین سکنڈ زلزلہ کا جھٹکا محسوس کیا گیا۔ یہ جھٹکے بہت ہی کم وقت کے لئے تھے، اسی لئے اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ لیکن انسان اتنا عاجز اور کمزور ہے کہ اس لحاتی حادثہ نے بھی اسے ایسی دہشت اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا کہ دوسرے دن بہت سے لوگوں نے گھر سے باہر سرراہ آنکھوں میں رات کاٹی، زلزلہ یوں تو کائنات کا ایک طبعی واقعہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان واقعات کے پیچھے اصل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا فیصلہ کارفرما ہے۔ اور خدا کا ایک غیبی نظام ہے، جو کائنات میں پیش آنے والے ہر واقعہ کے پیچھے ہے، جیسے دنیا میں انسان کے افعال سے بعض حالات متعلق ہوتے ہیں، دست آور چیز کے کھانے سے معدہ خراب ہوتا ہے، چکنی چیزیں جگر کو خراب کرتی ہیں، انسان دھار دار لوہا اپنے ہاتھ پر مارے تو یقیناً ہاتھ کٹے گا اور خون بہے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام میں انسان کے نیک و بد اعمال پر احوال مرتب ہوتے ہیں، زلزلہ، طوفان، سیلاب، قحط، غیر معتدل بارش، وبائی امراض یہ سب اوپر سے اترنے والے احوال ہیں، اللہ کی بندگی، خلق اللہ کے ساتھ حسنِ سلوک، صدق وصفا، عدل وانصاف، اور ان کے مقابلہ میں اللہ کی نافرمانی، خلق اللہ کے ساتھ ظلم و جور، جھوٹ، دھوکہ، وعدہ خلافی اور ایذا رسانی وہ اعمال ہیں جو زمین سے آسمان کی طرف جاتے ہیں، جیسے اعمال نیچے سے جائیں گے ان ہی کے مطابق اللہ کی طرف سے احوال وواقعات ظاہر ہوں گے، اس لئے ایک مومن کی نگاہ میں طبعی اسباب کسی واقعہ کے لئے ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں، اچھے اور برے واقعات کا اصل سبب خدا کا راضی یا ناراض ہونا اور انسان کے اعمال کے اعتبار سے اس کی رحمت یا غضب کا زمین والوں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

اس طرح کے واقعات دراصل خالقِ کائنات کی طرف سے ''الارم'' ہیں، تاکہ خلق خدا اپنے اعمال کا محاسبہ کرے، اور آپ اپنے احتساب کا فریضہ انجام دے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں گناہوں کی کثرت ہوگی اور زلزلہ کے واقعات بھی بڑھیں گے، یہاں تک کہ کائنات پر زلزلۂ قیامت برپا ہوگا، جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ ''زلزال'' میں ہے، یہ زلزلہ پورے روئے ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، اور قرآن کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طویل اور شدید زلزلہ ہوگا، جو زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دیتا جائے گا، اور پوری کائنات زیروزبر ہوکر رہ جائے گی، سکنڈوں اور منٹوں کے زلزلے کتنے آفت بداماں ہوتے ہیں؟ یہ ہر شخص جانتا ہے، اسی سے اس شدید اور طویل زلزلہ کی ہولناکیوں اور قہر سامانیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کائناتی احوال میں معمولی تغیر پیش آنے سے بھی بے قرار ہوجاتے، اللہ سے رجوع ہوتے، اور خوف وخشیت کی کیفیت آپ ﷺ کے چہرہ سے عیاں ہوتی، حضرت ابو درداء ؓ سے روایت ہے کہ اگر کسی شب تیز ہوا چلتی تو آپ ﷺ بے قرار ہوکر مسجد میں تشریف لے جاتے، اور جب تک ہوا تھم نہ جاتی، خدا کے حضور سجدہ ریز رہتے، سورج گہن یا چاند گہن لگتا تو جب تک گہن ختم نہ ہوجائے، نماز میں مشغول ہوتے، (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۲۰۶۹) حضرت انس ؓ کے زمانہ میں ایک بار سخت تاریکی چھاگئی، ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا کبھی حضور ﷺ کے زمانہ میں ایسی باتیں پیش آتی تھیں؟ حضرت انس ؓ نے فرمایا: معاذ اللہ! اس وقت تو ہوا بھی تیز چلتی تو ہم لوگ قیامت کے خوف سے مسجد کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ (مجمع الزوائد: بحوالہ ابوداؤد؟ حدیث نمبر: ۲۰۶۸)

لیکن ہمارے ضعفِ ایمان کا حال یہ ہے کہ زلزلہ سے ہمیں بھی خوف ہوتا ہے، لیکن نہ اللہ کا اور نہ قیامت کا، صرف یہ ڈر ہوتا ہے کہ گھر گر جائیں گے، جانیں جاسکتی ہیں، مال ضائع ہوسکتا ہے، یعنی اصل میں مومن کو جس بات کا خوف ہونا چاہئے، اس کا تو دل میں خیال بھی نہیں گذرتا، لیکن ان آنی جانی اور زائل وفانی چیزوں کا خوف مسلط رہتا ہے، جن سے مومن کے دل کو آزاد رہنا چاہئے، اسی لئے زلزلہ کے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ تنہا تنہا دو دو یا چار چار

رکعت نماز پڑھی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں پر خوب گڑ گڑایا جائے، علامہ شرنبلالی بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

وکالصلاۃ فرادی لحصول ؟ والفزع بالزلازل والصواعق و انتشار الکواکب و الضوء الھائل لیلا والثلج والامطار الدائمۃ و عموم الامراض والخوف الغالب من العدو و نحو ذلک من الافزاع والاھوال ، لانھا آیات مخوفۃ للعباد لیترکوا المعاصی و یرجعو الی طاعۃ اللہ تعالیٰ التی بھا فوزھم و صلاحھم واقرب احوال العبد فی الرجوع الی ربہ الصلاۃ ،

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی:۲۹۹)

اور تنہا تنہا نماز پڑھی جائے گھبراہٹ کے موقع پر، گھبرا دینے والی باتوں سے مراد زلزلے، بجلیوں کی مسلسل کڑک، تاروں کا ٹوٹنا، رات میں تیز روشنی کا نمودار ہونا، ژالہ باری، مسلسل بارش، امراض کا پھیلنا اور دشمن کا سخت خوف وغیرہ ہیں، جو بندوں کو ڈرانے کے لئے ہیں، تاکہ وہ گناہ چھوڑ دیں، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کا راستہ اختیار کریں، جس میں ان کی کامیابی اور صلاح ہے، اور بندہ کے لئے اپنے رب سے رجوع کرنے کی سب سے قریبی حالت نماز ہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی زلزلہ کے موقع پر جماعت کے بغیر تنہا تنہا نماز پڑھنا ثابت ہے، چنانچہ حنفیہ کے علاوہ شوافع اور حنابلہ بھی اس موقع پر نماز پڑھنے کے قائل ہیں، (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۳۹۷) ___ اس لئے اول تو دعاء کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایسی آزمائشوں سے حفاظت فرمائے، لیکن اگر کبھی خدانخواستہ ایسی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ خدا کی طرف سے آنے والی آفتوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

ادھر زلزلہ کے واقعات کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے، جاپان، ترکی، ایران اور امریکہ وغیرہ میں چار پانچ سال کے وقفہ سے ایسے تہلکہ خیز اور چشم ہائے بصیرت کے لئے عبرت انگیز زلزلہ کے واقعات سامنے آتے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ان کے تصور سے بھی

کلیجہ منہ کو آتا ہے، ماضی میں عالم اسلام میں اس طرح کے جو بھیانک واقعات پیش آئے ہیں، ۱۳۵۲ھ کے زلزلۂ بہار کے موقع سے مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس پر ایک نہایت ہی وقیع مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا، جس میں تاریخ الخلفاء (تالیف: علامہ سیوطی) اور بعض دوسری کتابوں کے حوالہ سے ان واقعات کو یکجا کیا گیا ہے، اس میں زلزلہ کے علاوہ دوسرے سماوی اور کائناتی حوادث کا بھی ذکر ہے، یہاں خاص زلزلہ کے متعلق واقعات کا ذکر مناسب ہوگا۔

- ۱۳۰ اور ۱۳۱ھ میں دمشق میں نہایت تباہ کن زلزلہ آیا۔
- ۱۸۰ھ میں مصر میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ اسکندریہ کا مستحکم مینارہ بھی منہدم ہوگیا۔
- ۲۰۳ھ میں خراسان اور بلخ میں ایسا زلزلہ آیا کہ ان شہروں کی ایک چوتھائی آبادی نیست و نابود ہوگئی۔
- ۲۳۳ھ کے ہولناک زلزلہ میں انطاکیہ کا شہر تباہ ہوگیا، اور موصل میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۲۴۵ھ میں ایک عالمگیر زلزلہ آیا، جس سے بڑے بڑے قلعے اور پل تباہ ہوگئے، انطاکیہ کا ایک پہاڑ سمندر میں جا گرا، اور مکہ معظمہ کی نہروں کا پانی خشک ہوگیا۔
- ۲۸۰ھ میں شام کے شہر دیبل میں ایسا زلزلہ آیا کہ صرف شکستہ مکانوں کے ملبہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار لاشیں برآمد ہوئیں۔
- ۳۴۴ھ میں مصر میں ایک خوفناک زلزلہ آیا، جس کا اثر تین گھنٹے تک جاری رہا۔
- ۳۴۶ھ کو ایشائے کوچک کے علاقہ میں زلزلہ نے بڑی تباہی مچائی، علاقۂ رے کے ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں دھنس گئے، طالقان کی آبادی لاکھوں میں تھی، صرف تیس آدمی بچے، زمینیں ایسی پھٹیں کہ مردوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔
- ۴۸۰ھ کو رملہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ کنوؤں کے منڈیروں سے پانی ابل آیا، اور پچیس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۵۲۹ھ کو بغداد اور اسکے مضافات میں تقریباً بیس دن طوفان، بجلی اور زلزلوں

کا سلسلہ رہا۔

○ ۵۳۳ھ میں 'کستر' نامی شہر زلزلہ میں زمین کے اندر دفن ہوگیا، اور اس کی جگہ پانی کی ایک جھیل نمودار ہوگئی۔

○ ۵۴۴ھ میں بغداد میں ایسا زلزلہ آیا کہ حلوان نامی جگہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔

○ ۱۰۰۴ھ کو جزیرۂ صقیلہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ زمین پھٹی اور کئی نہریں نکل آئیں، تیز تقریباً ساٹھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

○ ۹۰۵اھ میں ۱۴؍اپریل کو قسطنطنیہ میں ایسا زلزلہ آیا جس کا اثر پینتالیس دنوں تک محسوس کیا گیا، اس میں ایک سو نو مسجدیں بھی شہید ہوگئیں۔

○ ۱۱۱۱ھ کو جاوا میں ایسا زلزلہ آیا کہ پندرہ پہاڑ غرقاب ہوگئے۔

○ ۱۲۴۹ھ میں بہار اور نیپال کے علاقہ میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ نیپال کے پہاڑ پر ایک مندر تھا، وہ پہاڑ مندر سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس جگہ پانی کا تالاب بن گیا (ملخص از: مقالات سجاد: ۵۷۔۱۳۹) __ خدا کی طرف سے یہ تنبیہ کے یہ چند نمونے ہیں، جن کے نقوش تاریخ کی پیشانی پر محفوظ ہیں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح کے کتنے واقعات اس کائنات میں پیش آتے ہوں گے، چند سال پہلے لاتور اور عمرگہ کے علاقہ میں جو ہولناک اور دل کو دہلا دینے والا حادثہ پیش آیا وہ تو گویا کل کی بات ہے، لیکن کیا قدرت کی ان تنبیہات کا ہمارے دل و دماغ نے بھی کوئی اثر لیا ہے؟ اور ہماری عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے کوئی تبدیلی آئی ہے؟

(۲۲؍ستمبر ۲۰۰۰ء)

گجرات کا زلزلہ اور ہمارا فریضہ

گجرات کا زلزلہ ایک طرف ہمیں اپنے احتساب کی دعوت دیتا ہے، تو دوسری طرف ہمیں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد اور خدمت کی طرف متوجہ کرتا ہے، احتساب کی طرف اس لئے کہ یہ اور اس طرح کی قدرتی آفتیں اللہ کے غضب کی مظہر ہوتی ہیں، قرآن مجید نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر بہ طور عذاب زلزلہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> کیا بستیوں والے اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آپہونچے، جب وہ سوتے ہوئے ہوں؟ یا کیا وہ اس بات کا ڈر نہیں رکھتے کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپہونچے، جب وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں، (الاعراف: ۹۷، ۹۸)

اس آیت میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے عام اوقات یہی دو ہیں، رات، اور دن چڑھتے، رات کا وقت غفلت کا ہوتا ہے، اور دن چڑھتا وقت غافلوں کے لئے لہو و لعب اور عیش و عشرت کا، پھر قرآن ہی کے بیان پر غور کیجئے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کے جادوگروں نے استفسار کیا کہ کون سا وقت ہوگا جس میں ہم اپنی سحر طرازیوں کا نمونہ اور آپ اپنے خیال کے مطابق خدا کی نشانی پیش کریں گے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: موعدکم یوم الزینۃ (طٰہٰ: ۵۹) یعنی یہ وقت وہ دن ہوگا جو دن تمہارے جشن و سرور کا ہے، جس دن تم جشن مناتے ہو، اسی دن خدا کی نشانی ظاہر ہوگی، گویا بعض دفعہ انسان کی توجہ کو بڑھانے اور نقوش عبرت کو نمایاں کرنے کی غرض سے ایسے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس قوم کے لئے یوم جشن ہو۔

اب دیکھئے کہ چند سال پہلے لاتور اور عثمان آباد میں عین گنپتی کے دن رات کے وقت تباہ کن زلزلہ آیا، اور معلوم ہے کہ اس علاقہ میں گنپتی برادرانِ وطن کا سب سے بڑا تہوار اور اجتماع کا موقع ہوتا ہے، دوسری طرف گجرات میں صبح چڑھتے عین یوم جمہوریہ کو زلزلہ نے آدبوچا، اور ۱۵ راگست ۱۹۵۰ء کے زلزلہ کی یاد تازہ کردی، نگاہ عبرت وا کیجئے اور قرآن کے پس منظر میں اس واقعہ کو دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ایک پکڑ اور تنبیہ ہے، جیسے استاذ ایک طالب کی سرزنش کرتا ہے، تاکہ وہ دوسروں کے لئے سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بنے، اور عدالت ایک مجرم کو سزا دیتی ہے، کہ وہ دوسرے مجرم کے لئے مایۂ عبرت ہو جائے، اسی طرح رب کائنات کسی قوم کے کچھ لوگوں کو اپنے غضب سے دوچار کرتا ہے، تاکہ دوسرے لوگ اپنی زندگی کا محاسبہ کریں اور غفلت شعاری سے باز آئیں، اگر ایسے واقعات کو لوگ محض ایک اتفاقی اور طبعی واقعہ کہہ کر گذر جائیں تو اس سے زیادہ کوئی بات افسوس ناک نہ ہوگی، اس سے بڑھ کر کون شخص محروم ہوگا کہ چراغ جلے اور وہ اپنی آنکھیں بند کرلے، خطرہ کی گھنٹی بجے اور وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لے؟ اور کوئی تنبیہ بھی اس کے غفلت شعار دل کو جنبش دینے میں کامیاب نہ ہو؟؟

یہ اس حادثہ کا ایک پہلو ہے، — دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنا کر پیدا کیا ہے کہ دوسرے انسانوں کی شرکت کے بغیر اس کی مسرت میں بھی کوئی لطف نہیں، اور جیسے وہ خوشی میں دوسرے کا محتاج ہے، مصیبت میں اس سے زیادہ دوسرے کا محتاج ہوتا ہے، زلزلہ آئے، سیلاب آئے، تباہ کن طوفان آجائے، وبائی امراض پھیل جائیں، ایسے موقع پر بیک وقت ہزاروں افراد مصیبت اور پریشانی سے دوچار رہتے ہیں، اس لئے ان مواقع پر تعاون کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

اسلام نے ایسے حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ قوم کے لئے ابرِ رحمت ثابت ہوں، اور مصیبت زدہ انسانوں کو اپنے دامن محبت میں جگہ دے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اس خصوصی وصف کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں: وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد: ۱۷) اس ارشادِ ربانی

میں اس بات کی طرف بلیغ اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو جن لوگوں سے ایذا پہونچتی ہو، امن کے مقابلہ میں بھی صبر کی راہ اختیار کرے، اور ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ رحم دلی اور مہربانی کا ہو، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، بلکہ چوں کہ غیر مسلموں سے اذیت پہونچنے کا امکان زیادہ تھا، اس لئے عجیب نہیں کہ اس آیت میں ان ہی حضرات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو، کیوں کہ صبر کی ضرورت ایسے ہی حق ناشناس بھائیوں کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم کا فرق کئے بغیر اس بات کی تلقین کی ہے کہ فاقہ کے دنوں میں بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، قرابت دار یتیموں کا خیال رکھا جائے، اور خاکسار مسکین کی رعایت کی جائے (البلد: ۱۴۔۱۶) قدرتی آفات کے نتیجہ میں کتنے ہی لوگ فاقوں سے دوچار ہوتے ہیں، بچے یتیمی کا داغ سہتے ہیں، اور کل کے دولت مند آج کے مسکین ٹھہرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ مصیبت زدہ لوگ بھی شامل ہیں، قرآن ہی میں قیدیوں کو کھانا کھلانے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی حکم آیا ہے، (الدہر: ۸) اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قید میں مشرکین ہوا کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ ''اسیر'' سے مراد وہ مشرکین ہیں، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں، (قرطبی: ۱۹؍۱۲۹) اس سے معلوم ہوا کہ جو غیر مسلم بھائی مشکل حالات میں ہوں، ان کی ضرورت پوری کرنا بھی اجر و ثواب کا باعث ہے، چنانچہ اس نصیحت کا صحابہ ﷺ پر یہ اثر ہوا کہ غزوۂ بدر کے موقع سے رسول ﷺ نے جن قیدیوں کو مسلمانوں کے حوالہ کیا، ان کا بیان تھا کہ مسلمان خود تو محض کھجور کھا کر رہ جاتے، اور ہمیں صبح و شام روٹی کھلاتے، اور روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، ان کے اس ایثار کی وجہ سے ہمیں حیاء محسوس ہوتی تھی، (سیرت ابن ہشام: ۲؍۲۵۷۔۲۵۶) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور اس میں مسلمان اور غیر مسلموں کی کوئی تفریق نہیں کی، مفسرین بھی یہی لکھتے ہیں کہ اس میں مسلمان اور کافر سب شامل ہیں، اور ہر پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک مستحب ہے (قرطبی: ۵؍۱۸۴) قتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے

بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا کافروں پر بھی انفاق کیا جا سکتا ہے؟ اسی کے جواب میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر: ۲۷۲ نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ ان کی ہدایت تمہارے ذمہ نہیں ہے، رہ گیا خرچ کرنا تو تم جو بھی خرچ کروگے اس کا تمہیں پورا بدلہ ملے گا، اور تمہارے ساتھ کوئی حق تلفی نہیں ہوگی (تفسیر: ۵۸۸/۵)

چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے یہودی قرابت دار کے لئے متروکہ کے کچھ حصہ کی وصیت کی تھی، (سنن دارمی، باب الوصیۃ لاھل الذمۃ) خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی حُلّہ عطا فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے کہ آپ ﷺ نے تو ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے پہننے کے لئے نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ اس سے کسی اور طرح فائدہ اٹھاؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جوڑا اپنے ایک بھائی کو جو مشرک تھے اور مکہ میں مقیم تھے، تحفۃً بھیج دیا، (بخاری، باب الہدیۃ للمشرکین)

اگر غیر مسلموں پر کوئی مصیبت آتی تو خاص طور پر ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے، چنانچہ جب مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوئے، تو حالاں کہ اس وقت اہلِ مکہ کی مسلمانوں سے عداوت اپنے شباب پر تھی، لیکن آپ نے سردارانِ کفار ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو پانچ پانچ سو درہم بھیجے، کہ وہ اسے مکہ کے ضرورت مند اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیں، رسول اللہ ﷺ کے اسی عمل سے استدلال کرتے ہوئے امام محمد کہتے ہیں کہ کافر خواہ حربی ہو یا ذمی، یعنی مسلمانوں کے ساتھ اس کی صلح ہو یا نہ ہو، اس کا مالی تعاون کرنے میں حرج نہیں، لا باس للمسلم ان یعطی کافرا حربیا او ذمیا۔ (ردالمحتار: ۳۰۲/۳)

اس لئے مصیبت کی اس گھڑی میں مذہب وملت کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کی مدد کے لئے آگے آنا، ہر مسلمان کا فریضہ ہے، اس سے جہاں انسانی خدمت اور انسانی ہمدردی کا فریضہ ادا ہوگا وہیں برادرانِ وطن سے تعلقات استوار ہوں گے، غلط فہمیاں دور ہوں گی، نفرت اور شکوک وشبہات کی جو کھیتی فرقہ پرستوں نے برادران وطن کے دلوں میں

بوئی ہے، اس کی بیخ کنی ہوگی، محبت اور اعتماد کے پھول کھلیں گے، ارتباط بڑھے گا، اور دعوت کے مواقع پیدا ہوں گے، گجرات وہ جگہ ہے جو اس وقت پورے ملک میں فرقہ پرستی کا مرکز ہے، اقلیتوں کے خلاف جو بھی منصوبے بنتے ہیں پہلے گجرات اور اتر پردیش میں ان کا تجربہ کیا جاتا ہے، اڈوانی جی کی رتھ یاترا یہیں سے شروع ہوئی، اور اس وقت اس صوبہ میں کتنی ہی مسجدیں ہیں، جو نمازیوں کو ترس رہی ہیں، اور برادرانِ وطن کا ان پر غاصبانہ قبضہ ہے، لیکن زلزلہ کے موقع سے مسلمان نوجوانوں نے جس ایثار اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا اس نے پتھر کو پگھلایا، اور ایک حد تک نفرت کی آگ کو بجھایا ہے، یہاں تک کہ احمد آباد میں ایک مسجد جو حساس غیر مسلم آبادی کے درمیان تھی اور مسلمان وہاں جاکر نماز پڑھنے سے قاصر تھے، خود غیر مسلم بھائیوں نے اسے دھویا، صاف ستھرا کیا، اور مسلمانوں کو مسجد آباد کرنے کی دعوت دی، یہ معمولی اور وقتی اخلاق کا کرشمہ ہے، اگر ہم ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے اور خدمتِ خلق کا کام کرتے ہوئے اپنے غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات استوار کریں، اور انسانی اخوت کے رشتہ کو ان پر واضح کریں تو ہندوستان جیسے ملک میں دعوتِ دین کے وسیع مواقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اور نفرت کا جو آتش فشاں یہاں سلگایا جا رہا ہے، ہم محبت کی شبنم سے اسے بجھا بھی سکتے ہیں؟؟

اپنی عیال کو آگ سے بچایئے !

انسان پر جیسے دوسروں کے حقوق ہیں، اسی طرح اس پر خود اپنی ذات کا، اپنے بال بچوں اور اپنے عزیزوں کا بھی حق ہے، بلکہ یہ حق نسبتاً زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے اور آخرت میں اس کے بارے میں جواب دہی بھی زیادہ ہے۔ انسان پر اس کی ذات کے اور اس کے اہل وعیال کے کیا حقوق ہیں اور اپنے زیر پرورش لوگوں کے تئیں اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ قرآن و حدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے۔ یہ حقوق انسان کی مادّی ضروریات سے متعلق بھی ہیں اور اس کی دینی اور اخروی حاجات سے متعلق بھی اور یقیناً اس کی دینی حاجات سے متعلق حقوق زیادہ اہم ہیں، کیوں کہ مادی ضرورتوں کا تعلق تو ایسے مستقبل سے ہے جو چند سالہ ہے اور جس کی انتہاء قبر کی منزل پر ہو جاتی ہے، لیکن دینی اور اخروی ضرورتیں ایسے مستقبل سے متعلق ہیں، جن کی کوئی نہایت نہیں، اس لئے ایک صاحبِ ایمان جو آخرت میں جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اور جو اس دنیا پر یقین کرتا ہو، یقیناً اس وسیع اور نہ ختم ہونے والے مستقبل سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید نے انسان کو اسی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے، کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ ''قُوا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا (التحریم:٦) یہ آگ سے بچانا کیونکر ہوگا؟ ایمان اور عملِ صالح کے ذریعہ، ایمان کیا ہے؟ قرآن وحدیث میں جن جن باتوں کا ذکر آیا ہے، ان سب کو ماننا اور بے کم وکاست ان کا یقین کرنا۔ ایمان صرف کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں، اگر ایک شخص اپنی زبان سے توحید کا اقرار کرتا ہو اور قرآن کے کسی حکم کا انکار بھی، رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، لیکن آپ ﷺ کی کسی سنت کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہ کرتا ہو، آپ کو نبی مانتا ہو لیکن آپ ﷺ کے بعد

کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہو، تو بظاہر وہ صاحبِ ایمان محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کفر کی راہ پر ہے۔ ایمان کا مسئلہ بہت نازک ہے، بعض اوقات انسان ہنسی مذاق میں، غیظ وغضب اور ضد وعناد میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو اسے دولتِ ایمان سے محروم کردیتی ہیں اور اسے خبر تک نہیں ہوتی، ظاہر ہے اس نادانستہ خسران ومحرومی سے بچنے کے لئے ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے علم کے زیور سے آراستہ اور احکامِ دین سے واقف ہونا، بے علمی اور نا آگہی وجہالت ونادانی انسان کو راہِ حق سے دور لے جاتی ہے اور گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

آگ سے بچنے کے لئے دوسری ضروری چیز عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے معنی اچھے کام کے ہیں۔ کوئی کام اس وقت اسلام کی نگاہ میں عملِ صالح بنتا ہے جب اس میں تین باتیں پائی جائیں، اوّل وہ حکم خداوندی کے مطابق ہو، دوسرے اس عمل کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر انجام دیا جائے، تیسرے: اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور رضا کا حاصل کرنا ہو، شہرت ونا موری، عہدہ وجاہ اور دنیا طلبی مقصود نہ ہو، اگر یہ تینوں باتیں جمع ہوں تو وہ عمل صالح ہے اور ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ پائی جائے تو وہ عمل صالح نہیں۔ ظاہر ہے کہ عمل صالح کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کے لئے قدم قدم پر علم کی ضرورت ہے، ایک وضو اور نماز ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس سے متعلق کتنے مسائل واحکام ہیں؟ انسان بوڑھا ہو جائے اور اپنی پوری عمر طے کرلے پھر بھی ان مسائل کا احاطہ نہیں کر پاتا، ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، اہلِ علم سے استفسار کرنا پڑتا ہے، بلکہ خود اصحابِ علم بھی ایک دوسرے سے رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، فقہ کا ایک سمندر بیکراں ہے جو انہی اعمال صالحہ کی تشریح وتوضیح سے عبارت ہے۔

غرض انسان کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو آخرت کی آگ سے بچانے اور جہنم کی بھٹی سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ ایمان اور عملِ صالح ہے اور ایمان ہو یا عملِ صالح، جب تک دین کا علم نہ ہو، احکامِ شریعت سے آگہی نہ ہو، کتاب وسنت سے واقفیت اور دین کا فہم نہ ہو، حاصل نہیں ہوسکتا اور ایمان وعمل کا حق جہل ونا آگہی کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے ہر مسلمان کے لئے اپنی ضروریات کے مطابق علم دین کا حصول فرائض میں سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے بہ وضاحت ارشاد فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، طلب العلم فریضة علی کل مسلم ،شاید ہی دنیا کے کسی مذہب میں علم کی یہ اہمیت ظاہر کی گئی ہو۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں اور کوئی علم داخل ہو یا نہ ہو، علمِ دین تو ضرور ہی داخل ہے، کیوں کہ یہ ایسا فریضہ ہے کہ جس کے بغیر دین کا کوئی فرض ادا ہو ہی نہیں سکتا، وضو اس لئے فرض ہے کہ اس سے نماز ادا کی جائے ،حرمین شریفین کا سفر اس لئے فرض ہے کہ حج کی ادائے گی ہو سکے، تو علم سے تو تمام ہی فرائض متعلق ہیں، نماز و روزہ حج و زکوٰۃ ، نکاح و طلاق ،حلال و حرام ،خلوت و جلوت اور رزم و بزم ،کون سی جگہ ہے اور کون سا موقع ہے جہاں انسان علم کا محتاج نہ ہو، اس لئے علم دین اہم ترین فریضہ ہے ، ایسا فریضہ کہ جس پر تمام فرائض کی ادائے گی منحصر ہے۔

اس لئے یقیناً قرآن مجید نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانے کا حکم دے کر بالواسطہ علم کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، ہمارے سرکاری نظام تعلیم میں آزادی کے بعد ہی سے ہندو تہذیب کی چھاپ ڈالنے کی کوشش رہی ہے، لیکن اب یہ کوشش بے لباس اور تیز رفتار ہے، مسلمان بچوں کو مشرکانہ فکر سے مانوس کیا جا رہا ہے، دیویوں اور دیوتاؤں کا تقدس ان کے ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے، ہندو بزرگوں کی عظمت ان کے قلوب میں راسخ کی جاتی ہے، مسلمانوں کی تاریخ کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اور اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کی عظمت نئی نسل کے دل سے نکل جائے۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے دینی تعلیم کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔

دینی تعلیم کا ایک درجہ تو ضروریاتِ دین کی تعلیم کا ہے۔ یہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، ہمارے جو بچے عصری درسگاہوں میں زیرِ تعلیم ہیں، ان کے لئے بھی قرآن مجید کا

با تجوید ناظرہ، کچھ سورتوں کا حفظ، رسول اللہ ﷺ کی سیرت، ضروری فقہی مسائل اور شب و روز کے مختلف احوال سے متعلق جو ادعیہ واذ کار منقول ہیں، ان کا یاد کرانا تو ہر مسلمان بچے کے لئے ضروری ہے، اب اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہوگئی ہے کہ ان کو اسلام کی اور مسلمانوں کی تاریخ بھی پڑھائی جائے، تاکہ وہ احساسِ کمتری سے بچ سکیں اور اسلام پر مغربی مصنفین اور ان سے متاثر ہو کر مشرق کے اہلِ علم جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے جواب میں بھی رہنمائی کی جائے، تاکہ غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے دامِ ہم رنگِ زمین سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

علمِ دین حاصل کرنے کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ امت میں کچھ لوگ قرآن وحدیث کا تفصیلی علم حاصل کریں، کتاب وسنت پر ان کی گہری نگاہ ہو فقہِ اسلامی پر ان کی وسیع نظر ہو۔ ایمانیات اور عقائد کی گہرائیوں تک ان کی رسائی ہو، ہر عہد میں اسلام کے خلاف جو فتنے کھڑے ہوں، وہ ان کے مقابلہ کی صلاحیت کے اہل ہوں، وہ اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں اور اپنے عہد کے پیدا ہونے والے مسائل کو فراستِ ایمانی کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں حل کریں۔ یہ امت پر فرضِ کفایہ ہے، جیسے کسی ملک کی سرحد پر فوج کا دستہ کھڑا رہتا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس پر مفت میں کثیر اخراجات ہو رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ ملک کے سب سے بڑے محسن اور اس کی سلامتی کے ضامن ہیں، یہی مقام فکری اعتبار سے کسی بھی سماج میں علماءِ دین کا ہے، یہ ہمارے معنوی وجود، ہمارے فکری تشخص اور ہمارے تہذیبی امتیازات کے محافظ ہیں، کسی سماج میں اگر کوئی عالم نہ ہو تو کافرانہ طاقتیں علانیہ یا نادانستہ ان کو اُچک سکتی ہیں، عالم ممکن ہے عمل کے اعتبار سے کوتاہ ہو، لیکن انشاء اللہ وہ کسی گمراہی کے بارے میں غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا اور پروپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہوسکتا، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی خاندان ایسا نہ ہو جو عالمِ دین سے خالی ہو، یہ انشاء اللہ اس پورے خاندان کے لئے حفاظتِ دین کی ضمانت ہے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے ایسا سوچ لیا ہے کہ یہ عظیم الشان علم صرف غریب اور

پسماندہ مسلمانوں کے لیے ہے، مسلمانوں میں مرفہ الحال اور اصحاب ثروت کا طبقہ علم دین کی طرف سے بالکل ہی بے توجہ ہے۔ بلکہ وہ اسے حقارت اور کمتری کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ نہایت ہی افسوس ناک بات ہے۔ یہ سمجھنا تو درست نہیں کہ یہ غریب طلبہ، کند ذہن اور فکری اعتبار سے مفلس ہوتے ہیں، کیوں کہ ذہانت کا دولت وغربت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ تجربہ یہ ہے کہ غریب ماحول کے بچے علم کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں، چنانچہ اس وقت آئی اے ایس اور اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں زیادہ تر اسی طبقہ سے طلبہ کامیابی حاصل کر رہے ہیں، لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جو طالب علم معاشی اعتبار سے پست ماحول سے اٹھتا ہے، وہ بہرحال نفسیاتی اعتبار سے احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے اور سماج میں جو مرفہ الحال طبقہ ہے، اس سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتا، اس سے سماج میں کچھ لوگ دینی رہنمائی اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح سے محروم رہتے ہیں۔ اگر سماج کے معزز سمجھے جانے والے لوگ علم دین حاصل کریں تو وہ اپنے طبقہ کے لوگوں سے آنکھیں ملا کر باتیں کر سکیں گے اور بے جھجک اسلامی تعلیمات کو ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے معزز اور مرفہ الحال لوگ علمِ دین کی طرف متوجہ ہوں اور اس علم کو حاصل کرنے میں آگے آئیں۔

قابلِ فکر امر یہ ہے کہ آخر علمِ دین کی طرف سماج کے اونچے طبقے کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ حالاں کہ ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں تہذیب و شائستگی اور بڑوں کی توقیر، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، اپنے پرائے کے ساتھ حسنِ سلوک، نگاہ اور زبان کی حفاظت اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہی کے احساس کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، لیکن کیا بات ہے کہ اس کے باوجود علم کا یہ شعبہ لوگوں کے التفات سے محروم ہے؟؟۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ دین اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کم ہیں، ان کو کم تنخواہوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہی ایک بات ہے جس نے مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن کے حاملین کو علم دین کی طرف آنے سے روکا ہوا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کیا کھائیں گے؟

اور کیوں کر زندگی گذاریں گے؟

اس سلسلہ میں مسلمان سماج کے لئے دو باتیں قابل توجہ ہیں: اوّل یہ کہ کیا مسلمانوں کا معاشرہ اپنے دینی تحفظ کے لئے ایک ایسے طبقہ کی صحیح طریقہ پر کفالت نہیں کر سکتا جن کی تعداد بہ مشکل ایک فی ہزار ہوگی؟ اگر مسلمان اپنی دوسری ضروریات کی طرح دینی خدمت گذاروں کو بھی اپنے لئے ایک ضرورت باور کریں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کے تعاون کے لیے ہاتھ بڑھائیں اور خادمین دین کو کم سے کم معاشی اعتبار سے اس لائق بنائیں کہ وہ متوسط طریقہ پر سماج میں اپنی زندگی بسر کر سکیں، تو یقیناً اس علم سے بے اعتنائی اور بے رغبتی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں ہے، بعض وہ قومیں جو باطل فکر و نظر کی حامل ہیں، اپنے مذہب اور مذہبی شخصیتوں کے لئے کل آمدنی کا دس فیصد وقف کی ہوئی ہیں، مسلمان اتنی بڑی قوم ہے کہ اگر وہ آمدنی میں دین کے خدمت گذاروں کے لیے ایک فی صد بلکہ نصف فی صد بھی حصہ مقرر کر لیں تو ان کے ائمہ، مؤذنین، علماء اور دینی کام کرنے والے بہتر حالات میں اپنی زندگی گذار سکتے ہیں اور بعض اوقات غربت و احتیاج کی وجہ سے اس طبقہ میں جو دناءت اور پستی کی بعض باتیں پیش آتی ہیں، ان کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ کاش! مسلمان اس پہلو سے غور کریں، کہ خادمینِ دین کے وقار کو بلند کرنا دراصل خود دین کے وقار کو بلند کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں معیشت کا علم سے کچھ زیادہ ربط نہیں ہے، ہمارے اسی شہر میں کتنے لوگ ہیں جو نشانِ ابہام سے کام چلاتے ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کے ملازم ہیں اور دولت ان کے قدموں میں نثار ہے، کتنے انجینئر بیکار ہیں، اور کتنے ڈاکٹر بے روزگار ہیں اور کتنے قانون داں مؤکل کی تلاش میں خاک چھانتے نظر آتے ہیں، اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر ایک شخص علم دین حاصل کرے گا تو بھوکا مرے گا اور دوسرے علوم حاصل کرے گا تو اس کے گھر میں ''من'' برسنے لگیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزاق اور روزی رساں ہیں، چاہیں تو پڑھے لکھے لوگوں کو محروم رکھیں اور چاہیں تو جاہلوں کو سرفراز فرمادیں، پھر یہ ایک نظریہ نہیں، بلکہ تجربہ اور آزمودہ حقیقت ہے

کہ جولوگ اللہ کے دین کے کام میں مشغول ہیں، اللہ ان کو ضائع نہیں کرتا اور غیب سے ان کی کفالت کا سروسامان کرتا ہے۔ آخر اسی معاشرہ میں وہ دینی تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہیں جو خوش پوش بھی ہیں، باعزت طریقہ پر اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے امت کے دل میں ان کی محبت اس طرح ڈال دی ہے کہ مشکل مواقع پر بلا کہے سنے اور بلا طمع واشراف وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اس لیے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے۔ اگر ایک مسلمان میں اللہ کی رزاقیت کا یقین بھی نہ پیدا ہو، تو یہ کیسا کھوکھلا اور بے روح ایمان ہے؟

پس ہندوستان کے موجودہ حالات میں اور عالمی حالات کے پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کی اہمیت کی طرف متوجہ ہوں۔ آج ہمارے ملک میں مدارس اسلامیہ کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، عالمی سطح پر بھی ان کو بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا مرکز قرار دیا جارہا ہے، یہ سب ان لوگوں کی زبان ہے کہ اسلام سے جن کی عداوت ظاہر و باہر ہے۔ اعداءِ اسلام کا یہ رویہ سرمایہ عبرت ہے، جو لوگ حق و راستی کے دشمن ہوں، وہ تو مدارس کی اہمیت کو سمجھ لیں کہ جو لوگ صاحبِ ایمان اور اسلام کے نام لیوا ہیں، وہی اسلام کی حفاظت اور اس کی بقا میں مدارس کی کردار کی اہمیت کو نہیں سمجھیں، اس سے زیادہ قابلِ افسوس اور کیا بات ہوگی؟

اولاد کی فکر کیجئے!

انبیاء ورسل میں ایک اہم ترین ہستی سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی گویا دنیا کی آبادی کا قریب قریب تین چوتھائی حصہ آپ کی عظمت پر متفق ہے، اور آپ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ صرف خود نبی تھے، بلکہ ابوالانبیاء تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام بھی نبی تھے، پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہوئے، حضرت یوسف علیہ السلام بھی نبی بنائے گئے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند تھے، یہی حضرت یعقوب جن کے آباء واجداد تین پشت سے پیغمبر تھے، اور آئندہ بھی بنی اسرائیل کے تمام انبیاء آپ ہی کی نسل میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید نے ان کی وفات کا واقعہ ذکر کیا ہے، جو اس طرح ہے:

> ''کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب پر موت آئی؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے دریافت کیا: تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم آپ کے رب اور آپ کے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے رب کی — جو ایک ہی معبود ہے — کی عبادت کریں گے، اور اسی کے فرماں بردار ہو کر رہیں گے، یہ کچھ لوگ تھے جو گذر چکے، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی پوچھ نہیں ہوگی۔ (البقرۃ:۱۳۴)

یہ آیت بہ ظاہر حیرت میں ڈالتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جیسی شخصیت جن

کے یہاں چار پشتوں سے نبوت چلی آرہی تھی، جن کی اولاد میں بھی نبی تھے، اور آئندہ سلسلۂ اولاد میں بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء کو پیدا ہونا تھا، ایسا شخص اپنی موت کے وقت اس بارے میں فکر مند ہے کہ خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ کس کی پرستش کریں گے؟ جب ان کے بچے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ توحید، تعلق مع اللہ اور خدا کی اطاعت و فرماں برداری کے رویہ پر قائم رہیں گے، تو اب ان کو اطمینان ہوتا ہے، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس میں امتِ مسلمہ کے لئے حیرت و موعظت کا سامان ہے، کہ ایک صاحب ایمان کو کبھی بھی اپنے بچوں کی دینی کیفیت کے بارے میں غافل نہ ہونا چاہئے۔ جیسے ایک تاجر چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تجارت چھوڑ کر جائے، جیسے ایک کارخانہ دار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے صنعت کے میدان میں ترقی کریں، جیسے ایک ملازم کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے بچے اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوں، بلکہ انسان کا بس چلے تو وہ آئندہ کے لئے سات پشتوں کی معیشت کا انتظام کر جائے، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ایک مسلمان کو اپنی اولاد کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے کہ ایمان اور عمل صالح کے اعتبار سے اس کی اولاد صحیح راہ پر گامزن ہو۔ اور وہ خدا کی پرستار اور اس کی فرماں بردار ہو۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کتنا بھی دین دار خاندان ہو، خاندان میں علماء اور حفاظ ہوں، دین کی دعوت و اشاعت کا کام کرنے والے لوگ ہوں، اسلامی شعور رکھتے ہوں، لیکن اپنی اولاد کی طرف سے مطمئن نہ رہیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ بہر حال دین پر قائم رہیں گے، کیوں کہ انبیاء سے بڑھ کر خدا ترس خانوادہ اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انبیاء اپنے خاندان اور اہل و عیال کے بارے میں کبھی بے فکر نہیں رہے، خود پیغمبر اسلام ﷺ اپنی پھوپھی اور اپنی صاحبزادی کو خطاب کرکے فرماتے کہ آخرت سے پہلے کچھ کرلو، ورنہ مجھ سے قرابت بھی تم کو کام نہیں آئے گی۔ اسی لئے قرآن مجید نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد متنبہ فرمایا ہے کہ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے، اور تم بھی گو انہیں کی نسل سے ہو، لیکن تمہارے بارے میں فیصلہ

تمہارے اعمال کے مطابق ہوگا۔

جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جن کا یقین اس بات پر ہے کہ یہی دنیا آخری دنیا ہے، وہ اگر اپنے بال بچوں کے لئے صرف مال ومتاع اور سیم وزر کی فکر کریں، تو مقام تعجب نہیں کہ ان کے نزدیک تو اس مادی دنیا کے آگے کوئی منزل ہی نہیں، لیکن اگر مسلمان ہمیشہ بھی اسی راہ پر چلیں، تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی مسافر راستہ کو اپنی منزل سمجھنے لگے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس وقت ہم لوگوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے، ہمارے بچے بہت ہی نوعمری میں مشنری اسکول یا ان کے طرز پر چلنے والے دوسرے اسکولوں کے حوالے کردئے جاتے ہیں، یا جو عام طور سے دین سے بالکل بے بہرہ اور اپنی تاریخ سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں، مزید بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مادری زبان سے بھی کٹ جاتے ہیں، اسلامی علوم کا بہت بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے، اس پورے سرمایہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ گھر میں دین کا ماحول پہلے سے نہیں، ٹی، وی نے صورتِ حال اتنی خراب کردی ہے کہ الفاظ ان کو بیان کرنے سے قاصر ہیں، ان حالات میں آپ کیوں کر اطمینان کر سکتے ہیں کہ آپ کی نسل آپ کے بعد کچھ اس دینی امانت کو تھامے رہے گی، جس کے آپ حامل ہیں، اور گمراہ کن نظریات ان کو اپنا اسیر نہ بنا سکیں گے!

اس لئے موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ مسلمان بنیادی دینی تعلیم کا اپنا آزادانہ نظام قائم کریں، اور اس نظم کو خود کفیل بنائیں، اس سلسلہ میں گجرات کا علاقہ ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں بہت ہی مستحکم بنیادوں پر دینی مکاتب کا نظم قائم ہے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ مکتب کے جال بچھے ہوئے ہیں، مکاتب کے اوقات تعلیم ایسے ہوتے ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جانے والے بچے یا تو اسکول جانے سے پہلے مکتب میں وقت لگائیں، یا اسکول سے واپسی کے بعد، مکتب کی تعلیم سماج میں ایک لازمی تعلیم سمجھی جاتی ہے، یہی نظام پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو کرنا ہوگا، تاکہ ہمارا کوئی بچہ بنیادی دینی تعلیم سے ناآشنا نہ رہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کی

صورت میں ہمیں ایسا مرکز دیا ہے جس سے بہتر کوئی اور مرکز نہیں ہوسکتا، یہی مسجد مدرسہ ہے وہاں جو ائمہ، موذنین اور مسجد کے خدام ہیں، جو مدرس و معلم ہیں، اگر ہر مسجد میں صباحی اور مسائی تعلیم کا ایک مستحکم نظام قائم کریں، بچوں کے لئے ایک ایسا کورس مرتب کریں جس میں ناظرہ قرآن اوراذکار وادعیہ کے علاوہ اردو زبان، سیرت نبوی، اور اسلامی تاریخ کی بھی مناسب تعلیم ہو جائے اور بچوں کی فکری تربیت بھی ہو اور وہ شعوری طور پر اسلام کو سمجھ سکیں، تو یہ بہت بڑا کام ہوگا، اور اس طرح ہم آنے والی نسل کی حفاظت کرسکیں گے۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ گرمائی تعطیلات کا ہے، جس میں ڈیڑھ ماہ یا اس سے زیادہ طلبہ کو فرصت ملتی ہے، ۴۵/۵۰ دن کا عرصہ کم نہیں ہے، اگر ہم ان اوقات کا صحیح استعمال کریں تو اس تعطیل سے بھی بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس میں مڈل اسکول، ہائی اسکول اور کالج کی سطح کے طلباء کے لئے اسلامیات کا علاحدہ علاحدہ مختصر کورس ترتیب دینا چاہئے، جس میں ناظرہ، قرآن مجید، کچھ سورتوں کا حفظ، سیرت نبوی، اسلامی تاریخ، فقہ اسلامی وغیرہ موضوعات پر اسباق دیئے جائیں، تعارف اسلام خطبات کا نظم کیا جائے، اور ان کو اخلاقی تعلیمات سے بھی مزین کیا جائے، ایسی گرمائی درس گاہ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، کچھ ادارے اس سلسلہ میں کوشش کررہے ہیں، لیکن ضرورت اس سے بہت زیادہ کی ہے، اور جہاں کہیں گرمائی کلاسس قائم کئے جارہے ہیں، گو لوگوں کا رجوع حوصلہ افزا ہے، لیکن اتنا نہیں، جتنا ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ نوجوانوں کو اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگانا چاہئے، اور سرپرستوں کو اس سلسلہ میں اپنے بچوں کو بھیجنا چاہئے، کیوں کہ جب انسان اپنے ماحول سے باہر نکلتا ہے اور کسی چیز کو حاصل کرنے میں یکسو ہو جاتا ہے تو کم وقت میں بھی زیادہ کچھ حاصل کرسکتا ہے۔ نوجوان طلبہ کو اسلام سے قریب کرنے اور موجودہ مسموم ماحول سے بچانے کے لئے اور بھی وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مخالف اسلام طاقتیں پوری طرح اس بات کے لئے سرگرم ہیں کہ وہ مسلمانوں کی اگلی نسل کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب کے ساتھ جذب کرلیں، اور ان کو ان کی فکری میراث سے محروم کردیں، ان حالات میں اگر ہم نے غفلت، بے شعوری، خدا فراموشی اور خود فراموشی سے کام لیا تو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ہماری فکری اور ملی وجود ایک قصۂ پارینہ بن جائے، انشاء اللہ کفر کے پھونکوں سے نورِ حق بجھایا نہ جاسکے گا، لیکن ضرور ہے کہ ہم اس کے لئے فانوس بن کر زندہ رہیں، اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ جو نعمتِ ایمان ہمیں حاصل ہے وہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور ہمیں اس امانت کو اپنی اگلی نسلوں تک پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ پہونچانا ہے!!

(۱۹/۵/۲۰۰۰ء)

ماضی کو یاد کیجئے

اگر دنیا کے انصاف ور اور دانشمند ترین حکمرانوں کی فہرست بنائی جائے اور اس میں پہلا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہئے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کو آزاد ہونے کے بعد وہی طریقۂ حکمرانی اختیار کرنا چاہئے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے نہایت مکمل اور جامع تھی، آپ کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ تھا کہ اقتدار نے کبھی آپ کو غیر متوازن نہ ہونے دیا، یہ آسان نہیں کہ آدمی کرسیٔ اقتدار پر متمکن ہو، ملک وقوم کی قسمت کا فیصلہ اس کے قلم سے لکھا جاتا ہو، کوئی زبان اس کو چیلنج کرنے والی اور کوئی پنجہ اس کے دست استبداد کو تھامنے والا نہ ہو، لیکن پھر بھی اقتدار کی ''انا'' اس کو بدمست ہونے نہ دے اور جاہ واقتدار کا نشہ اس کے دل ودماغ تک رسائی نہ پاسکے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے ماضی کو یاد رکھے اور اپنی پرانی سطح کو فراموش نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں پوری طرح یہ وصف موجود تھا، وہ خلیفہ ہونے کے بعد اُمت کے ایک عام فرد کی طرح رہتے تھے، لباس و پوشاک ہو، کھانا پینا ہو، لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور عمومی سلوک ہو، معیارِ زندگی کے اعتبار سے انہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں کی سطح پر رکھا تھا، اس کا اثر تھا کہ وہ غریبوں کا دکھ جانتے تھے اور ان کے لئے غریبوں کے مسائل ''جگ بیتی'' نہیں بلکہ ''آپ بیتی'' تھے؛ اس لئے ہمیں ان کی زندگی میں عدل و انصاف، مساوات و برابری، غریب پروری اور کمزوروں اور زیردستوں کی دستگیری کے جو نمونے ملتے ہیں، کہیں اور مشکل ہی سے ملیں گے۔

عتبہ بن فرقد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آذربائیجان کی مہم پر مامور تھے، فتح آذر

بائیجان کے موقع پر انہوں نے کھجور اور گھی سے مرکب ایک خوش ذائقہ کھانا تیار کیا، جسے ''خبیص'' کہا جاتا ہے اور اسے اپنے غلام حکیم کے ساتھ چمڑے اور کپڑے سے چھپا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔ حکیم آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کیا لائے ہو، سونا یا چاندی؟ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے غلاف ہٹایا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے چکھا اور فرمایا کہ عمدہ اور خصوصی طور پر بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے ''ان ھذا لطیب اثر'' پھر دریافت فرمایا کہ تمام ہی مہاجرین نے اس سے آسودہ ہو کر کھایا ہے؟ حکیم نے عرض کیا: نہیں، یہ تو عتبہ نے خاص طور پر آپ کے لئے بنوایا ہے۔ عام طور پر ایسی خوشامدانہ باتیں اربابِ اقتدار اور اصحابِ اختیار کو باغ باغ کر دیتی ہیں اور ان کے دل میں ایسے کارکنوں کی عزت بڑھ جاتی ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی، آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً عتبہ کو ایک غصہ بھرا خط لکھا کہ یہ جو بیت المال کا مال ہے، یہ نہ تری محنت کا ہے اور نہ تری ماں اور ترے باپ کی محنت کا ہے، ''لیس من کدک ولا من کدامک ولا من کدأبیک'' پھر تحریر فرمایا کہ میں وہی کھاؤں گا جس کو عام مسلمان آسودہ ہو کر کھائیں۔ (فتوح البلدان: ۴۰۲)

آج ان لوگوں کا تو خیر کیا ذکر، جو صبح سے شام تک مادیت میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو خواب بھی روپیوں پیسوں کا دیکھتے ہیں اور جن کی بیداری کا ایک ایک نفس سیم وزر کی فکر میں گزرتا ہے، اہل دین بھی کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کو اسوہ بنانے تیار ہیں؟ دینی مجلسوں اور محفلوں میں بھی من وتو اور ماوشما کا امتیاز موجود ہے، بڑوں چھوٹوں کا فرق ہے، اکابر واصاغر کی تفریق ہے، اور تقویٰ کی بنیاد پر نہیں بلکہ دولت وغربت اور شہرت وگمنامی کی نسبت سے دائرے قائم کر دیئے گئے ہیں، جب معمولی سا اقتدار آدمی کو توازن سے محروم کر دیتا ہے تو ان لوگوں سے کیا گلہ جو اقتدار کی اونچی چوٹیوں پر پہنچنے کے بعد نیچے رہنے والوں کو دیکھ نہیں پاتے یا ان کو اپنے مقابلہ میں قامت نہیں خیال کرتے ہیں۔

انسان دوسرے انسان کو انسان سمجھنا چھوڑ دے اور دوسروں کو ادنیٰ مخلوق تصور کرنے لگے یا خود اپنے آپ کو انسان سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق خیال کرنے لگے تو دوسرے انسانوں کے غم کی چوٹ اپنے کلیجہ پر محسوس نہیں کر سکتا، یہی چیز انسان کے مزاج کو غیر متوازن اور

طریقۂ فکر کو نامنصفانہ بنا دیتی ہے، پھر انسان اپنے ماضی کو بھولتا چلا جاتا ہے اور جوں جوں وہ اپنے ماضی سے دور ہوتا جاتا ہے، کبرو تعلّی بڑھتی جاتی ہے، اس لئے جب انسان دولت و ثروت، حکومت واقتدار اور شہرت و ناموری کے بام پر چڑھنے لگے تو ہر زینہ پر قدم رکھتے ہوئے پچھلا زینہ اور اس زینہ کے نیچے بچھی ہوئی زمین کو دیکھتا جائے اور یاد رکھے کہ اس نے یہیں سے اپنا سفر شروع کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے ہم نام فرمانروا حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا ننہالی سلسلہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ملتا ہے۔ رجاء بن حیوہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے قدر شناسوں میں تھے، انہیں کے مشورہ سے باگ خلافت آپ کو سونپی گئی تھی، زمانہ خلافت میں رجاء ایک شب آپ کے پاس مقیم ہوئے، ایک معمولی سا چراغ تھا جو روشن تھا، چراغ بجھنے لگا تو رجاء اٹھے کہ چراغ درست کر دیں، حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے قسم دی کہ رجاء ہرگز نہ اٹھیں، ناچار بیٹھ گئے، خلیفۃ المسلمین خود اٹھے اور چراغ درست فرمایا، بنو اُمیہ کے ابتدائی دور ہی سے بادشاہان مملکت کی شوکت وسطوت جس طرح روز بروز بڑھتی جاتی تھی، اس کے تحت حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا یہ عمل نہایت باعث حیرت تھا، رجاء نے عرض کیا: آپ امیر المؤمنین ہونے کے باوجود چراغ درست کرنے کا کام کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں جب اٹھا تب بھی عمر بن عبد العزیز تھا اور جب واپس آیا تب بھی عمر بن عبد العزیز ہی تھا!!!

حضرت عمر بن عبد العزیز نے امیر المؤمنین ہونے کے بعد بھی اس کو یاد رکھا کہ وہ "امیر المؤمنین" بعد میں ہیں، "عمر بن عبد العزیز" پہلے۔ اگر انہوں نے عمر بن عبد العزیز ہونے کی حیثیت کو بھلا دی ہوتا تو ان کے لئے چراغ بجھانے کے لئے اٹھنا اور خود اپنی ضرورت پوری کرنا دشوار ہوتا، لیکن ماضی کو یاد رکھنے نے ان کی زندگی کو ایک سادہ، بے تکلف اور تصنع سے خالی مومن کی زندگی بنا دیا تھا، یہ ایک ضروری وصف ہے، جس کی قدم قدم پر ضرورت ہے، رشتہ داروں سے رشتہ باقی رکھنے کے لئے، دوستوں سے محبت کی فضاء قائم رکھنے کے لئے، اپنے ماتحت کام کرنے والے مزدوروں اور ملازمین کا دل جیتنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ خدا کے یہاں اس کا شمار کبر کرنے والوں میں نہ ہو! (۱۰ / اپریل ۱۹۹۸ء)

سالِ نو ساعتِ سرمستی یا وقتِ احتساب؟

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بہت سی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں ایک اہم ترین نعمت ''وقت'' ہے۔ وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وقت کی قسم کھائی ہے، اور ایک مستقل سورت ''والعصر'' کے نام سے نازل ہوئی ہے۔ ''عصر'' کے معنی ہی زمانہ و وقت کے ہیں۔ پھر دن و رات کے مختلف مواقع ہیں، جن کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے: دن، رات، صبح، سورج نکلنے کا وقت، وغیرہ، چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے رات کی (اللیل:۱)، دن کی (النہار:۲)، صبح کی (التکویر:۱۸)، اور سورج چڑھتے ہوئے دن کے وقت کی (الضحیٰ:۱) قسمیں کھائی ہیں، قرآن میں جب کسی چیز کی قسم کھائی جائے تو اس سے اس چیز کی اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس طرح قرآن مجید نے بار بار وقت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پھر غور کیجئے کہ اکثر عبادتیں وقت ہی سے متعلق ہیں، نماز پنجگانہ جو افضل ترین عبادت ہے، اس کا اداء و قضاء ہونا، درست و نادرست ہونا اور مستحب و مکروہ ہونا، وقت کے ساتھ مربوط ہے، روزہ کی ابتداء و انتہاء، وقت سے اس درجہ متعلق ہے کہ اس میں دو چار منٹ کی بھی کمی زیادتی نہیں ہو سکتی، یہی حال دوسری عبادتوں کا بھی ہے۔

وقت کی اہمیت کیوں نہ ہو، کیوں کہ انسان کی نیکیاں اور برائیاں اور ثواب و عذاب سب کا تعلق وقت کے صحیح اور غلط استعمال سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن جب تک لوگ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیں گے ان کو آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں ہوگی، ایک یہ کہ انہوں نے اپنی عمر کسی کام میں بسر کی: عن عمرہ

فیما افناہ، دوسرے اپنی جوانی کس کام میں صرف کی: عن شبابہ فیما ابلاہ، تیسرے مال کس ذریعہ سے کمایا اور چوتھے کس راہ میں خرچ کیا اور پانچویں یہ کہ اس نے جو کچھ سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟ (ترمذی: ۶۷/۲) اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا سودا اصل میں وقت ہی کے حساب و کتاب سے متعلق ہے، اور دنیا میں تو ہر شخص دن ورات اس کا تجربہ کرتا رہتا ہے، کہ وقت کی ناقدری انسان کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہے، اور وقت کی قدر دانی اسے کس قدر نیک نام و بامرام کرتی ہے، اسی لئے اردو کے ایک شاعر نے خوب کہا ہے:

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

اب چند دنوں میں ۲۰۰۳ء کا آغاز ہونے والا ہے، ۳۱/ دسمبر کے بعد آنے والی رات کو جوں ہی گھڑی کا کانٹا بارہ بجے کو پہنچے گا، تو یہ صرف A.M اور P.M ہی کی تبدیلی نہیں ہوگی، بلکہ یہ ایک سال کی تبدیلی ہوگی، اور ایک نئے کیلنڈر کو وجود میں لائے گی، نیا سال در اصل ہمیں دو باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، ماضی کا احتساب، اور آئندہ کا پروگرام، انسان کے لئے اپنے آپ کا محاسبہ ضروری ہے، یہ محاسبہ ہمہ پہلو ہونا چاہئے، محاسبہ دنیوی امور میں بھی ضروری ہے، اگر آپ تاجر ہیں تو اپنی تجارت کا جائزہ لیں، کہ اس میں آپ نے کیا کچھ ترقی کی ہے؟ اگر نہیں کی ہے یا پیچھے ہٹے ہیں، تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ کہیں اس میں آپ کی کوتاہی کو تو دخل نہیں ہے؟ اگر آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازم ہوں تو غور کریں کہ آپ اس میں جو بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے تھے یا اپنی ایمانداری اور بہتر کارکردگی کے ذریعہ جو اعتماد آپ کا پیدا ہو سکتا تھا، آپ نے کس حد تک اسے حاصل کیا ہے؟ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں اپنی کامیابی و ناکامی اور پیش قدمی و پست رفتاری کا جائزہ لینا چاہئے۔

انسان کا کسی چیز میں پیچھے ہو جانا بری بات نہیں، بُری بات یہ ہے کہ انسان بے حسی میں مبتلا ہو جائے، وہ ناکام ہو اور اپنی ناکامی کے اسباب پر غور نہ کرے۔ اس کے قدم پیچھے ہٹیں، اور فکر مندی کی کوئی چنگاری اس کے دل و دماغ میں سلگنے نہ پائے، وہ ٹھوکر کھائے لیکن ٹھوکر اس کے لئے مہمیز نہ بنے، جو شخص اپنے نقصان کا جائزہ لیتا ہے، اپنی

کتاب زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو محسوس کرتا ہے، وہی گر کر اٹھتا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے، جس میں اپنے احتساب اور اپنی کمزوریوں کے اعتراف کی صلاحیت ہی نہ ہو، وہ کبھی اپنی منزل کو نہیں پا سکتا۔

جیسے دنیوی اعتبار سے اپنا احتساب ضروری ہے، اسی طرح دین و اخلاق اور اعمال وکردار کے اعتبار سے بھی احتساب ضروری ہے، اپنی عبادات پر نگاہ دوڑائیں، کہ بہ مقابلہ گذشتہ سال کے اس سال اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اپنے معاملات کو دیکھیں کہ حلال وحرام اور مستحبات ومکروہات کے جو احکام شریعت میں ہیں، ان میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے، خاص کر اپنے اخلاق وسلوک کا جائزہ لینا چاہئے، والدین کے ساتھ، شوہر و بیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، رشتہ داروں اور خاص کر غریب رشتہ داروں کے ساتھ، خاندان کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ، مسلمان اور غیر مسلم پڑوسیوں اور کاروبار و دفاتر کے رفقاء کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے؟ ہم ان کے لئے پھول ہیں یا کانٹے؟ وہ ہم سے راحت وسکون محسوس کرتے ہیں یا خوف ودہشت؟ ہم نے انہیں محبت کی سوغات دی ہے یا نفرت وعداوت کا تحفہ؟ غرض ہمیں اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کا جائزہ لینا چاہئے، اور خود اپنا حساب کرنا چاہئے کیوں کہ انسان دوسرے انسانوں کی نگاہ سے اپنی کوتاہیوں کو چھپا سکتا ہے، لیکن اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے، خود اپنا حساب کرو: **حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔**

(کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۴۲۰۳)

پھر اس احتساب، آپ اپنے جائزہ اور خود حسابی کی روشنی میں آئندہ سال کا نظام بنانا چاہئے، کیا بہتر کام اس نے کئے ہیں، جسے برقرار رکھے ہیں؟ ان بہتر کاموں میں معیار یا مقدار کے لحاظ سے کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ اور اسے اس میں فلاں حد تک اضافہ کرنا ہے، کیا کوتاہیاں اور کمزوریاں ہیں، جنہیں وہ اس سال دور کرے گا، اور اگر وہ مکمل طور پر انہیں دور نہیں کر سکتا، تو اسے کم کرے گا، دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا، تعلیم کا

معاملہ ہو یا ہنر مندی کا، تجارت میں ہو، ملازمت میں، سماجی تعلقات کی بات ہو یا معاشی معاملات کی، ہر جگہ یہ پلاننگ اور پروگرام سازی ضروری ہے، اور اسی سے اس کی ترقی و کامیابی متعلق ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
دن بہ دن، لحہ بہ لحہ، دم بہ دم

لوگ سالِ نو کی خوشیاں مناتے ہیں، لیکن غور کیجئے تو یہ موقع خوشی سے زیادہ غم کا ہے، یہ ساعتِ جشن و مسرت نہیں، بلکہ لحہ عبرت و موعظت ہے، کیوں کہ سال کے گذرنے سے عمر بڑھتی نہیں ہے، بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہوتا جاتا ہے، اور مقررہ عمر میں کمی ہوتی جاتی ہے، اس لئے سالِ نو کی آمد غفلت شعار طبیعتوں کے لئے صورِ انتباہ اور سونے والوں کے لئے بیداری کا الارم ہے، نہ کہ سرمستی و عیش کوشی کا پیغام، یہ وقت ہے کہ ایک مومن کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم ہو کہ تو نے میرے بہت سے ہم عمروں کو اٹھالیا، اور مجھے اپنی مہلت سے سرفراز کیا ہے، اس لئے تیرے دربار میں شکر و امتنان کے جذبات پیش کرتا ہوں، یہ وقت ہے کہ خدا کے حضور التجاء و الحاح کے ہاتھ اٹھیں، کہ خدایا میرے مستقبل کو میری ماضی سے بہتر فرما، میری نامرادیوں کو کامیابیوں سے اور میری پستیوں کو بلندیوں سے بدل دے، خاص کر مسلمان اس وقت پورے عالم میں خدا سے غفلت شعاری اور دنیا اور متاعِ دنیا کی محبت کی جو سزا پا رہے ہیں، اس پس منظر میں پوری امت کو عالمِ اسلام اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کی دعاء کرنی چاہئے۔

لیکن افسوس اور ہزار بار افسوس! کہ عبرت پذیری اور موعظت انگیزی کی اس ساعت کو بھی ہم نے عیش کوشی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کی ساعت بنالیا ہے، اس موقع سے رقص و سرور کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، تفریح گاہوں اور پارکوں میں کھلے عام بے حیائی کے مناظر دیکھے جاتے ہیں، اور جن بے ہودہ حرکات و سکنات کے لئے کبھی اہلِ مشرق اہلِ مغرب کو شرم و عار دلاتے تھے اب خود مشرق اس بے حیائی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کو مضطرب ہے، کیا کسی شریف انسان کے لئے اس طرح کھلے عام بادہ و ساقی

سے ہم دامن و ہمکنار ہونا زیبا ہے؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اس خود فراموشی اور غفلت کوشی کا کوئی موقع ہے؟ جس قوم کا قبلۂ اوّل اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہو، عالمِ اسلام کے قلب و جگر تک دشمن کی رسائی ہو چکی ہو، جس کی عبادت گاہ بلا کسی دلیل اور جواز کے زمین بوس کر دی گئی ہو، جس کا لہو گجرات کے چپہ چپہ سے ایسا ٹپک رہا ہے جیسے موسم سرما میں کہر، ایسی مظلوم اور ستم رسیدہ اور ذلت و نکبت کی سرحدوں پر کھڑی امت کے لئے خوشی کے شادیانے بجانے اور عیش و نشاط کے کاشانے سجانے کا بھی کوئی موقع ہے؟؟ **فاعتبروا یا اولی الابصار !**

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

دسمبر ۲۰۰۰ء گذرنے کو ہے، اور اکیسویں صدی اب وقت کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے، یہ سال اس اعتبار سے اہم ہے، کہ ۳۱ ردسمبر کو سال بھی مکمل ہو رہا ہے، بیسویں صدی بھی، اور دوسرا ہزار سالہ بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ رہا ہے، آنے والی یکم جنوری کی تاریخ نہ صرف نئے سال کی مژدہ لائے گی، بلکہ نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا نقطۂ آغاز بھی ہوگی، یہ وقت افراد و اشخاص کے لئے بھی اداروں اور تنظیموں کے لئے بھی اور جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی اپنے احتساب کا وقت ہے، کہ انہوں نے اس عرصہ میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اور وقت کی صورت میں جو عظیم نعمت اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اس کا کس طور استعمال کیا ہے؟ جو قوم خود اپنا محاسبہ نہیں کر سکتی، اور جو جماعت اپنا گریباں آپ تھامنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دوسرے ان کے گریبان تھامتے ہیں، اور خیر و شر کا حساب کر کے اس کا بدلہ چکاتے ہیں، لمحوں کی ناقدری سے بعض اوقات صدیوں کا نقصان ہوتا ہے اور قومیں زوال و انحطاط کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بہت سی نعمتیں اس کائنات میں دی ہیں، ان میں ایک بہت بڑی نعمت وقت ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، اس کے اوقات بڑھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت عمر گھٹتی جاتی ہے اور ہر لمحہ وقت کی متاع گراں مایہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
چپکے چپکے، لمحہ لمحہ، دم بہ دم

وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں

کتنے ہی مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے، کبھی رات اور صبح کی قسم کھائی گئی، (اللیل:۱،۲، مدثر: ۳۳،۳۴، تکویر: ۱۷،۱۸) کبھی رات کے ساتھ شفق کی قسم کھائی گئی، (انشقاق: ۱۶،۱۷) کبھی فجر اور اس کے ساتھ دس راتوں کی (الفجر:۱،۲) کبھی دن کی روشنی اور رات کے چھا جانے کی (الضحیٰ:۱،۲) اور کبھی خود زمانہ کی، (العصر:۱) دونوں کی آمد و رفت اور سورج و چاند کے طلوع و غروب سے اوقات کا علم ہوتا ہے، قرآن مجید نے جا بجا اللہ کی نعمت کی حیثیت سے ان کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی، جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کر سکیں، اولم نعمر کم مایتذکر فیہ من تذکر (الفاطر:۳۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں گذاری، اور اپنی جوانی کو کس مقصد میں صرف کیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں، صحت اور فراغتِ وقت۔

سلف صالحین جنہوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لحہ کو وصول کرتے تھے، اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے، امام ابو یوسفؒ (۱۱۳۔۱۸۲ھ) اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ان کے بارے میں اہل تذکرہ نے قاضی بن جراح سے نقل کیا ہے، کہ وہ مرض وفات میں امام صاحب کی عیادت کے لئے پہونچے، آپ پر بے ہوشی طاری تھی، ابراہیم بیٹھے رہے، کچھ دیر میں ہوش آیا، امام صاحب نے پوچھا کہ حج میں جمرات کی رمی پیدل کرنا افضل ہے یا سواری پر؟ ابراہیم نے استاذ سے عرض کیا، کہ اس حال میں بھی آپ فکر و تحقیق کو نہیں چھوڑتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، ابراہیم نے کہا سوار ہو کر رمی کرنا افضل ہے، امام ابو یوسفؒ نے کہا یہ غلط ہے، ابراہیم نے کہا پھر پیدل رمی کرنا افضل ہوگا، فرمایا یہ بھی غلط، ابراہیم نے عرض کیا کہ جو رائے صحیح ہو، اسے آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: جس رمی کے بعد کوئی اور رمی ہو، اس کو پیدل کرنا افضل ہے، اور جس

کے بعد کوئی اور رمی نہ ہو، اسے سوار ہو کر، ابراہیم وہاں سے اٹھے، اور امام صاحب کے گھر کے دروازہ ہی پر پہونچے تھے کہ اہل خانہ کے رونے کی آواز آئی، پہلے تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہو گیا ہے، یہی امام ابو یوسفؒ ہیں جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سترہ ۱۷ سال تک اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہو گیا، تو تجہیز و تکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کو حوالہ کر کے درس میں شریک رہے، اور درس سے محرومی کو گوارا نہیں کیا (مناقب مکی: ۴۷۲/۱)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیش گذرے ہیں جو امام بخاری اور امام مسلم کے اساتذہ میں ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا، بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے، اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتی (سیر اعلام النبلاء: ۴۵۸/۱۱) احمد بن یحیی شیبانی (۲۰۰-۲۹۱ھ) عربی لغت، ادب، گرامر اور قراءت وغیرہ کے بڑے نامی گرامی آدمی تھے، اور ثعلب کے نام سے مشہور تھے، ان کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے کہ کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں (الحث علی طلب العلم الخ للعسکری: ۷۷) امام ثعلب کا معمول تھا کہ راستہ چلتے بھی ہاتھ میں کتاب رہتی، اور مطالعہ کرتے جاتے، چنانچہ اسی طرح چل رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹکر دی، گڈھے میں گر پڑے اور ایسی چوٹ آئی کہ دوسرے ہی دن وفات ہو گئی۔

(وفیات الاعیان لابن خلکان: ۱۰۴/۱)

اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہلِ علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ سن کر اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام ابن جریر طبریؒ بہت ہی بلند پایہ، مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انہوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳ ر ہزار اوراق میں ۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ھ میں فارغ ہوئے، یہ

دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا ۶ ر ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، طبری کی یہ تفسیر ۱۱ ر ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو یومیہ ۱۴ ر ورق یعنی ۲۸ ر صفحات کا اوسط ہوتا ہے۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب کیا گیا تو وہ سات سو درہم کی تھی، ابو ریحان بیرونی کی وفات کے وقت اس زمانہ کے مشہور فقیہ ابوالحسن ولوالجی گئے، بیرونی نزع کی حالت میں تھے، اور سینے میں گھٹن محسوس کر رہے تھے، اس وقت علامہ ولوالجی سے ''جدات فاسدہ'' ونانی کے حق میراث کا مسئلہ پوچھا، ولوالجی کو رحم آیا اور کہنے لگے کہ اس وقت بھی آپ کو یہ فکر پڑی ہے؟ بیرونی نے کہا کہ دنیا سے اس مسئلے سے واقف ہو کر جانا بہتر ہے یا ناواقف ہو کر؟ ولوالجی نے مسئلہ کی وضاحت کر دی اور واپس ہوئے، کچھ ہی دور آئے تھے کہ رونے دھونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ علامہ بیرونی کا انتقال ہو گیا ہے۔

وقت کی حفاظت کرنے والے بزرگوں میں علامہ ابن عقیل بھی ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی سب سے اہم کتاب ''الفنون'' ہے، جس کے بارے میں بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی ۸ ر سو جلدیں تھیں، اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر جارج مقدسی مستشرق نے دو جلدوں میں ۱۹۷۰۔۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے، امام ابن جوزی تاریخ اسلام کے بڑے مصنفین میں ہیں، وہ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو چاہتے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والے سے بہت نالاں رہتے، اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اسی طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسب ضرورت کاغذ کاٹے جاتے، قلم تراش لیتے، اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے، اس کا نتیجہ تھا کہ بقول حافظ ابن رجب شاید ہی کوئی فن ہو، جس میں ابن جوزی کی کوئی کتاب نہ ہو، ابن جوزی کی تصنیفات پانچ سو سے اوپر ہیں، اور ان میں سے بعض بیس جلدوں اور بعض ۱۰ ر جلدوں پر مشتمل ہیں، ابن جوزی کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے جن قلموں سے حدیثیں تحریر کی تھیں، ان کے ڈھیر

سارے تراشے جمع ہوگئے تھے، انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے غسل کا پانی اسی سے گرم کیا جائے، چنانچہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی قلم کے تراشے بچے رہے۔

مشہور مفسر اور صاحب نظر امام رازی کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہوجاتا ہے، مشہور محدث علامہ منذری کے صاحبزادے رشید الدین (م ۶۴۳) کا انتقال ہوگیا، جوان کو بہت محبوب تھے، تو اپنے جواں مرد بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی، مدرسہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالہ کرکے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے، امام نوویؒ جیسا محدث اور صاحب علم سے کون ناواقف ہوگا، راستہ چلتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، اس کا نتیجہ ہے کہ صرف ۴۵ رسال کی عمر پائی، لیکن ہزار ہا ہزار صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہل علم کے لئے حرز جاں ہیں۔

ابن النفیس میڈیکل سائنس کی یادگار شخصیتوں میں ہیں، جسم میں دوران خون کا نظام سب سے پہلے آپ ہی نے دریافت کیا، طب میں آپ کی کتاب ''الشامل'' تقریباً ۳۰۰ رجلدوں میں ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا حال یہ تھا کہ سفر وحضر اور صحت و بیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد ابن قیم نے ان کی تصنیفات کی تعداد پر جو رسالہ لکھا ہے وہ خود ۲۲ رصفحات کا ہے، اخیر دور کے اہل علم میں علامہ شوکانی کا حال یہ تھا کہ روزانہ دس اسباق پڑھاتے، فتاویٰ بھی لکھتے، فریضۂ قضاء بھی انجام دیتے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سو چودہ اہم تصنیفات آپ کی یادگار ہیں، علامہ شہاب الدین آلوسی (۱۲۱۷ـ۱۲۷۰ھ) کا حال یہ تھا کہ روزانہ چوبیس اسباق پڑھاتے، افتاء کا کام بھی کرتے، اور اس کے ساتھ انہوں نے روح المعانی کے نام سے ایسی عظیم الشان اور مبسوط تفسیر لکھی ہے کہ جس کی پورے عالم اسلام نے داد دی ہے۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ۳۹ رسال کی عمر پائی، لیکن ان کی تصانیف ۱۱۰ رسے بھی زیادہ ہیں، اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرف آخر

ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے، مولانا عبدالحی حسنی نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے علماء سلف اور مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی نہایت اہم اور فاضلانہ تصنیف ''قیمۃ الزمن عندالعلماء'' میں سلف صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات ملتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب وقت کی قدر جاننے اور اس کی قیمت پہچاننے کا نتیجہ ہے، جو لوگ وقت کو سستی اور بے قیمت شئی سمجھتے ہیں اور اس کی قدر دانی نہیں کرتے، وہ زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے، اسلام نے وقت کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے تمام عبادات کو وقت سے جوڑ رکھا ہے، نمازوں کے اوقات مقرر ہیں، روزہ متعین وقت سے شروع ہوتا ہے، اور متعین وقت پر ختم ہوتا ہے، حج کے افعال بھی متعین ایام واوقات میں انجام دیئے جاتے ہیں، قربانی بھی متعین دنوں میں ہوتی ہے، زکوٰۃ میں بھی مال پر ایک سال گذرنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے، اور شریعت میں کتنے ہی احکام ہیں، جو وقت سے مربوط ہیں، لیکن افسوس کہ یہ امت اپنے وقت کو جس قدر ضائع کرتی ہے اور اس کو جتنا بے قیمت سمجھتی ہے، شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، مسلمان نوجوانوں کی یار باشی، ہوٹل بازی اور بے مقصد سیر و تفریح ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، بلکہ ضرب المثل بنتی جارہی ہے، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اوقات ضائع کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دینی جلسوں اور اجتماعات میں بھی اوقات کی پابندی کے معاملہ میں جو بے احتیاطی روا رکھی جاتی ہے، وہ کس قدر افسوس ناک ہے!

آیئے! نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا استقبال کرتے ہوئے ہم عزم مصمم کریں، کہ وقت کی پوری قدر دانی کریں گے، اور اپنے ایک ایک لمحہ کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اگر ہم سب اس کا عزم کریں اور اپنے آپ کو اس پر قائم رکھیں تو کون ہے جو اس امت مرحوم کی سربلندی کو روک سکے؟؟

تہذیبی ارتداد

ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے، جن میں سب سے اہم اللہ پر، رسول پر، اللہ کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان لانا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے صرف ایمانیات ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ عبادات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی ہدایات سے سرفراز فرمایا اور پوری قوت اور تاکید کے ساتھ امتِ مسلمہ کو ان تعلیمات پر کار بند رہنے کی تلقین فرمائی، کیوں کہ کسی قوم کے لئے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدہ کے ذریعہ ممکن نہیں، بلکہ تہذیب و معاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ہیں جو آج ہندوستان کا حصہ بن چکی ہیں، وہ اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے اپنا الگ وجود رکھتی ہیں، لیکن انہوں نے دوسری قوموں سے سماجی اور تہذیبی فاصلہ قائم نہیں رکھا، رہن سہن، لباس و پوشاک، خورد و نوش، شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات وغیرہ میں انہوں نے اپنا رنگ برقرار نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا تشخص کو کھو دیا، اور آج ہندوستان ان کو اپنا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کر دیا جائے، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی سماجی انفرادیت سے محروم ہو جاتی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ دین و مذہب ہی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے، اور اگر وہ کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل نہ ہو، جب بھی الحاد و انکار کا راستہ اختیار کر لیتی ہے، یا کم سے کم وہ مذہب کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر لیتی ہے، غیر سنجیدہ رویہ سے مراد یہ ہے کہ مذہب سے اس کی کوئی ذہنی اور فکری وابستگی نہیں ہوتی، البتہ وہ اسے ایک خاندانی روایت سمجھ کر ڈھوتی رہتی ہے، مذہبی اقدار پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا البتہ

خاندانی روایت کے تحت خاص خاص مذہبی تقریبات اور تہواروں میں اس کی شرکت ہو جاتی ہے اور گاہے گاہے کچھ عبادت کی توفیق میسر آ جاتی ہے، لیکن حلال وحرام، معاملات، کسب معاش اور سماجی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ نہیں ہوتا، اسی کیفیت کو میں نے ''تہذیبی ارتداد'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ارتداد دبے پاؤں آتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر داخل ہوتا ہے، اور ایسا میٹھا زہر بن کر حلق سے اترتا ہے کہ زہر کھا کر بھی انسان تحسین وآفریں کے کلمات کہہ اٹھتا ہے، یہ ارتداد نہ سوئے ہوؤں کو جگاتا ہے، نہ غافلوں کو متوجہ کرتا ہے، نہ فکر مند دلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے، نہ قلب وذہن کو جھنجھوڑتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، یہ اس بیماری کی طرح ہے، جو بہ ظاہر ہلکی ہو، لیکن بہ تدریج انسان کو موت کی طرف لے جائے، اور یہ ایسا نشہ ہے کہ مقتول خود قتل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس لئے اس ارتداد کو خوب سمجھنے، اس کے اسباب پر نظر رکھنے اور اس کے نتائج وعواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت پوری دنیا جو بنیادی طور پر یہودی دماغ اور یہودی منصوبہ بندی کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے، اور اس کے اشارہ چشم وابرو پر رقصاں ہے، اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ اگر مسلمانوں کو کھلے عام مرتد نہیں کیا جا سکتا، تو ان پر ایسی زبردست تمدنی یلغار کر دی جائے کہ وہ خوشی خوشی تہذیبی ارتداد کو قبول کر لیں، اور اس مقصد کے لئے اتنے طاقتور حربے استعمال کئے جا رہے ہیں کہ بہ ظاہر اس سے زیادہ دوررس اور قوی و مؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں، ٹی، وی نے اس رفتار کو بہت تیز کر دیا ہے، اور ڈش انٹینا کی وجہ سے مسلمان اور مشرقی ملکوں میں ایسے فحش پروگرام کا ایک طوفان سا آ گیا ہے کہ جن کا اسلام اور مسلم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اب انٹرنیٹ نے اس تہذیبی یلغار کو مزید طاقت ور بنا دیا ہے، اور ایک ایسی چیز جو بہترین تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتی تھی، وہی چیزیں انتہائی تخریبی اور غیر اخلاقی مہم جوئی کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں، اب جو نئی معاشی اصلاحات کا عمل پوری دنیا میں جاری ہے، اور ''عالمیانے''

کی نئی اصطلاح شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی صحافت، مغربی لٹریچر، اور مغربی کمپنیوں کے وساطت سے مخرب اخلاق غذائی اور غیر غذائی اشیاء کی آمد کا ایک سیل بلا جاری وساری ہے۔

اس وقت اس منصوبہ کے نقوش مشرقی علاقوں میں اور مسلم ملکوں میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، ادھر چند سالوں میں عرب اور اسلامی ممالک میں خواتین کے لباس اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ امریکی ویورپی ملبوسات اور عرب خواتین کے ملبوسات میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، بہت سے عرب اور مسلم ممالک وہ ہیں جہاں عوام تو کجا؟ علماء بھی داڑھی نہیں رکھتے، ڈاڑھی جسے کسی زمانہ میں صلاح وتقویٰ اور شرافت واعتماد کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب دہشت گردی اور شدت پسندی کی پہچان سمجھی جاتی ہے، مجھے ایک بار حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جس کے استقبالیہ پر ایک دین دار، خوش شکل، مصری نوجوان لڑکا بیٹھا کرتا تھا، اور اس کے چہرے پر داڑھی بہت بھلی محسوس ہوتی تھی، میں اکثر عشاء کے بعد مسجد سے واپس ہوتے ہوئے دو چار منٹ اس کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی مذہب پر، کبھی عربی زبان کے بارے میں، اور کبھی مصر میں مسلمانوں کے حالات کے متعلق اس سے گفتگو ہوتی، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بلیغ اور سہل عربی زبان میں گفتگو کرتا، اور بہت ہی اخلاق ومروت سے پیش آتا، اس لئے اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے لطف سا آتا تھا، میں نے ایک دن کہا کہ مصر کے لوگ اکثر داڑھی نہیں رکھتے، لیکن تم نے جو یہ داڑھی رکھی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے، اس سے تمہارے چہرے پر ایک نورانیت اور معصومیت سی معلوم ہوتی ہے، میری یہ بات سن کر وہ افسردہ سا ہوگیا، اور اس نے سنجیدہ ہوکر کہا کہ شیخ آپ سچ کہتے ہیں، میں داڑھی رکھنا چاہتا ہوں، لیکن مصر میں داڑھی رکھنے میں بڑی مشکلات ہیں، ہمارے یہاں داڑھی رکھنے والوں کو باضابطہ اپنا رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، میں جب پہلی بار داڑھی رکھ کر اپنے وطن گیا تو مجھے سات آٹھ گھنٹہ ایرپورٹ پر تفتیش کے لئے روک لیا گیا، اور میرے پورے اہلِ خاندان کو طلب کیا گیا، جن میں میری ماں اور بہنیں بھی تھیں، اور ان سے بھی کافی دیر تک تفتیش کی گئی،

اس کے بعد سے مجبوراً میں مصر جاتے ہوئے اپنی داڑھی صاف کرالیتا ہوں، اور واپسی کے بعد پھر داڑھی رکھ لیتا ہوں —— غور کیجئے! کیسا غضب ہے کہ ایک مسلمان ملک میں مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہ ہو، کاش یہ اسرائیل ہی سے سبق حاصل کرتے جہاں یہودی مذہبی طبقے کے داڑھی رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جب مسلمان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ حال ہے تو ان مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو مغربی ثقافت کی آغوش میں محوِ غفلت ہیں، اور اسے دنیا ہی میں جنت تصور کرتے ہیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے عرب اور اسلامی ممالک اور مختلف علاقوں میں بسنے والے تارکینِ وطن مسلمانوں کے لئے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنا دامن دل کھول رکھا ہے، انہیں شہریت دی جاتی ہے، انہیں ملازمت اور مزدوری کے مواقع ملتے ہیں، اور انہیں اپنے ملکوں سے بڑھ کر شہری حقوق دے دئے جاتے ہیں، تارکینِ وطن خوش ہیں کہ انہیں پھلنے، پھولنے اور آگے بڑھنے کے بھرپور مواقع ہاتھ آرہے ہیں، لیکن انہیں نہیں معلوم کہ وہ ان ممالک کے ہاتھوں اپنی اگلی نسلوں کا سودا کررہے ہیں، چنانچہ لاکھوں عرب اور فلسطینی جو پچاس سال پہلے امریکہ گئے، اب ان میں اپنے مسلمان ہونے کی پہچان بھی باقی نہیں رہی، مذہبی شعور رخصت ہوا، رہن سہن بدل گیا، زندگی کے طور وطریق تبدیل ہوگئے، یہاں تک کہ ان کے نام میں بھی مسلمانیت کی کوئی بو باقی نہیں رہ گئی ہے، حالاں کہ ان کے آباء واجداد راسخ العقیدہ مسلمان اور عرب تہذیب کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے، اگر آج ان گذری ہوئی روحوں کو دوسری زندگی دے دی جائے تو شاید ہی وہ خود اپنی نسل اور اپنی اولاد کو پہچان سکیں، یہ ہے اس تہذیبی ارتداد کا اثر، جو بہ تدریج افراد واقوام کو فطری اور اعتقادی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے!

اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اور مماثلت اختیار کی، وہ ان ہی میں سے ہوگیا، اس روایت کو امام ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور امام طبرانیؒ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے اس حدیث کو "حسن" یعنی مقبول قرار دیا ہے، (الجامع الصغیر، حدیث نمبر:

۵۹۳)رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں عقیدہ وایمان میں غیر مسلموں سے مماثلت مراد نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص عقیدہ کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کرلے، وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں ہے، اس کے غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے کیا معنی؟ لہٰذا اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے، اور مختلف مسائل میں حضور ﷺ کی تشریح وتوضیح نے اس نکتہ کو مزید واضح کیا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے سورج نکلنے، سورج ڈوبنے، اور سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ یہی اوقات عام طور پر مشرک اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، جو قومیں سورج کی پرستار ہیں، وہ انہی اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں، اس لئے ان اوقات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا۔

روزہ میں حکم دیا گیا کہ افطار جلدی کیا جائے، افطار میں تاخیر نہ کی جائے، کیوں کہ افطار میں تاخیر اہلِ کتاب کا طریقہ ہے، یومِ عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم ہوا، کیوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے تاکہ مسلمان اپنی عبادت میں ان سے ممتاز رہیں، حج میں بہت سے ایسے افعال جن کو مشرکین بہت اہمیت دیتے تھے، اسلام نے ان کو ختم کیا، یا ان میں تبدیلی پیدا کی، پھر یہی ہدایات آپ نے وضع قطع اور لباس و پوشاک کے بارے میں بھی دی، مجوسی داڑھی منڈایا کرتے تھے، بعض قومیں داڑھی بڑھایا کرتی تھیں، آپ نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا، اہلِ ایران اظہار فخر کے لئے ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہنتے تھے، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اہلِ مکہ سر میں مانگ بھی نکالا کرتے تھے، چنانچہ مکی زندگی میں آپ نے سیدھے بال رکھنے کو پسند فرمایا تاکہ مسلمان ان سے ممتاز رہیں، مدینہ میں یہود سیدھے بال رکھتے تھے، تو وہاں آپ نے مانگ نکالنے کو پسند فرمایا، پھر جب تمام عرب نے اسلام قبول کرلیا، تو آپ ﷺ نے دونوں طرح بال رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اسی طرح عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے، یا صرف عمامہ باندھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ابتداءً ہدایت دی تھی کہ وہ ٹوپی اور

عمامہ دونوں کا استعمال کریں، تا کہ ان کے اور مشرکین کے درمیان امتیاز باقی رہے، بعد کو جب اہلِ عرب ایمان لے آئے، تو آپ نے صرف ٹوپی یا صرف عمامہ کے استعمال کی بھی اجازت مرحمت فرمائی ۔

دین کا یہ مزاج کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے دوسری اقوام سے ممتاز اور متشخص رہنا چاہئے، فقہاء نے بھی اپنے اجتہاد و استنباط اور قانون شرع کی تشریح و توضیح میں ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے، اور لباس و پوشاک، خورد و نوش، عبادات، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے طرزِ تعمیر وغیرہ ہر مرحلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ مسلمان ایک امتیازی شان کے حامل ہیں، اور وہ اپنے دین و مذہب اور تہذیب و تمدن میں دوسری قوموں سے ممتاز اور متشخص رہیں، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب سے محروم ہو جاتی ہے، اور تمدن و ثقافت کے میدان میں دریوزہ گری پر اتر آتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے فکر و عقیدہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ہندوستان میں اس وقت سنگھ پریوار کی جانب سے اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان نماز پڑھیں، مسجدوں کو جائیں، عید بقرعید وغیرہ کرلیا کریں، لیکن اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ دیں، اس کے لئے بہ ظاہر معمولی لیکن نتائج کے اعتبار سے دور رس اقدامات کئے جارہے ہیں، نصابِ تعلیم میں تبدیلی لائی جارہی ہے، ہندوازم کو ایک نظریۂ و عقیدہ کے بجائے قومی ثقافت کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے، اسکولوں میں دیویوں، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں، ہندو مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے، اور انہیں شریک کیا جاتا ہے، اور ہمارے مسلمان نوجوان دیوالی اور ہولی میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں، مردوں اور عورتوں کے لئے دھوتی نما پائجامہ بنائے جارہے ہیں، بہت سے علاقوں میں مسلمان عورتیں ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق سندور لگاتی، یا کالی پوت کے ہار پہنتی ہیں، بین مذہب شادی بیاہ کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، بعض جگہ مسلمان بچوں کے ہندی نام بھی رکھے جارہے ہیں، ٹی وی پروگراموں کا ہندو کرن کیا جارہا ہے اور ہندو دیوتاؤں اور فرمانرواؤں کو قومی ہیرو کے روپ میں پیش کیا

جارہا ہے، اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جو ہمارے سماج میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہیں، آج ہم ان کے قدموں کی آہٹ سننے سے قاصر ہیں، لیکن اگر ہم نے حالات کو محسوس نہیں کیا تو مستقبل میں اس سے ناقابلِ تلافی نقصان کا اندیشہ ہے، اس لئے اس وقت اس تہذیبی ارتداد کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے، کہ یہ محض سیاسی وثقافتی مسئلہ نہیں، بلکہ اپنے دوررس اثرات کے اعتبار سے ہمارے ملی بقا اور دینی تحفظ کا مسئلہ ہے !

(..................)

کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟

مسلمان اس وقت ہندوستان میں ہر چہار جانب سے نوع بہ نوع فتنہ میں گھیرے جا رہے ہیں، اسلام سے ان کی محبت اور ہزار ابتلاؤں کے باوجود ایمان پر ان کی استقامت فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بنی ہوئی ہے، جہاں مسلمانوں کی معیشت منصوبہ بند طور پر کمزور کی جارہی ہے، تعلیم کے راستے محدود کئے جارہے ہیں، مسلم تاریخ پر سیاہی پھیرنے اور مسلمانوں کو قومی سطح پر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش جاری ہے، مسلمانوں کے تاریخی نقوش یا تو مٹائے جارہے ہیں، یا تاریخی حقائق میں تبدیلی عمل میں لائی جارہی ہے، اور مسلمان تہذیب وتمدن کو اکثریتی تہذیب میں جذب کرنے کی کوشش جاری ہے، وہیں ایمان وعقیدہ اور دین ومذہب کے پہلو سے بھی ان کو ہدف بنایا جارہا ہے، اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جو مسلمانوں کے ایمان ویقین کے سوداگر اور ان کے دین کے غارت گر ہوں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی قادیانیت ہے، جو اپنے آپ کو احمدی مسلمان کہتے ہیں، حالاں کہ ان کا ایمان سے محروم اور دائرۂ اسلام سے باہر ہونا ایک متفق علیہ حقیقت ہے، مرزا غلام احمد قادیانی پنجاب کے ایک شہر قادیان میں پیدا ہوئے، یہ وہ وقت تھا کہ انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے، اور اہل وطن کا جذبۂ جہاد اپنے شباب پر تھا، انگریز چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی صف سے کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں جو دین ومذہب کا لبادہ اوڑھ کر جذبۂ جہاد کی اس آگ کو بجھائیں اور مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے دوچار کردیں تا کہ وہ باہمی مسائل ہی میں الجھے رہیں، اور انگریزوں کے خلاف ان کی طاقت متحد باقی نہ رہ سکے، اسی پس منظر میں انگریزوں کی شہ پر مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے

مجدد ہونے کا پھر امام مہدی ہونے کا اور اس کے بعد مسیح موعود ہونے کا دعوی کر دیا، مگر مرزا صاحب کسی عہدہ ومنصب پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ ایک زمانہ میں تو خود ہی امکان نبوت کی شدومد سے نفی کرتے تھے، لیکن پھر خود ہی نبی ہونے کا دعویٰ بھی پیش کر دیا، اور نبوت ہی کجا؟ مرزا صاحب نے دعوے تو خدا اور مثلِ خدا تک ہونے کے کئے ہیں، مرزا صاحب کے دعاوی اتنے متضاد اور مختلف ہیں کہ کسی ایسے آدمی سے ان کا صدور کا تصور دشوار ہے جو دماغی اور عقلی طور پر متوازن ہو، مرزا صاحب نے جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان بھی کر دیا اور امت میں انتشار اور بے محل ان کی قوت کے ضائع ہونے کا سروسامان بھی کیا۔ اور یقیناً ان کے اس طرزِ عمل نے انگریزوں کو فائدہ پہونچایا، چنانچہ مرزا صاحب نے اپنے آپ کو "حکومت انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا" (برطانیہ کا لگایا ہوا پودا) قرار دیا ہے، حکومت برطانیہ کی مہربانیوں اور ملکہ برطانیہ کی عنایتوں پر مرزا صاحب جس طرح رطب اللسان ہیں، درباری شاعروں کی خوشامد اور تملق بھی اس پر ہزار بار قربان ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے بوئے ہوئے اس پودے کو تناور بنانے میں اپنی طاقت کی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اولاً پاکستان کی نوخیز ریاست اس فتنہ کا ملجاء وماوی بنی، جب وہاں سے اس کی بیخ کنی ہوئی تو برطانیہ اور اسرائیل کو اس نے اپنا مرکز بنایا، اس وقت صلیبی اور صیہونی طاقتیں اس کی ناصر و مددگار ہیں، بدقسمتی سے ادھر ہندوستان میں بھی انہوں نے اپنی شرانگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کا دامن پھیلا دیا ہے، اور فرقہ پرست طاقتوں سے اپنا گٹھ جوڑ قائم کر لیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ دور دراز دیہاتوں کے جاہل وناواقف مسلمان اپنی جہالت اور ناآگہی کی وجہ سے ان کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں۔

اگر کوئی شخص علی الاعلان کفر کی طرف بلائے اور اسلام سے بغاوت کی دعوت دے تو انشاء اللہ کوئی مسلمان ایسی مذموم دعوت پر لبیک نہیں کہہ سکتا، لیکن جب کوئی فتنہ اسلام کا لباس پہن کر اور دین حق کا روپ بھر کر سامنے آتا ہے تو یقیناً جو لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور

ان کا علم سطحی ہوتا ہے وہ اس فتنہ میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں، اور ان کے تئیں علماء دین اور قائدین امت کی ذمہ داریاں بہت ہیں، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آندھرا پردیش میں ورنگل، نلگنڈہ، کھمم، وشاکھا پٹنم، سریکا کولم اور وجے نگرم وغیرہ کے اضلاع کے دور دراز کے دیہات قادیانیت کے مسموم فتنہ سے بُری طرح متاثر ہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں دیہاتی ناخواندہ مسلمان ہیں، جو ان کے دام تزویر میں آچکے ہیں، مالی تحریص، مساجد و مکاتب کے نام سے نام نہاد عبادت گاہ اور درس گاہ کی تعمیر اور اسلام کے نام پر دھوکہ دہی کے ذریعہ ان مسلمانوں کے ایمان کا سودا کیا جارہا ہے۔

یہ فتنہ تمام فتنوں سے زیادہ سنگین اور یہ مصیبت تمام مصیبتوں سے سوا ہے، یہ ایسی صورتِ حال ہے جو ہر مسلمان کو تڑپا دے، ہر صاحب ایمان کی کروٹوں کو بے سکون کر دے، اور جس سے سیاست کے ہر دردمند کی آنکھیں بے خواب ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب پہلی بار جھوٹی نبوتوں کے فتنوں نے سر اٹھایا اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ ہوا، تو اس نے صحابہ کو بے قرار کر دیا، یہ زمانہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا، خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جوش اور غیرت دینی کا حال یہ تھا کہ ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص ساتھ نہ ہو تو ابو بکر تنہا جہاد کرے گا (رضی اللہ عنہ) یہ بات ضرب المثل بن گئی کہ جب کوئی فتنہ ارتداد اٹھتا اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے والے لوگ نہیں رہتے تو کہا جاتا کہ یہ ایسا فتنہ ارتداد ہے کہ جس کے لئے کوئی ابو بکر موجود نہیں ردۃ و لا ابا بکر لھا — اگر اہلِ بصیرت دل کے کان کھول کر سنیں اور عبرت و موعظت کی نگاہوں سے دیکھیں تو شاید وہ نبوت محمدی ﷺ کو اپنی طرف متوجہ پائیں گے، اور اس صدائے درد کو سنیں گے کہ ہائے میری حفاظت کے لئے کوئی ابو بکر موجود نہیں؟؟

ان حالات میں ضرورت ہے کہ مسلمان مسلک و مشرب کے اختلاف سے پرے اٹھ کر اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مسلمانوں کو اس ایمان لیوا عفریت سے بچائیں۔ اس سلسلہ میں چند تدابیر جو ذہن میں آتی ہیں، وہ ذکر کی جاتی ہیں :

۱۔ مساجد کے خطباء جمعہ کے اردو بیانات میں ختم نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھائیں اور وقفہ وقفہ سے بار بار اس کا ذکر کریں تاکہ عام مسلمان اس سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔ سیرۃ النبی کے جلسوں میں مقررین حضرات اس موضوع پر بیانات کریں اور عوام کو اس کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ کریں۔

۳۔ رسائل و جرائد اور اخبارات میں بار بار اس موضوع پر مضامین شائع کئے جائیں، اردو زبان کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تلگو رسائل میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے۔

۴۔ جو طلبہ درسگاہوں میں پڑھتے ہیں، خواہ وہ درس گاہیں مسلموں کے زیرِ انتظام ہوں یا غیر مسلموں کے، ان میں اس موضوع پر لکچرس رکھے جائیں۔

۵۔ دینی مدارس میں اس موضوع کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شریک نصاب کیا جائے۔

۶۔ عام مسلمانوں کے لئے مختلف علاقوں میں اور خاص کر متأثرہ مقام کے قرب و جوار میں ایک روزہ، دو روزہ، سہ روزہ تربیتی کیمپ رکھا جائے اور ان کو ان کے ذہنی معیار کے اعتبار سے اس مسئلہ کے مالۂ وما علیہ سے آگاہ کیا جائے۔

۷۔ مختلف زبانوں میں ختم نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ پر چھوٹے چھوٹے مختصر، آسان اور مدلل رسائل مرتب کئے جائیں، اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے۔

۸۔ جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بھی اس فتنہ کی شناعت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔

۹۔ ایسے دیہات جو قادیانیت سے متأثر ہو چکے ہیں یا جو متأثر تو نہیں ہوئے لیکن وہاں کوئی مدرسہ، مکتب، مسجد یا کوئی عالم دین موجود نہیں ہے، وہاں مکاتب قائم کئے جائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ مختلف تنظیمیں، جماعتیں

اور بڑے مدارس ان دیہاتوں کو اپنے اوپر تقسیم کرلیں، مثلاً پانچ سو دیہات متاثر ہیں یا ان کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو حیدرآباد سے مختلف تنظیمیں اور مدارس ان میں سے دو، چار، پانچ دیہاتوں میں مکتب قائم کریں اور وہی اس کے ذمہ دار ہوں، اگر کسی مدرسہ میں دس مدرس رکھنے کی صلاحیت ہے تو پانچ مدرس مرکز میں رکھ لے، اور پانچ مدرس کے ذریعہ پانچ بستیوں میں مکاتب قائم ہو جائیں، اس طرح دیہات کے بہت بڑے علاقے کا احاطہ کیا جاسکے گا۔

۱۰۔ جن مدارس میں دارالاقامہ قائم ہے وہ اپنی گنجائش کا کچھ حصہ ان دیہاتوں کے لئے مخصوص کردیں، مثلاً کسی مدرسہ میں دو سو طلبہ کی گنجائش ہے تو سو طلبہ ان دیہاتوں کے اس طرح رکھے کہ بیس دیہاتوں سے پانچ پانچ طلبہ لائے جائیں اور ان کو یہاں تعلیم دی جائے، تاکہ وہ اپنے گاؤں میں مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پوری کرسکیں، اس طرح اگر چند مدرسے باہمی ارتباط کے ساتھ طلبہ کو لائیں تو چند سال میں ہزاروں دیہات تک علم کی روشنی پہونچائی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ اس سلسلہ میں بہت اہم رول تبلیغی جماعت ادا کرسکتی ہے، جماعتوں کا رخ زیادہ سے زیادہ ان دیہاتوں کی طرف کیا جائے، وہاں سے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کی جائے، ایسے علاقوں میں خاص طور پر ضلعی سطح کے اجتماعات رکھے جائیں، اس سے بڑا نفع ہوگا

۱۲۔ دینی مدارس بھی اگر اپنے فنڈ کا کچھ حصہ اس کام کے لئے مخصوص کرلیں اور ہر ماہ دو، تین دنوں کا دورہ ان علاقوں میں وفد کی صورت میں کریں، سفر کے اخراجات تو خود برداشت کریں ہی، مقامی لوگوں سے بھی خورد و نوش کی صورت میں کچھ حسن سلوک کریں تو اس کا بھی بڑا فائدہ ہوگا، اور یہ بھی سنت نبوی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو ہاشم کو دعوت اسلام دینے کے لئے کھانے ہی

پرتو مدعو فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کا عظیم فتنہ ہے، اور اس کے مقابلہ کے لئے سوز صدیق کی ضرورت ہے، حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ہم سے سرگوش ہے کہ کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟؟

(۴؍فروری ۲۰۰۰ء)

اخوت اسلامی کا فقدان

اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو اخوت اور بھائی چارہ کے رشتہ سے باندھ دیا ہے، مسلمان دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ہو، مغرب میں یا مشرق میں شمال میں یا جنوب میں، گورا ہو یا کالا، مالدار ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو یا معمولی مزدور، اور بڑا ہو یا چھوٹا، وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمام اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں، انما المومنون اخوۃ (الحجرات:۱۰) یہ ایمانی رشتہ رنگ ونسل، علاقہ ووطن، زبان اور خون کے رشتوں سے بڑھ کر ہے، یہ رشتہ ہمیں ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان کا رکن بنا دیتا ہے، یہ ہمیں رشتۂ وتعلق کے محدود دائرہ سے نکال کر عالمگیر وسعت میں لے آتا ہے۔

اسی رشتہ نے حبش کے بلال اور روم کے صہیب، فارس کے سلمان، اسرائیلی نسل کے عبداللہ بن سلام، بنو ہاشم کے علی وعباس اور دوسرے عرب کے ابوبکر وعمر وغیرہ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا، یہ ایک دوسرے پر خون چھڑکنے والے، اور باہم خود مٹ کر دوسروں کو بچانے والے لوگ تھے، یہ اسلامی اُخوت ان کے ذہن وفکر اور دل ودماغ پر اس قدر حاوی تھی کہ یہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے اور خود پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دوسروں کو اچھے کپڑے پہنانے میں خوشی محسوس کرتے تھے، یؤثرون علی انفسھم و لو کان بھم خصاصۃ (الحشر:۹)۔

مسلمانوں کے لئے ایمان کے بعد اس اخوت ایمانی کو قائم رکھنا سب سے اہم ضرورت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس رشتہ کو تازہ فرمانے کی سعی کی، آپ ﷺ

نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو ایک مسلمان دوسرے پر ظلم کرسکتا ہے، نہ اسے چھوڑ سکتا ہے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آتا ہے، اللہ اس کی ضرورت میں کام آتے ہیں، جو کسی مسلمان سے مصیبت کو دور کرتا ہے، اللہ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور فرماتے ہیں، اور جو کسی مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیب کو چھپائیں گے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰) اس ارشاد میں آپ ﷺ نے اسلامی اخوت کے پانچ تقاضوں کو بیان فرمایا ہے، اول یہ کہ وہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے، دوسرے یہ ایک دوسرے کے ناصر و مددگار ہوں، اور اپنے بھائی کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے، تیسرے اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آئے، چوتھے اس پر کوئی مصیبت آئی ہو تو اُسے دُور کرنے میں معاون و مددگار بنے، پانچویں اگر کسی مسلمان سے غلطی یا گناہ ہو جائے تو اس پر پردہ رکھنے کی کوشش کرے اور اُسے رسوائی سے بچائے۔

آپ ﷺ نے اس امت کے باہمی تعلق کو بڑی مؤثر اور معنی خیز مثالوں سے سمجھایا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ باہمی محبت اور تعلق میں اہلِ ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، کہ اگر ایک عضو بیمار ہو جائے، تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۱۱، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۶)، اس تمثیل کی معنویت پر غور کیجئے، جسم کے تمام اعضاء یکساں اہمیت اور حیثیت کے حامل نہیں ہوتے، دماغ پورے جسم کا بادشاہ ہے، اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر جسم کا ہر ہر انگ کام کرتا ہے، اور ہر صلاحیت متحرک ہوتی ہے، قلب پورے بدن کے لئے پاور ہاؤس ہے، اگر یہ کسی حصے کو خون کی سپلائی چھوڑ دے، تو لمحوں میں اس حصہ کی موت واقع ہو جائے گی، پھر دوسرے اعضاء میں بھی کچھ زیادہ اہم ہیں، اور کچھ کم، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اگر انگلی کو تکلیف ہو تو دل و دماغ یہ سوچے کہ ایک حقیر عضو کے لئے ہم کیوں مبتلائے رنج و محن ہوں، اور پاؤں یہ نہیں سوچتا کہ تکلیف انگلی کی ہے، ہم کیوں دواخانہ کا چکر لگائیں؟ یہاں تک کہ اگر ناخن بھی ضرورت سے زیادہ کٹ جائے تو پورا جسم اس کی کسک کو

محسوس کرتا ہے، حد یہ ہے کہ بال جو ہیں ہی کاٹنے کے لئے، جس کے کٹنے سے جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا، وہ بھی انسان کو محبوب ہوتے ہیں، تو جیسے جسم کا ہر عضو، دوسرے کے غم میں شریک ہے، نہ اس میں رنگ کا فرق مانع ہے، نہ کسی عضوء کا کم اہم ہونا رکاوٹ ہے، اسی طرح پورا ''اسلامی خاندان'' ایک دوسرے کے لئے لائق محبت ہے، کوئی مسلمان غریب ہو، ان پڑھ ہو، کسی اور مسلک کا حامل ہو، کسی دوسری جماعت اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہو، کسی اور علاقہ یا کسی اور ملک کا رہنے والا ہو، محض اس فرق کی وجہ سے اخوتِ اسلامی کی آگ بجھ جائے، اور انسان اپنے بھائی کے لئے محبت کی شبنم بننے کے بجائے نفرت کا شعلہ بن جائے، یہ یقیناً ایمان کی کمزوری کی بات ہے، جس شخص کا ایمان جس قدر قوی ہوگا، اسلامی اخوت کا جذبہ اسی قدر اس میں موجزن ہوگا، اور حمیت ایمانی جتنی کم ہوگی، تعصبات اور تنگ نظریاں اسی قدر اس کے سینہ کو اپنے لئے پناہ گاہ بنائیں گی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس اسلامی رشتہ کو ایک اور مثال سے سمجھایا، آپ نے فرمایا: یہ پوری امت ایک عمارت کے درجہ میں ہے، جیسے عمارت کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، اسی طرح اس قصر اسلامی کی ہر اینٹ دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہے، **المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا** (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۵) یہ مثال بھی بڑی ہی معنی خیز اور چشم کشا ہے، عمارت کے تمام اجزاء قوت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک درجہ کے نہیں ہوتے، بنیاد کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، پھر ستون ہیں، اس کے بعد چھت ہیں، دیواریں اور فرش بھی عمارت کا حصہ ہیں، عمارت کا ایک حصہ وہ ہے جو لوگوں کے سر پر سایہ فگن ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جو اس کے قدموں کے نیچے روندا جاتا ہے، بنیاد کے پتھر نظر نہیں آتے، اور زیبائش و آرائش کے لئے کھڑے کئے گئے گنبد اور مینار دُور سے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں، بنیاد اپنے آپ کو نیچے دبا کر دوسروں کو سربلند کرتی ہے، یہی حال اس اُمت کے افراد کا ہے، کوئی زیادہ اہم ہے اور کوئی کم اہم، کسی نے ایک کام کو سنبھال رکھا ہے، کسی نے دوسرے کام کو، کسی نے خود کو گمنامی کے غار میں

دفن کر کے دوسروں کو سر بلند کر رکھا ہے، لیکن سب ایک دوسرے کے لئے معاون و مددگار بھی ہیں، اور ضرورت بھی، اگر دیوار کی ایک اینٹ نکال دی جائے، تو پوری دیوار کمزور ہو جاتی ہے، اسی طرح امت کے کسی فرد یا گروہ کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کہ یہ سب ایک دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد کرنے میں ہی پوری امت کا بقاء اور اس کا تحفظ ہے۔

اسلام نے اس رشتۂ اُخوت کو اتنا مضبوط اور مستحکم کیا کہ نازک سے نازک وقت میں بھی مسلمان نے اسے یاد رکھا، اور انہوں نے دوسروں کو کسی مسلمان گروہ پر ان سے اختلاف کے باوجود دست درازی کی اجازت نہیں دی، حضرت علی ﷺ اور حضرت معاویہ ﷺ میں ایک سے زیادہ جنگیں ہوئیں، رومیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانا اور حضرت علی ﷺ پر یلغار کرنا چاہا، تو حضرت معاویہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے حضرت علی ﷺ کی طرف ترچھی نگاہ سے بھی دیکھا تو میں تیری آنکھ نکال لوں گا، یا یہ کہا کہ علی ﷺ کی فوج کا پہلا سپاہی میں ہوں گا، عباسیوں کے عہدِ خلافت میں جب اندلس پر بنواُمیہ کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت بھی عیسائیوں نے بنوامیہ سے تعاون کی پیشکش کی، لیکن اموی بادشاہ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سے ہی یہود و نصاریٰ نے محسوس کیا کہ جب تک اسلامی اُخوت کے اس جذبہ بیکراں پر تیشہ نہ چلایا جائے، مسلمانوں کو زیر کرنا ممکن نہیں ہوگا، چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس مقصد کے تحت ترکی مرحوم کے ٹکڑے بخرے کئے گئے، اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا عظیم سانحہ پیش آیا، اس حقیر کے خیال میں سیاسی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو سب سے بڑا نقصان دو واقعات سے ہوا، ایک حضرت علی ﷺ کے عہدِ خلافت میں عراق اور شام میں دو الگ الگ مسلم مملکت کا وجود، کیونکہ اس وقت تک عالمِ اسلام کی تقسیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اس تقسیم نے بعد کو چل کر الگ الگ مسلم مملکتوں کے تصور کو تقویت پہونچائی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں خلافتِ اسلامی سے آزاد مسلمان مملکتیں قائم ہونے لگیں، خود ہندوستان

بھی اس کی ایک مثال ہے، جہاں بعض مسلم سلطنتوں کے اندر خطبہ میں خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا اور بعض میں نہیں، اور جہاں پڑھا جاتا تھا، تو وہ بھی برائے نام، خلیفہ سے کوئی حقیقی ربط و تعلق نہیں ہوتا تھا۔

دوسرا حادثہ خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہے، خلافتِ عثمانیہ جیسی کچھ بھی ہو، لیکن بہر حال وہ مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور مرکزیت کا ایک نشان تھی، اور دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی افتاد آئے، مسلمانوں کی نگاہ مرکزِ خلافت کی طرف اٹھتی تھی، اور یہیں سے اس کی ترجمانی ہوتی تھی، یہ ایک ایسی بنیاد تھی، کہ جس کو وسیلہ بنا کر پوری دنیا کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا جا سکتا تھا، اس حقیقت کو اس دور کے ناسمجھ عرب اور ترک قائدین نے نہیں سمجھا، اور مغرب کے اشارہ پر خلافت ختم کر دی گئی، پھر اس اسلامی اخوت کے جذبہ کو سرد کرنے اور ان کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے لئے مغرب نے وطن پرستی کی کاشت لگائی، اور اسے خوب آبیار کیا، کیونکہ یہی وطنی قومیت کا جذبہ اسلامی اُخوت کا بدل بن سکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ شام، مصر، حجاز، یمن، ترکی، عراق اور پورا عالمِ اسلامی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا، اور آج وہ مغرب کے لئے بازیچہ اطفال ہے، اسرائیل قتل عام کرے، اور مسلمانوں کی زمین پر غاصبانہ قابض ہو، بوسنیا میں نسل کشی کی جائے، انڈونیشیا اور سوڈان میں مسلمان حکومتوں کے خلاف مرتد عیسائیوں کو ورغلایا جائے، اور الجزائر میں ایک منتخب حکومت کو بلا وجہ تختِ اقتدار سے تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے، تو یہ دہشت گردی نہیں، اور مسلم ممالک کو خود ساختہ الزامات کے ذریعہ دہشت گرد قرار دیا جائے، لیکن اللہ رے سناٹا! کیا مجال کہ کوئی زبان بھی اس کے خلاف جنبش کر سکے!!

یہ محض اُخوتِ اسلامی سے محرومی اور حمیت ایمانی سے مجبوری کا نتیجہ ہے، اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی اور کیا بات ہو سکتی کہ لوگ مسلمانوں کے مسائل کو ملکوں اور علاقوں کی اصطلاحات میں سوچنے لگیں، کہ یہ جغرافیائی تقسیم ہم انسانوں کی تقسیم ہے، نہ کہ خالقِ انسان کی، یہ جغرافیائی لکیریں کیا ایمانی رشتوں کو بدل دیں گی؟ افسوس کہ مسلمانوں

میں بین الاقوامی سطح سے لے کر ملک، ریاست، ضلع، اور شہر کی سطح تک علاقہ پرستی کا مزاج پیدا ہوتا جارہا ہے، جو قومیں دریا کے کناروں کی طرح ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں، وہ تو آج ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، اور جو اُمت جسدِ واحد بنائی گئی تھی، اس کا عضو، عضو ایک دوسرے سے اس طرح روٹھا ہوا ہے کہ ایک کی مصیبت دوسرے کو اشکبار نہیں کرتی۔ **فیا اسفاہ و یا عجباہ!**

(..................)

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

مسلمان آج کیسی زبوں حالی سے دوچار ہیں، یہ محتاجِ اظہار نہیں، خون ان کا اتنا ارزاں ہے کہ بعض اوقات اس کی قیمت پینے کے صاف پانی سے بھی کم ہوتی ہے، مسلمانوں کا قتل عام ہوسکتا ہے، لیکن کیا مجال کہ نامزد قاتلوں پر بھی کوئی آنچ آسکے؟ ملیانہ اور ہاشم پورہ کا مقتل ہو، مراد آباد کی عیدگاہ ہو، یا آسام میں نیلی اور بہار میں بھاگلپور کا مشہد اکبر، کون سی جگہ ہے جو مسلمانوں کے خونِ ناحق سے لالہ زار نہیں؟ مال واسباب اور دکان و کاروبار انہیں مسلمانوں کے لوٹے جاتے ہیں، حیدرآباد میں، جمشید پور میں، مرادآباد اور بھاگلپور میں، راوڑ کیلا اور احمد آباد میں شاید اب بھی ایسے تلخ واقعات کے نقوش موجود ہیں، عزت وآبرو چھپ کر بھی نہیں بلکہ برسرِ عام کن کی نیلام ہوتی ہے؟ مظلوم مسلمانوں کی! اگر سورت کی سڑکوں کو قدرت کی طرف سے قوتِ گویائی دے دی جائے تو شاید آج بھی وہ گواہی دے اور پھر اس انسانیت سوز اور شرافت دوز حرکتوں کا ویڈیو بھی تیار ہوتا ہے اور بمبئی کے گلی کوچوں میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے تاکہ مسلمان خوب بے آبرو ہوں، اور ان کی ذلت ورسوائی اپنی نہایت کو پہنچ جائے۔

یہ تو مسلمانوں کے جان و مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی بات ہے، لیکن کونسا میدان ہے، جس میں ان کا حال بہتر ہے؟ معاشی اعتبار سے وہ اتنے گئے گذرے ہیں کہ معاشی پسماندگی میں اب کوئی قوم ان کی شریک وسہیم نہیں، تعلیمی صورتِ حال یہ ہے کہ اب ناخواندگی کی سطح مسلمانوں میں ہریجنوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے اور ہماری تعلیمی پسماندگی ملک میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہمارا

حصہ دو تین فیصد بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اتر پردیش ملک کی اہم ترین ریاست ہے۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بھی قابلِ لحاظ ہے، لیکن ریاست کے اضلاع میں سے ایک میں بھی مسلمان ڈی ایم نہیں، کوئی کمشنر مسلمان نہیں، کوئی آئی۔ جی، ڈی، آئی جی مسلمان نہیں، ملک میں قومیائے ہوئے بینکس ہیں، جن میں ۲۶۷ رڈائرکٹرس ہیں، ان میں مسلمان صرف چار ہیں۔

ہم ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم سب سے بے وزن سیاسی قوت ہیں، ہندوستان میں سکھوں کی آبادی کا تناسب دو فیصد ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب حکومت کے بیان کے مطابق بھی ۱۳ رفیصد ہے، جو یقیناً حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے، لیکن سکھ بھی اپنی ایک سیاسی قوت رکھتے ہیں، اسی طاقت کا نتیجہ ہے کہ ۳۱ راکتوبر ۱۹۸۴ء کے فساد میں مارے گئے سکھوں کے قاتلوں کو انہوں نے سزائیں دلوائیں اور ایک ایک مقتول کا معاوضہ دس دس لاکھ منظور کرایا۔ لیکن مسلمانوں کو فسادات میں جو نقصان پہونچے، بعض اوقات تحقیقاتی کمیشن قائم ہوئے لیکن اس کی رپورٹ پر کبھی عمل نہیں ہوا، اور بمبئی کے فساد کے سلسلہ میں شری کرشنا رپورٹ کو تو نہایت ہی بے شرمی کے ساتھ حکومت مہاراشٹر نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، اور مسلمان کچھ نہیں کر سکے، یہ تفاوت محض سیاسی بے وزنی کی وجہ سے ہے۔

آخر جو قوم صدیوں اس سرزمین پر فرماں روائی کر چکی ہے اور جس کی عزت و شوکت کے نقوش اور شرافت و انسانیت کے عکوس اس ملک کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں، آج کیوں ذلت و انحطاط کے اس مقام تک پہنچ چکی ہے اور وقت کی ٹھوکریں بھی اس کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے میں ناکام و نامراد ہیں؟ ___ غور کریں تو ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خدا سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا ہے اور فرقہ بندیوں اور باہمی عداوتوں نے ہمیں سمندر کی سی طاقت رکھنے کے باوجود قطروں میں تقسیم کر دیا ہے، ایسا قطرہ جسے دھوپ کی ہلکی سی تمازت اور ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی وجود سے محروم کر سکتا ہے۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کو ایک گونہ ہزیمت سے دوچار

ہونا پڑا، اور ستر صحابہ جاں بحق ہوگئے، قرآن نے تفصیل سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، قرآن میں اس شکست کے اسباب اور اثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے اسی واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا** (آل عمران: ۱۳۰) یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑیوں میں بٹنے سے بچو، اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع سے بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں جھگڑو نہیں کہ آپسی نزاع تمہارے لئے ناکامی اور نقصان کا پیش خیمہ بنے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، **ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم** (الانفال:۴۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی بے وزنی، بحیثیت قوم کے ان کی بے وقعتی اور ہوا خیزی کا اصل سبب یہی آپسی نزاع واختلاف اور بکھراؤ ہے۔ اتحاد واتفاق اور اجتماعیت یوں تو ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آج کے سیاسی پس منظر میں یہ اتنی بڑی ضرورت ہے کہ شاید ہی کبھی اس قدر ضروری رہا ہو۔ فرقہ پرستی کی گھنگھور گھٹائیں ہر سو چھائی ہوئی ہیں۔ پورے ملک کے اُفق پر زعفرانی شفق چھایا چاہتا ہے، شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کا کوئی فرق نہیں، پڑھے لکھے لوگوں، دانش وروں اور جاہل عوام سب پر فرقہ پرستی کا نشہ سا چھاتا جارہا ہے اور اس آتش فشاں سے جو لاوا اُبلنے والا ہے، یقیناً مسلمان ہی اس کا نشانہ ہیں، اور ہماری صفوں میں اتحاد ویکجہتی اور اشتراک وتعاون کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں جس کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا جاسکے، اور اس ملک کے امن وامان کی حفاظت ہوسکے، یہ سیلاب اتنا ہلاکت خیز ہے کہ اگر مسلمان اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ نہ صرف مسلمانوں کے جان ومال کو بلکہ ان کی تہذیب وثقافت اور مذہبی وجود کو بھی ـــــ خدانخواستہ اور ہزار بار خدانخواستہ ـــــ بہا لے جائے گا۔

اسلام میں اتحادِ اُمت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج اظہار نہیں، اُمت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسی چیزوں کی اجازت دی جو عام حالات میں گناہ بلکہ گناہ کبیرہ ہے، جھوٹ بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی کس

قدر مذمت فرمائی ہے؟ لیکن دو مسلمانوں میں اختلاف کو دُور کرنے اور شکستہ دلوں کو ملانے کی غرض سے آپ نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دی، جب دو اشخاص وافراد کا اتحاد اتنا اہم ہے تو مسلمانوں کے دو گروہوں جماعتوں اور تنظیموں کے اختلاف کو دور کرنا اور ان کو ایک صف میں کھڑا کرنا کتنا اہم عمل ہوگا، کہ اس کے لئے تو شاید سو جھوٹ بھی جائز ہو، اسی طرح بُرائی سے روکنا اور برائی کے خلاف آواز اٹھانا مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے، لیکن جہاں ''نهی عن المنكر'' فساد واختلاف کا باعث بن جائے اور اندیشہ ہو کہ اس سے ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو ایسے موقع پر آپ نے وقتی طور پر بُرائی کو انگیز کر لینے اور تحمل برتنے کا حکم دیا، آپ نے ایک بار حضرت ابوذر غفاری ؓ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہو جائیں گے جو تم سے وصول کریں گے اور اپنی عیش کو شیوں میں خرچ کریں گے، ایسے موقعہ پر تم کیا کرو گے؟ حضرت ابوذر ؓ نے عرض کیا کہ میں اس کو نوکِ شمشیر سے سیدھا کر دوں گا، آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرنا، بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا جب تم بھی اللہ سے آملو اور یہ امراء بھی، منشاءِ نبوی یہ تھا کہ منکر اور بُرائی کو روکنے میں ایسے تشدد سے کام نہ لیا جائے جو ملت میں تفریق اور انتشار کا باعث بن جائے، بلکہ ایسے موقع پر صبر وتحمل اور بردباری کا راستہ اختیار کیا جائے، اور ان کے عمل کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے کہ وہی احکم الحاکمین ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ امام مقتدیوں کی نماز کا ضامن ہے، اسی لئے امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدی کی نماز آپ سے آپ فاسد ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے: الامام ضامن، اس لئے امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا حامل ہونا چاہئے، وہ صاحبِ علم ہو، عمدہ قرآن پڑھتا ہو، ورع وتقویٰ کا حامل ہو، لیکن اگر کوئی خراب شخص ہی امام بن جائے اور اس کو ہٹانے میں فتنہ وانتشار کا اندیشہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھی جائے۔ صلوا خلف كل برّ و فاجر۔ گویا امام کا نسبتاً کم بہتر ہونا امت کے اختلاف وانتشار اور نزاع وافتراق سے کمتر ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کی وحدت اور اجتماعیت کو برقرار رکھنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایک تو ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور باہم دست وگریباں ہیں، دوسرے مسلمانوں میں پڑھے لکھے سمجھدار اور باشعور لوگ اس بات کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کے ایسے اختلاف کو دُور کرنے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں، حالانکہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا اوران کی باہمی کدورتوں کو دُور کرنے کی سعی کرنا بھی امت کے اجتماعی فرائض میں سے ایک ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک نماز میں جماعت کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مرض وفات میں بھی جب بالکل مجبور ہو گئے تب ہی آپ کی جماعت فوت ہوئی، لیکن قبیلہ عمرو بن عوف کے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے آپ کو مسجد تشریف آوری میں تاخیر ہوگئی، تاخیر کے باعث حضرت ابوبکرؓ کو امام بنایا گیا، بعد میں آپ شریک جماعت ہوئے (بخاری عن سہل بن سعد ساعدی) غرض، یہ نہایت اہم اور مبارک کام ہے، جس کی طرف مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اتحاد اس طرح نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص یا کوئی تنظیم سوچنے لگے کہ تمام لوگ اپنے وجود کو اس کے وجود میں گم کر دیں، اور اس کے تابع ہو کر اتحاد قائم کریں، اس کی تنظیم اور جماعت کو اپنا مرکز تسلیم کرلیں، ایسا خیال کرنا یقیناً خودفریبی اور خوش فہمی ہی کی بات ہوگی، اتحاد کی بنیاد یہی ہوسکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنا بلکہ ایک دوسرے کے کام اور طریقۂ کار کا احترام کرنا سیکھیں، اگر کام کے میدان الگ الگ ہوں تو اپنے اپنے دائرے بنائیں اور دوسرے کے کام کو بھی قدر ومنزلت سے دیکھیں، اور اگر ایک ہی میدان میں کام کر رہے ہیں تو اس میں بھی تقسیم ہوسکتی ہے، مثلاً اگر ایک شہر میں دو مسلمان سیاسی جماعتیں ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شہر کے حلقہ ہائے انتخاب کو باہم تقسیم کرلیں تاکہ مسلمانوں کا ووٹ بٹنے نہ پائے اور ہمارا اختلاف فرقہ پرست طاقتوں کو فائدہ نہ پہونچائے؟ اس کے لئے اپنی انا کو قربان کرنے، خود پرستی کے خول سے باہر آنے اور جرأت مندی کے ساتھ حقائق کو سمجھنے کی ضرورت پڑے گی، لیکن اگر ہماری سیاسی جماعتیں اس پر تیار ہو جائیں تو یہ نہایت ہی اہم قدم ہوگا۔ اس میں امت کی سرخروئی بھی ہے اور ان

جماعتوں کا بقا بھی۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ اس وقت جس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، وہ کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ایسے لوگ جن کا ایک ساتھ بیٹھنا، سال دو سال پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا اور ایسی جماعتیں جن کے اشتراک کا چند ہفتوں پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ آج ایک دوسرے سے بغل گیر اور سیاست کی بساط پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کھڑے ہوئے ہیں، پھر مسلمان جن میں اتحاد کی کتنی ہی بنیادیں موجود ہیں، کیا وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟ مصیبت اور پریشانی شیر اور بکری اور سانپ اور نیولے کو بھی ایک جگہ جمع کر دیتی ہے، لیکن کیا ہم اس قدر بے حس اور بے شعور اور شخصی مفادات کے حریص اور لالچی ہیں کہ سیلاب بلا اور طوفان بے درماں بھی ہم کو متحد نہیں کر سکتا؟۔ شاید علامہ اقبال کی روح ہم پر نوحہ کناں ہو، اور استفسار کر رہی ہو کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں؟
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

(۶/اگست ۱۹۹۹ء)

بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قسم قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں، ایک سے ایک طاقتور اور خوبصورت سے خوبصورت تر، انسان بظاہر ان کے مقابلہ میں کم تر محسوس ہوتا ہے، اس کو نہ ہاتھی کا ڈیل ڈول حاصل ہے نہ شیر کی قوت، نہ ہرن کی نشیلی آنکھیں، نہ چیتے کی طرح خوبصورت نقش ونگار کا پیرہن اور نہ گلاب کی سی خوش رنگی، لیکن ان سب کے باوجود پوری کائنات گویا اس کے اشاروں پر رقص کرتی ہے، اس کی وجہ انسان کی کچھ امتیازی صلاحیتیں ہیں، انہیں امتیازی اوصاف میں ایک اظہار و بیان کی قوت ہے، قرآن مجید نے انسان پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اللہ نے اس کو بیان سکھایا" (الرحمٰن:۴) گفتگو کے ذریعہ اپنے مقصود کا اظہار اور خیالات وافکار کو الفاظ کا جامہ پہنانا، انسان کی ایسی صلاحیت ہے کہ شاید ہی کوئی مخلوق اس میں اس کی ہمسری کر سکے، شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے، لیکن کبھی اس کے اعزاز میں نہ جلسہ ہوا نہ جلوس، اور نہ کبھی اس نے اپنے خطابِ شاہانہ ہی سے اہل جنگل کو نوازا ہے، مگر یہ حضرت انسان ہیں کہ ان کی تقریروں، نعروں، مشاعروں اور نغموں نے پوری فضاءِ کائنات کو اپنا اسیر بنالیا ہے، اس لئے زبان اور قوتِ بیان اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کی قدردانی بھی اسی نسبت سے واجب ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو میرے لئے دو چیزوں کی ضمانت لے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لوں گا: ایک زبان، دوسرے نفسانی خواہشات" زبان کو قابو میں رکھنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ ہر گناہ نے اپنی فانی لذت کے ساتھ پریشانی اور خطرات کو

بھی دوش بدوش رکھا ہے، چور چوری کرتے ہوئے خطرات سے گزرتا ہے اور مشقتیں اٹھاتا ہے، راہزن رہزنی میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے، لیکن زبان کے گناہ میں نہ کوئی خرچ ہے نہ مشقت، اور نہ دنیا میں جان و مال کا خطرہ، اس سے ایسے لوگوں کو بڑی لذت ملتی ہے جن کو کوئی اور کام نہ ہو۔

زبان بگڑے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور اچھے خاصے ماحول کو بگاڑنے کی بھی، زبان کے ایک بول ہی سے رشتے بنتے بھی ہیں اور بنے بنائے رشتے ٹوٹتے بھی ہیں، ایک ہی بات کو دو طرح سے کہا جا سکتا ہے، ایک انداز ادب کا ہے اور دوسرا بے ادبی کا، کسی نے حضرت عباس ﷺ سے پوچھا: آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ ﷺ بڑے ہیں؟ عمر پوچھنی مقصود تھی، اس لئے سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ میں بڑا ہوں، لیکن حضرت عباس ﷺ نے یہ نہ کہا، فرمایا بڑے آپ ﷺ ہیں، عمر میری زیادہ ہے، ''ھو اکبر و انا اسن'' حضرت عمر ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاص مومنانہ فراست عطا فرمائی تھی، کئی مواقع پر حضرت عمر ﷺ کی جو رائے تھی، اس کے مطابق آیت قرآنی نازل ہوئی، حضرت عمر ﷺ نے خود اس کو بیان کیا ہے، کوئی کم فہم ہوتا تو کہتا کہ فلاں فلاں بات میں اللہ نے میری موافقت فرمائی ہے، مگر حضرت عمر ﷺ کا کمالِ ادب ملاحظہ ہو، فرمایا کہ تین باتوں میں میں نے اپنے رب کے منشاء کے موافق رائے اختیار کی، ''وافقت ربی فی ثلاث'' کتنا ادب ہے اس فقرہ میں!

سب سے بڑھ کر ادب سے معمور زبان اللہ کے پیغمبروں کی ہوتی ہے، کیوں کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

قرآن مجید میں نمرود سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مکالمہ میں اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ میرا خدا وہ ہے کہ جب بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ ''وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ'' (الشعراء: ۸۰) غور کیجئے کہ اصل میں تو بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفاء و صحت بھی،

لیکن بیماری بہرحال ایک تکلیف دہ چیز ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت سے گریز فرمایا اور اپنی طرف نسبت کی، شفاء میں شر کا کوئی پہلو نہیں اس لئے اس کو صراحتاً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔

گفتگو کا سلیقہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے ساتھ مطلوب نہیں، اس کی ضرورت ایک انسان کی دوسرے انسان سے باہمی گفتگو میں بھی ہے۔ ''ماں'' کا لفظ کتنا مقدس ہے، اس میں کس قدر محبت، پیار اور احترام ہے! لیکن ماں کا ترجمہ ''باپ کی جوڑو'' سے کیا جائے تو طبع سلیم کو اس کا سننا بھی گراں گزرتا ہے، خوش سلیقگی کے ساتھ اختلاف رائے ہو تو اختلاف رائے سے بھی گرانی نہیں ہوتی، لیکن بدسلیقگی کے ساتھ ''تعریف'' کے بھی گالی ہونے کا خیال گزرتا ہے، مثلاً آپ کو کسی کی رائے سے اختلاف کرنا ہو اور آپ یوں کہیں کہ تمہیں تو عقل ہی نہیں ہے اور تمہاری یہ رائے بالکل غلط اور مطلقاً ناقابل قبول ہے تو بات ''تو تو، میں میں'' سے بڑھ کر جیب و گریباں تک بھی آسکتی ہے، لیکن اگر اس بات کو اس طرح کہا جائے کہ آپ تو ماشاء اللہ سمجھ دار اور ذی رائے آدمی ہیں، مجھ سے زیادہ عقل و فہم رکھتے ہیں، ممکن ہے آپ ہی کی رائے زیادہ صحیح ہو، لیکن میری ناقص عقل میں فلاں فلاں وجہ سے یہ بات اس وقت مناسب محسوس نہیں ہوتی تو اختلاف میں شدت بھی پیدا نہ ہوگی، دوسرے شخص کے لئے اس کی رائے وقار کا مسئلہ بھی نہ رہے گی اور اس کے لئے آپ کی رائے کی طرف رجوع کرلینا آسان ہوگا، اس لئے حضرت کلیم کا یہ شعر مجھے بڑا پسند ہے اور شاید آپ کو بھی پسند آئے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

(۲۰/فروری ۱۹۹۸ء)

اسلام
نسل پرستی کا علاج

جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں نسل پرستی کے موضوع پر اقوام عالم کی کانفرنس زور و شور کے ساتھ جاری ہے، اور اس کی خبریں روزانہ اخبارات کی شاہ سرخیوں کی غذا بن رہی ہیں، یہ کانفرنسیں نسل پرستی کے ختم کرنے میں کس قدر مفید ثابت ہوگی، یہ تو وقت ہی بتلائے گا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ داروغۂ عالم ''امریکہ'' جو پوری دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کو اپنی خود ساختہ ذمہ داری سمجھتا ہے، وہ اس لئے کانفرنس سے باہر نکل آیا ہے کہ دنیا کی بدترین نسل پرست حکومت اسرائیل کے خلاف ایک حقیقت پسندانہ تجویز منظور ہوگئی ہے، یہ کیسا المیہ ہے کہ جو ملک دنیا بھر میں انسانی حقوق کا احتساب کرتا ہو، وہ خود انسانی حقوق کی پامالی کا بدترین مرتکب ہو، جو دوسروں کے یہاں مچھر بھی چھانتا ہوا سے خود اپنے یہاں اونٹ نگل جانے میں بھی کوئی تکلف نہ ہو۔

اگر اقوامِ عالم حقیقت پسندی سے کام لیں اور تنگ نظری کے خول سے باہر آکر سوچیں اور دیکھیں تو محسوس کریں گی کہ وہ نسل پرستی کی جس دشواری سے دوچار اور وحدتِ انسانی کے جس پیغام کی خواہش مند ہیں، وہ اسلام کے دامن میں موجود ہے، اسلام کی بنیادی تعلیم اور انسانیت کے بارے میں اسلامی تصورات کا ترجمان پیغمبر اسلام ﷺ کا وہ عظیم الشان خطبہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی، تم سب آدم

کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں ہے، مگر تقویٰ کے ذریعہ۔

یہ کوئی معمولی اعلان نہیں تھا، یہ ایک انقلاب کی دعوت تھی، مروجہ فکر کے رُخ کو موڑنے والی اور انسانی ذہن کو جھنجھوڑنے والی دعوت، رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، اس وقت دنیا کی جن قوموں کا ذکر ملتا ہے، ان سبھوں کی فکر نسل پرستی کے تصور پر قائم تھی۔

یہود و نصاریٰ کے بارے میں تو خود قرآن نے کہا ہے کہ وہ کہتے تھے، ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، **وقالت الیهود والنصاریٰ نحن ابناء الله واحباؤه** (المائدہ: ۱۸) خود عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ غیر عرب کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عجمی (گونگا) کی تعبیر خود بتاتی ہے کہ دوسری قومیں ان کی نگاہ میں کیا درجہ ومقام رکھتی تھیں، خود عربوں کے مختلف خاندان ایک دوسرے کے مقابلہ احساس برتری میں مبتلا تھے، اور وہ عبادت و بندگی کے موقع پر بھی اپنے آپ کو اس احساس سے فارغ نہیں کر پاتے تھے، قریش کا حال یہ تھا کہ وہ حج کے موقع سے مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے، اور وہ اسے اپنے مقام کے منافی جانتے تھے، کہ حدود حرم سے باہر عرفات تک جائیں، کعبہ کا دروازہ اس لئے اونچا کر دیا گیا تھا، کہ عام لوگ کعبہ میں داخل نہ ہو سکیں، یہ اونچ نیچ کا تصور دوسرے قبائل کے ذہنوں میں بھی اس طرح بٹھا دیا گیا کہ وہ بھی اپنے آپ کو قریش سے کمتر خیال کرتے تھے، وہ طواف کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ قریش مکہ کے کپڑے پہن کر ہی طواف کریں، یہاں تک کہ جن لوگوں کو قریش کے پہنے ہوئے کپڑے میسر نہ آئیں وہ بے لباس طواف کرتے، مرد دن میں اور عورتیں شب میں۔

اہلِ ایران کا حال یہ تھا کہ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ باور کرتے تھے، شاہِ ایران کو ''خداؤں میں انسان لافانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی'' کہا جاتا تھا، ہندوستان میں بعض خاندان سورج کی اور بعض چاند کی اولاد سمجھے جاتے تھے، اور منو کے قانون کے تحت

نسلِ انسانی کو مستقل طور پر چار طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، سب سے اونچا طبقہ برہمن، دوسرا چھتری، تیسرا ویش اور چوتھا شودر جوان سب میں زیادہ بدقسمت اور کم نصیب طبقہ تھا، چین و یونان اور روم قریب قریب تمام علاقے نسل پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اللہ کی وحدت کے ساتھ انسانی وحدت کا تصور دیا، اور قرآن نے صاف کہا کہ اللہ نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے، اور ایک ہی ماں باپ سے تمام انسانیت کو جنم دیا ہے، **خلقکم من نفس واحدة، و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا كثيرا و نساء ا** (النساء:۱)

رسول اللہ ﷺ کے اس خطبہ میں دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شرف و کرامت اور عزت و فضیلت کا معیار انسان کا عمل اور اس کا کردار و ''اکتساب'' ہے، نہ کہ اتفاقاً اس کا کسی خاص نسل یا خاندان میں پیدا ہو جانا، اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، خود قرآن نے بھی اس حقیقت کو بے غبار لفظوں میں کہا ہے، **ان اكرمكم عند الله اتقكم** (الحجرات:۱۳) یہ وہ تصور ہے جو اونچ نیچ کی غیر فطری، مصنوعی اور خود ساختہ عمارت کی دیوار منہدم کر دیتا ہے، اور یہ گویا نسل پرستی کی شہ رگ پر تیشہ لگانے کے مترادف ہے۔

تیسری اصولی بات جو قرآن نے کہی ہے، وہ یہ کہ خاندان کا مقصد تعارف اور پہچان ہے، نہ کہ تفاخر، اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے کا ذریعہ، ارشاد ربانی ہے:

یا ایها الناس انا خَلَقْنٰکُمْ من ذكر و انثى و جعلنكم شعوبا و قبائل لتعارفوا (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان محض اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

بیشک اللہ نے تم لوگوں سے زمانۂ جاہلیت کا تعصب اور آباء

واجداد پر فخر کرنے کو ختم کردیا، اب یا تو مؤمن تقی ہے، یا بدکار شقی،

گویا انسانیت کی تقسیم عمل کے اعتبار سے ہے نہ کہ خاندان کے اعتبار سے، خاندان بڑے اور چھوٹے ہونے کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ یہ محض پہچان اور شناخت کا ذریعہ ہے، جیسے پہچان کے لئے مختلف افراد کے نام رکھے جاتے ہیں، مختلف علاقوں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، اداروں اور کمپنیوں کا نام ہوتا ہے، اسی طرح یہ انسانی گروہوں اور افراد کی مختلف اکائیوں کے نام ہیں، نسل پرستی اور خاندانی برتری اور کمتری ہمیشہ اسی یقین سے وجود میں آتی ہے، کہ خاندانی نسبتیں ایک دوسرے پر فخر کا سامان ہیں، اور ان نسبتوں سے عظمت وحقارت جسم سے جدا نہ ہونے والے سایہ کی طرح لگی ہوئی ہیں، قرآن نے اس کھوٹی فکر کی اصلاح کی، اور قوموں کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا۔

پھر اسلام نے اسے عملاً برت کر دکھایا، غور کیجئے! حضرت بلال ؓ ایک حبشی نژاد اور نسلاً غلام ہیں، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو اپنا آقا اور سردار برسرعام کہتے ہیں، حضرت سلمان ؓ ایرانی النسل ہیں، لیکن آپ ﷺ ان کو اپنے اہلِ بیت میں شمار فرماتے ہیں، **سلمان منا من اهل البيت**، نماز کی امامت نہایت معزز عمل ہے، آپ نے اس کے لئے علم اور قراءت کو معیار بنایا، اور نسب کا اس سلسلہ میں ذکر تک نہیں فرمایا، عبداللہ ابن ام مکتوم آزاد شدہ غلام ہیں، لیکن پندرہ سولہ دفعہ آپ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو مدینہ کا گورنر نامزد کیا۔

عرب شادی بیاہ کے معاملہ میں خاص طور پر خاندان ونسب کا بہت خیال کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس تصور کو بھی مٹانے کی کوشش کی، حضرت زید بن حارثہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زینب سے فرمایا، جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور جو بعد کو آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں، حضرت مقداد بن اسود بنو زہرہ میں سے تھے، جو بنو ہاشم سے کمتر سمجھے جاتے تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی چچا زاد بہن ضباعہ بنت زبیرؓ سے کیا، اور فرمایا کہ مقداد ؓ اور زید ؓ کا نکاح ہم نے اس طرح اس لئے کیا ہے کہ اخلاق ہی شرافت کا معیار قرار پائے، **ليكون اشرفكم عند**

اللہ احسنکم خلقا ۔ (بیہقی: ۷؍۱۳۷) حضرت بلال ﷜ کو عجمی اور حبشی ہونے کی وجہ سے لوگ اپنی لڑکی دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے بہ نفسِ نفیس ایک عرب نژاد خاتون فاطمہ بنت قیس سے فرمایا، ابوطیبہ نے بنو بیاضہ کے یہاں نکاح کر دیا، آپ ﷺ نے انہیں نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ وفساد پیدا ہوگا، الا **تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر** (بیہقی: ۷؍۱۳۶)، حضرت عبداللہ بن مسعود﷜ نے اپنی بہن سے فرمایا کہ میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی بھی مسلمان سے نکاح کرلو، خواہ رومی ہو یا حبشی ، (المغنی: ۶؍۴۸۰) حضرت عبدالرحمان بن عوف ﷜ نے اپنی بہن سے حضرت بلال ﷜ کی شادی کی ۔ (فتح القدیر: ۲؍۱۸۷) اس طرح کی کتنی ہی مثالیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے درمیان موجود ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے بعد علومِ اسلامی کی جتنی بھی ممتاز شخصیتیں ہیں، ان میں غالب ترین اکثریت عجمی علماء کی ہے، سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہؒ عجمی النسل، سب سے بڑے محدث امام بخاریؒ عجمی النسل، علم کلام اور تصوف کی ممتاز ترین شخصیتیں عجمی النسل ہیں، امام غزالیؒ جیسی شخصیت جس پر علومِ اسلامی کی تاریخ کو ناز ہے، عجمی ہیں، عربی زبان کے رمز شناس اور اس زبان سے متعلق قواعد کے وہ ائمہ جو گویا مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اکثر فارسی النسل ہیں، خود سیبویہؒ امام نحو عجمی ہیں، تفسیر کے بڑے بڑے ائمہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس ﷜ کے اکثر تلامذہ عجمی نژاد ہیں، علوم اسلامی کی تدوین اور ارتقاء میں آزاد شدہ عجمی غلاموں کا بڑا حصہ رہا ہے، اس سے نسل ونسب کے معاملہ میں اسلام کی بے تعصبی اور وسیع النظری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اسلام جہاں گیا، وہ انسانی وحدت واخوت کی سوغات اپنے ساتھ لے کر گیا، اس نے مظلوم انسانوں کو اپنے انسان ہونے کا احساس دلایا اور مختلف علاقوں میں جن لوگوں نے اپنے لئے بڑائی کے بت تراش لئے تھے، ان کی جبر و زیادتی کی چکی میں پسنے والی انسانیت کو عزت وشرافت سے ہمکنار کیا، اور ان میں مقام ومرتبہ کا احساس جگایا، جس کی

بازگشت آج پوری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے، افسوس کہ مغرب آج تک نسلی تفوق کے اس فسوں سے باہر نہ آسکا، نازیوں کا نسلی برتری کا احساس تو کل کی بات ہے، یوگو سلاویہ میں نسلی تطہیر کی شرم ناک اور نفرت انگیز مہم کے لہو تو ابھی خشک بھی نہ ہو پائے ہیں، جس کے پیچھے در پردہ پوری مغربی دنیا تھی، اسرائیل اور یہودیوں میں نسلی برتری کا خیال کوئی نئی بات نہیں، بلکہ بائبل کی عبارتوں اور قرآن وحدیث کی صراحتوں سے ان کا یہ مزاج و مذاق پوری طرح واضح ہے، مغربی دنیا اگر اس نسل پرست قوم کی پشت پر ہے تو چنداں باعث تعجب نہیں، کہ نسل پرستی تو مغرب کی تاریخ رہی ہے، یہودیوں کے علاوہ دنیا کی سب سے بدترین نسل پرست قوم ہندوستان کے برہمن رہے ہیں، جو کئی ہزار سال سے ایک بہت بڑے طبقہ کو عملاً اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں، اور اس ملک کی تہذیب و ثقافت پر ان کی زیادتی کے نقوش اس درجہ نمایاں ہیں کہ جنہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، درحقیقت یہودیت اور برہمنیت نسل پرستی کا دوسرا نام ہے، اور اسی لئے ان دونوں کی قربت روز افزوں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا کو نسل پرستی کی لعنت سے نجات پانا ہے اور اس کائنات کو انسانی وحدت کے نغمہ سے معمور کرنا ہے تو اسے رحمت عالم محمد ﷺ کے دامن میں آنا اور اسلامی تعلیمات کو فکر و نظر کا سرمایہ بنانا ہوگا۔ جس نے انسانی وحدت کا انقلابی تصور انسانیت کو دیا، جس نے عزت و شرافت کے مصنوعی اور کھوٹے معیار کو توڑا اور جس نے بتایا کہ اصل میں نسلِ انسانی کا ایک ہی شجرۂ طوبیٰ ہے اور اس سے پھوٹنے والی شاخیں جو الگ الگ ناموں سے موسوم ہوگئی ہیں، یہ محض تعارف کا ذریعہ ہیں نہ کہ تفاخر کا۔

(۷ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

گناہ پر فخر

قرآن مجید نے مختلف انسانی گروہوں کے مزاج اور ان کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، اور ہر ایک کے بارے میں دکھتی ہوئی نبض پر انگلی رکھ دی ہے، اس میں مشرکین کا ذکر بھی ہے، یہودیوں کا بھی، عیسائیوں کا بھی، اور منافقین کا بھی، دعوت حق کے بارے میں کس کا کیا رویہ ہے؟ اور زندگی کے مسائل کے بارے میں کس کے سوچنے کا کیا انداز ہے؟ قرآن نے اس کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اعراب یعنی دیہاتیوں کا جو مزاج قرآن نے بتایا ہے، آج بھی شہری ثقافت سے محروم دیہات کے لوگوں میں پوری طرح وہ کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے، یہودیوں میں زندگی کی بے پناہ چاہت اور موت سے بے حد خوف کی جو نفسیات بیان کی گئی ہے، اسرائیل اس کی جیتی جاگتی مثال ہے، ہر دور میں ایک ایسا گروہ موجود رہا ہے، جس کے ظاہر اور باطن میں ایسا فاصلہ ہوتا ہے، جیسے دریا کے دو کنارے، اور جن کی زبان دل کی رفاقت سے محروم رہتی ہے، اسی گروہ کو قرآن ''منافق'' سے تعبیر کرتا ہے، قرآن کی مدنی سورتوں میں ان منافقین کی ریشہ دوانی اور بزدلی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اتنا مکمل اور بھرپور ہے کہ اس سے بہتر اس گروہ کی تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔

اسی طرح قرآن نے ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو دیدہ و دانستہ سچائی کی مخالفت پر پوری طاقت کے ساتھ کمر بستہ رہتا ہے، اس کی کیفیت ایسی ہے کہ گویا اس کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو، جس کے کان مہر بند کر دیئے گئے ہوں، جس کی آنکھوں پر جھوٹ کا اتنا دبیز پردہ چڑھا ہوا ہے کہ سچائی اسے بالکل نظر نہیں آتی، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ

عَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ. (البقرہ: ۷) ایسا نہیں کہ ان کے سینے میں دھڑکنے والا گوشت کا لوتھڑا ہی نہ ہو، ہے، لیکن سمجھنے سے محروم، کان نام کا عضو، ان کے پاس بھی ہے، لیکن حقائق کو سمجھنے سے قاصر، پتلیاں ان کے حلقۂ چشم میں بھی موجود، لیکن سچائی کو دیکھنے سے قاصر، لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين ، لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها.

قرآن کی ان تعبیرات کو اگر ایک فقرہ میں سمیٹا جائے، تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس گروہ کے پاس اعضاء جسم تو ہوتے ہیں، لیکن یہ ضمیر سے محروم ہوتا ہے، جیسے دل کے مرجانے کے بعد جسم ایک لاشہ اور زمین کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے، اسی طرح ضمیر کی موت انسان کے اندر چھپی ہوئی جوہر انسانیت کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے اور اخلاق و تمدن کی دنیا کیلئے اس کا وجود ایک بار گراں بن جاتا ہے، جیسے مردار جسم انسان کے لئے زہر کی ٹوکری ہے، اسی طرح بے ضمیر اور مردہ ضمیر انسان کی آدمیت کے لئے زہر کا پیالہ ہے، وہ جس منہ سے لگے اسے بھی جوہر انسانی سے محروم کر دیتا ہے، اور ایک ایسے طبقہ کو وجود میں لاتا ہے، جو انسانی شکل وصورت کا درندہ ہوتا ہے نہ کہ انسان،

انسان خطاؤں کا مجموعہ ہے، انسانی ضمیر انسان کو اس کی خطاؤں اور غلطیوں پر متنبہ کرتا رہتا ہے، وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، لیکن اس کی چوٹ بھی محسوس کرتا ہے، وہ گرتا ہے، لیکن گر کر اٹھتا ہے، اور اپنے گرد آلود جسم کو صاف ستھرا بھی کرتا ہے، اگر کوئی شخص غلطی پر غلطی کرتا جائے، لیکن اسے اپنی غلطی پر پشیمانی تک نہ ہو، ٹھوکریں کھائے لیکن اتنا بے حس ہو کہ پتھر کو پھول سمجھ لے، بار بار گرے، لیکن اپنے گرد آلود دامن کو بے داغ و بے غبار تصور کرے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ضمیر میں کوئی رمق حیات باقی نہیں رہ گئی ہے، اس کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، وہ انسانیت کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ ایک زندہ لاش ہے، جس کا تعفن صحت منداور باضمیر انسانوں کے لئے سراسر نقصان دہ اور مضر ہے۔

گجرات کے بدنام زمانہ اور بقول وزیر اعلیٰ بنگال جناب بھٹا چاریہ سب سے زیادہ بے شرم ''چیف منسٹر نریندر مودی'' نے انسانیت کے قتل اور غارت گری کا جو عریاں

رقص سرزمین گجرات میں کیا ہے، اس پر انہیں اتنی مسرت اور عزت کا احساس ہے کہ اس کارنامہ پر وہ گوروپاترا (کاروانِ فخر) نکال رہے ہیں، گویا قتل انسانیت پر فخر کیا جارہا ہے، اس سے زیادہ باعث شرم کوئی اور امر ہوسکتا ہے؟ چور کو اپنی چوری پر، راہ زن کو اپنی راہزنی پر اور قاتل کو اپنے جور وظلم پر بھی پچھتاوا ہوتا ہے، بہت سے مجرمین اپنے ضمیر کی ملامت کی وجہ سے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں، اور بہت سے شدت احساس کی وجہ سے خودکشی کر گذرتے ہیں، یا ان کا دماغی توازن متاثر ہوجاتا ہے، لیکن یہ ایسا شخص ہے جس کے سینہ میں دل نہیں شاید پتھر کی سل ہے، جو احساس سے خالی اور حیاء سے عاری ہے!

دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنی کسی بات پر خوش ہونا کبر ہے، جو سب سے بڑا اخلاقی مرض اور تمام روحانی بیماریوں کی جڑ ہے، دوسروں کو حقیر سمجھے بغیر اپنے اوپر ہونے والی کسی نعمت کا اظہار فخر ہے، لیکن اکثر فخر کی سرحدیں کبر سے جاملتی ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ جب اپنی کسی منقبت کو بیان فرماتے (اور رسول اپنے درجہ ومقام کو واضح کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور ہوتا ہے) تو ساتھ ہی ساتھ فخر کی نفی بھی فرماتے، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں، **أنا سيد ولد آدم ولا فخر**، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے آباء واجداد پر فخر کرنے کو ناپسند فرمایا ہے اور حج کے موقع سے جو لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، اس کو منع کرکے، اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کا مزاج پیدا فرمایا، یہی اسلام کی تعلیم اور اسکا مزاج ہے، کوئی اچھی بات ہو تو اس کا سر خدا کے سامنے جھک جائے اور کوئی غلطی ہو تب بھی جبیں ندامت خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو اور مخلوق کے سامنے زبان پر کلمۂ اعتراف ہو، یہی ایک اچھے انسان کی پہچان ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے کیا خوب فرمایا کہ ہر انسان خطا کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن بہترین خطا کار وہ ہے جس کو اپنی غلطی پر پشیمانی اور شرمندگی ہو، **كل بني آدم خطاء و خير الخطائين التوابون**، یہ اعتراف ہی انسان اور شیطان کے درمیان اصل وجہ امتیاز ہے، سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ذرا سی چوک ہوئی تو وہ ندامت سے پانی پانی ہوگئے، اور اپنی لغزش سے کہیں بڑھ کر توبہ فرمائی، اور جب شیطان نے اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی کی تو بجائے نادم

اور پشیماں ہونے کے اس نے تکبیر اور فخر کا راستہ اختیار کیا اور اسی چیز نے اس کو ہمیشہ کے لئے خالق کائنات کی نظر میں محروم ومغرور بنا دیا، پس برائی اور کوتاہ کاری پر ندامت اور اعتراف کے بجائے فخر "ابلیسی صفت" ہے، اور کسی شخص میں اس کیفیت کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ روح آدمیت سے محروم اور مزاج شیطانی سے قریب ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کو بھی سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آج فخر وتعلّی کے جو بت تراش لئے ہیں، کیا یہ واقعی متاعِ فخر واعزاز ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دولت وثروت آج ہمارے سماج میں وجہ افتخار بن چکا ہے، پرشکوہ عمارتوں پر فخر کیا جاتا ہے، ہماری خواتین کے لئے زیورات کی بھاری مقدار وجہ افتخار ہے، نکاح کی تقریبات میں جس قدر دولت کی نمائش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے اور کھانے پینے کی دعوتوں میں ہمارے یہاں جس تنوع، اسراف اور فضول خرچی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے باعث فخر سمجھا جاتا ہے، یہ سب غلطی پر اعتراف کے بجائے غلطی پر افتخار کی مثالیں ہیں، رشوت اور کرپشن کس قدر لائق شرم فعل ہے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس آمدنی کو بالائی آمدنی اور اوپر کی آمدنی کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں، ماں باپ کو اپنے بال بچوں کی ایسی آمدنی پر شرمندگی اور خفت کے بجائے مسرت اور عجب کا احساس ہوتا ہے، اور جو شخص حلال پر قناعت کی وجہ سے سادہ زندگی گذارتا ہو، اسے بے وقوف اور بے عقل باور کیا جاتا ہے۔

سودی اداروں کی ملازمت ناجائز ہے، فلمی اداکاری ناجائز ہے، لیکن لوگ اپنا اور اپنے عزیزوں کا فخریہ تذکرہ کرتے ہیں، کہ یہ فلاں سودی ادارہ میں فلاں عہدہ پر ہیں، فلمی اداکاروں سے ملاقات کو اعزاز تصور کیا جاتا ہے، مسلمان تنظیمیں انہیں اپنے جلسوں میں عزت کے احساس کے ساتھ مدعو کرتی ہیں، اور ان کی شرکت کی تشہیر کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ اور گناہ گاروں پر فخر کرنے ہی کی صورتیں ہیں، مسلمانوں میں شاید ابھی یہ بلا نہیں آئی، لیکن دوسری قوموں میں مغرب کے زیر اثر حسن کی نمائش کا جو ذوق چل پڑا ہے، اس نے سماج کو اتنا بے حیاء کر دیا ہے کہ والدین اپنی لڑکیوں کے حسن کے عریاں ہونے پر خوشی میں ناچتے اور رقص کرتے ہیں، "حسنِ بے پردہ" تو وجہ عار تھا، لیکن مردوں کی نگاہ

ہوس نے عورتوں کا استحصال کرنے کے لئے اسے وجہ افتخار بنا دیا۔

بعض لوگ بدزبان اور بد مزاج ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر برہمی اور اپنے بزرگوں اور سماج کے باعزت لوگوں پر حرف گیری کا مزاج رکھتے ہیں، جس کو جو جی میں آیا کہہ دیا، بلکہ موقعہ ہوا تو دشنام طرازی سے بھی نہیں چوکے، پھر اسے فخریہ بیان کرتے ہیں، اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں، یا اسے صاف گوئی کا عنوان دیتے ہیں، حالانکہ صاف گوئی کے معنی دوسروں پر طنز و تعریض یا تنقیص نہیں، اور اپنی ان نازیبا باتوں پر فخر بھی کرتے ہیں، کہ ہم نے فلاں کو ایسی کھری کھری سنائی اور فلاں شخص کو برسرِ عام ایسا اور ویسا کہا، حالاں کہ یہ سب قابلِ شرم باتیں ہیں نہ کہ قابلِ فخر، ان پر انسان کو شرمانا چاہئے نہ کہ اترانا۔

غرض گناہ پر شرمانے، لجانے اور عفو خواہ ہونے کے بجائے فخر کرنے، اترانے اور اپنی عزت محسوس کرنے کا ایک مزاج سا بن گیا ہے، یہ سماج کے بے ضمیر ہونے اور اس کے جوہرِ انسانیت کے مردہ ہو جانے کی ایک علامت ہے اور کیوں نہ ہو کہ حکمرانوں کا اثر رعایا پر پڑتا ہی ہے: **الناس علی دین ملوکھم**، جس سماج میں گناہ پر فخر ہونے لگے اور غلطی وجہ ندامت ہونے کے بجائے وجہ افتخار قرار پائے، وہاں برائیاں پنپتی ہی رہیں گی، اور جور و ظلم میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا، کیوں کہ جب گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھا جائے تو گناہ پر ٹوکنے والی زبانیں اور گناہ سے روکنے والے ہاتھ کہاں رہیں گے؟ جو لوگ خدا پر اور آخرت پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں ان سے گناہ پر فخر کرنے کے بابت کیا شکوہ کیا جائے، اصل شکوہ تو اپنے ان بھائیوں سے ہے جو دینِ حق کے حامل و ترجمان ہونے کے باوجود گناہ کے بارے میں اتنے جری ہیں کہ انہوں نے نیکی و بدی کی اصطلاحیں ہی بدل دی ہیں اور برائیوں کو نیکی کا نام دے دیا ہے!

فسادات کا سبق

گجرات کے حالیہ فساد نے ایک بار پھر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک طبقہ نے اب تک ہندوستان کے ہمہ مذہبی اور ہمہ تہذیبی کردار کو قبول نہیں کیا ہے، جو لوگ اس ملک میں اقلیتوں کے بھارتیہ کرن کا نام لیتے ہیں اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے قومی دھارے میں شامل ہونے کی خواہش کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ اقلیتوں کو اپدیش دینے کے بجائے اکثریتی طبقہ میں پائے جانے والے فرقہ پرست عناصر کی صحیح تربیت کریں اور ان کو انسانی زندگی کی اہمیت کا سبق پڑھائیں۔

گجرات کے حادثہ میں غیر جانب دار ذرائع کا خیال ہے کہ دو ہزار سے زیادہ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ان میں بڑی تعداد خواتین اور کمزور و معصوم بچوں کی ہے، انسان کو مارنے کا شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ اور بے رحمانہ طریقہ اس کو زندہ جلا دینا ہے، گجرات میں زیادہ تر یہی سفاکانہ طریقہ اختیار کیا گیا، حکومت کے حفاظتی عملوں نے دن کی روشنی میں کئے جانے والے اس جور و ستم پر نہ صرف خاموشی اختیار کی بلکہ بلوائیوں کی مدد بھی کی اور ستم زدہ لوگوں کے ساتھ مزید یہ ستم کیا کہ ان کی فریاد بھی صحیح طور پر درج نہیں کی گئی، گذشتہ چند سالوں میں یہ ریاست کئی بھیانک فسادات سے گذری ہے، ہر فساد نے پہلے فساد کے ظلم و جور کا ریکارڈ توڑا ہے اور انسانیت سوزی اور بربریت سے سبقت حاصل کی ہے، جہاں اس ریاست میں بار بار مسلم کش فسادات ہوئے ہیں وہاں قدرت نے بار بار انہیں جھنجھوڑا بھی ہے، زلزلہ کے حادثہ کو تو ایک سال سے ہی زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سے پہلے ایک کم گشتہ بیماری پلیگ نے بھی اسی ریاست کو اپنے پنجہ انتقام میں

کس لیا تھا، طوفان اور سیلاب نیز گجرات کے ایک حصہ میں بدترین خشک سالی ان کے علاوہ ہے، کیوں کہ خدا کو اپنی بسائی ہوئی اس بستی میں ظلم و جور سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں، نہ معلوم اب قدرت کے دست انتقام کے ہاتھوں یہاں کیا کچھ ہونے والا ہے!

اس فساد میں کئی باتیں قابل توجہ بھی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ جہاں وی، ایچ، پی کے جنونیوں اور مفسدوں نے ظلم و جور کی خونی داستان اپنی آدم خور اور انسانیت سوز ترشول سے لکھی ہے، وہیں ہندؤں کو نہ صرف روا رکھتا ہے بلکہ قتل و غارتگری کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

مسلم آبادی میں جو غیر مسلم رہے ہوں اور فساد کے دوران مسلمانوں نے ان کے ساتھ بہتر اخلاق کا سلوک کیا ہو، ضرورت ہے کہ ان کے تأثرات لکھائے جائیں؟ آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ ان تاثرات کو محفوظ کیا جائے اور غیر مسلم بھائیوں تک انہیں پہونچایا جائے، اگر الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا تک ان تأثرات کے لئے رسائی حاصل کی جاسکے تو کیا کہنے ہیں! کیوں کہ آپ بیتی اور خودگذشت کا اثر انسان پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے بنانا چاہئے، جن دیہات اور قریہ جات میں چند مسلمان گھر آباد ہیں یا شہر کے جن اکثریتی محلے میں چند مسلمان رہتے ہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات میں نہ صرف ان کی جان و مال اور عزت و آبرو بلکہ ان کا دین و ایمان بھی خطرہ میں رہتا ہے، وہ فسادات میں اس طرح روند دیئے جاتے ہیں جیسے ہاتھی کی زد میں چیونٹیاں آجائیں، معاشی اعتبار سے بھی ان کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں، غیر مسلم تہذیب و ثقافت بھی انہیں متأثر کرتی جاتی ہے، بارہا یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ایسے علاقوں میں بسنے والے مسلمان اپنی شکل وصورت لباس و پوشاک نیز بول چال اور رکھ رکھاؤ سے ذرا بھی پہچانے نہیں جاتے، بعض علاقوں میں تو ان کے ناموں میں بھی مسلمانیت کی خو، بو باقی نہیں رہی، اور ایسا بھی ہوا کہ مخلوط معاشرہ اور مغلوب ثقافت کی وجہ سے برادران وطن کے تہواروں وغیرہ میں بے تکلف اور پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور پوجا پاٹ وغیرہ میں بھی انہیں کوئی عار نہیں ہوتی، گویا آہستہ آہستہ وہ دین و ایمان سے بھی

محروم ہوتے جارہے ہیں۔

اس ساری صورتحال کا ایک اہم سبب معاشرہ کا اختلاط ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی سے الگ اپنی آبادیاں بنانے کا حکم دیا، قبیلۂ خثعم کے کچھ لوگ غلط فہمی میں مارے گئے، آپ ﷺ نے ان کے سلسلہ میں فرمایا: جو مسلمان کسی مشرک کے ساتھ بودوباش رکھتا ہو، میں اس سے بَری ہوں: ''انی بریئ من کل مسلم مع مشرك '' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں میں سے ایک کی آگ دوسری طرف نظر نہیں آنی چاہئے۔''الا لا ترای نارا ھما '' (نسائی: ۴۷۷۶) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سیوطی نے ''نہایہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''مسلمان پر یہ بات لازم وواجب ہے کہ اس کا گھر مشرک کے گھر سے دور ہو، ایسی جگہ نہ رہا جائے کہ جب وہاں آگ سلگائے تو مشرک کو اپنے گھر سے نظر آئے''

(شرح نسائی: موسوعۃ السنۃ وشروحھا: ۱۶/۳۷)

حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے امن پسند افراد کی بھی تھی جنہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو اپنے یہاں جگہ دی، اور ان کی جانیں بچائی، بلکہ اپنی اس ہمدردی اور انسانیت کی وجہ سے وہ فرقہ پرستوں کی لعنت وملامت، دھمکیوں اور سنگ باریوں کا نشانہ بھی ہے، اس سے امید کی ایک کرن نظر آتی ہے کہ انسانیت ابھی زندہ ہے، ایسا نہیں ہے کہ تمام ہندو خونخواری اور آدم کُشی پر اتر آتے ہیں بلکہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے، عام ہندو سماج قتل وغارت گری کو ناپسند کرتا ہے اور انسانیت، بھائی چارا اور رواداری پر یقین رکھتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ پرست میڈیا جو زہر افشانی کر رہا ہے، ہم ان پروپیگنڈوں کے زہر سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انہیں حقائق سے آگاہ کریں، گروپ میٹنگ، ہندو مسلم مخلوط اجتماعات اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ ہم برادرانِ وطن تک پہونچیں، اور انہیں صحیح صورتحال سے آگاہ کریں، مسلمان اس کام کو مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقہ سے پورے ملک میں انجام دیں، مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈوں کی

جو جنگ چھیڑی گئی ہے یہ اس کا مثبت اور موثر جواب ہوگا۔

اس واقعہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں ہندو کم تعداد میں، ہندؤں نے اس علاقہ کو خالی کر کے ہندو اکثریت محلّہ میں جانے سے انکار کر دیا اور انہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں پر پورے اعتماد کا اظہار کیا، یہ بہت خوش آئند بات ہے اس سے مسلمانوں کی اخلاقی برتری اور کردار کی بلندی ثابت ہوتی ہے، ایسے واقعات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا چاہئے، حق وسچائی نے توپ وتفنگ اور فولاد وآہنگ کی طاقت سے معرکے نہیں جیتے ہیں، بلکہ اخلاق وکرادار کی طاقت اور دلیل و برھان کی قوت سے دشمنوں کے قلوب کو فتح کیا ہے، جنگ وجدال کی فتح سامانیاں اور ظفر بندیاں وقتی اثر ڈالتی ہیں، لیکن ان کا اثر دیر پا نہیں ہوتا، جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، یہی کامیابی ان کے لئے آہستہ آہستہ لوگوں کی نفرت کا باعث بنتی جاتی ہے۔

لیکن! قلب ونظر کی فتح کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ دھیرے دھیرے اپنا قدم بڑھاتی ہے، اور لازوال کامیابی سے انسان کو ہم کنار کرتی ہے، اسی چیز نے اسلام کو اس کی ابتدائی دور میں غلبہ عطا کیا ہے اور یہی چیز ہر عہد میں مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے، انسانی جان و مال اور عزت وآبرو کا احترام مسلمانوں کی فطرت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان ہے ہی وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے محفوظ رہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: مومن ہے ہی وہ جس کا پڑوسی اس کے شر سے عافیت میں رہے، آپ ﷺ نے غیر مسلم بھائیوں کے خون اور مال کو وہی درجہ دیا جو خود مسلمانوں کی جان و مال کا ہے، اسلام کی یہ تعلیمات برادران وطن تک نہیں پہونچی، انہیں بتایا گیا ہے کہ اسلام ایک ناروادار، سخت گیر اور متشدد مذہب ہے، جو دوسرے اہل مذہب کے ساتھ بدسلوکی جس کا رہن سہن کسی مشرک کے ساتھ ہو وہ اسی کے جیسا ہے، ''**جامع المشرك وسكن معه فانه مثله**'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۲۷۸۷) __ علامہ خطابی نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ساتھ ان کے علاقہ میں رہنا درست نہیں، ''**فلا يجوز لمسلم ان يساكن للكافر في بلادهم**'' (موسوعۃ السنۃ وشرحھا: ۹/۱۰۵)

یہاں حدیث کا منشاء یہی ہے کہ مسلمانوں کے محلے اور آبادیاں علیحدہ ہونے چاہئے، علیحدہ آبادی میں ان کی جان کی بھی حفاظت ہے جیسا کہ ظاہر ہے، مال وکاروبار کی بھی حفاظت ہے، اس آبادی میں وہ اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ زندگی گذار سکیں گے، اور اجنبی ثقافت سے اپنے آپ کو بآسانی بچا سکیں گے، جو اسلامی معاشرت کا بنیادی مزاج ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کرنے کو منع فرمایا ہے، ایسی آبادیوں میں دینی تحریکات بھی اپنے کاموں کو بہتر طور پر انجام دے پاتی ہیں، اور اس کی وجہ سے مذہبی وابستگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مخصوص ماحول میں مسلمانوں کی علیحدہ آبادی سے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی مفادات بھی متعلق ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاستی اسمبلی نیز پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے ان کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، مثلاً خود گورنمنٹ کے اعداد وشمار کے مطابق بہار اور یوپی میں مسلم آبادی کا تناسب پندرہ فیصد ہے، اس لحاظ سے بہار میں ان کے ارکان اسمبلی پچاس کے قریب اور یوپی میں ساٹھ سے اوپر ہونے چاہئیں، اسی طرح آندھرا پردیش میں نو فیصد کے قریب مسلم آبادی تسلیم کی گئی ہے، اسی لحاظ سے پچیس سے زیادہ مسلمان ارکان اسمبلی ہونے چاہئیں، لیکن عملاً نمائندگی کا تناسب اس سے بہت کم ہے، کیرالہ میں مسلم آبادی کا تناسب بہار ویوپی ہی سے قریب ہے، لیکن وہاں مسلمان نمائندوں کی تعداد ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہے اور ان کے تعاون کے بغیر کوئی سرکار بن نہیں پاتی، اس کی بنیادی وجہ کیرالا میں مخصوص علاقوں میں مسلمان آبادی کا ارتکاز اور دوسرے علاقوں میں مسلم آبادی کا بکھراؤ ہے، مسلمان اگر مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے قائم کرلیں اور بتدریج وہاں اپنی آبادی کو مجتمع کرلیں تو مستقبل میں ایسی سیاسی طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں کہ وہی اس ملک کے بادشاہ گر ہوں گے اور انہی کے قلم سے حکمرانوں کی تقدیر لکھی جائے گی۔

معاشی اعتبار سے بھی آبادی کا ارتکاز ایک مفید عمل ہوگا، کیوں کہ اس آبادی کی ضروریات کے لئے جن دکانوں اور چھوٹی صنعتوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ مسلمانوں کے

ہاتھ میں ہونگے ،آج صورت حال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے صنعت وتجارت میں اپنے قدم آگے بڑھائے تو فرقہ پرست عناصر انہیں چن چن کرنشانہ بناتے ہیں اور بعض متعصب صنعت کار بھی نہیں چاہتے کہ انہیں ابھرنے دیں، جب مسلمانوں کی اپنی محفوظ آبادیاں ہوں گی ،تو آپ وہاں کل کارخانے بھی قائم کرسکیں گے ،اور آپ کو اپنی تجارت کے لئے ایک مناسب مارکیٹ بھی ہاتھ آجائے گا ،اس لئے یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے باشعور اور معاشی اعتبار سے مستحکم طبقے اس حقیقت کو محسوس کریں ،وہ دور دراز بسنے والے غریب بھائیوں کو اپنے سینے سے لگائیں ،انہیں مناسب قیمت پر اور ادائے گی کی مہلت کے ساتھ زمینیں فراہم کریں اور مسلمان نسبتاً زیادہ بسائیں کہ اس میں نہ صرف ان کی حفاظت ہے بلکہ وہ آپ کی حفاظت کے لئے بھی بہترین ڈھال کا کام کریں گے۔

(۲۰۰۲ء)

مردم سوزی

انسانیت سوزی کا بدترین نمونہ

آہ، اے مظلومانِ گجرات! اور صد آہ، اے ستم زدگانِ دنیائے بے ثبات!! جو مظالم تم بے گناہوں پر ڈھائے جا رہے ہیں، کیوں کر ان کا بیان ہو؟ قلم کا جگر شق ہو جائے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، کہ اگر پتھروں کو دیکھنے کی قوت میسر ہوتی، تو شاید وہ بھی اس بربریت کو دیکھ ریزہ ریزہ ہو جاتے اور سمندر کو رونے والی آنکھیں نصیب ہوتیں، تو شاید ان کے بھی سوتے خشک ہو جاتے، ایسا جور و جفا جنہیں دیکھ کر درندے بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں، اور ایسا ظلم و ستم جنہیں سن کر تاریخ کے ستم شعار لوگوں کی روح بھی وجد میں آجائے، زبان و قلم کی کیا مجال کہ ان مظالم کے شایانِ شان مرثیہ کہے، ان آنکھوں کے سفید اور ٹھنڈے آنسو اس انسانیت سوزی پر کیا قربان ہوں، اگر قلب و جگر کی آنکھیں ہوتیں، اور وہ گرم و حرارت انگیز خون و لہو کے آنسو نچھاور کر سکتیں تو شاید کچھ اس غم کا بیان ہو سکتا، ____ صد ہزار رحمتیں ہوں تمہاری جان پر سوز اور روح شہادت شعار پر، جو جرم بے گناہی کی سزا پا رہے ہیں، اور جنہیں صرف اس لئے آتش نمرود میں جھونکے جانے کی سنت ادا کرنی پڑ رہی ہے کہ وہ خوئے آزری کو قبول کرنے کو تیار نہیں، اور دین ابراہیمی کا علم تھامے ہوئے ہیں؟ ____ تم پر خدا کی بے پناہ رحمتیں ہوں، اور تمہارے لئے خدا کے نام پر مرنا مبارک ہو!!

کتنی عجیب بات ہے، کہ جو لوگ اہنسا اور عدم تشدد کی بات کرتے ہیں، جو انسانی ضرورت کے لئے جانوروں کو ذبح کرنے کو بھی منع کرتے ہیں، ان کا حقیقی چہرہ آج دنیا اپنی چشم سر سے دیکھ رہی ہے، کہ خون خواری و خوں آشامی سے ان کو لطف آتا ہے، اور انسان سوزی کا

تماشا ان کی آنکھوں کو روشن کئے دیتا ہے، اور اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ سنگھ پریوار جس دھرم راج کی نمائندہ وترجمان ہے اس میں پہلے سے انسانیت سوزی کی روایت چلی آرہی ہے، چنانچہ شودر یعنی نچلی ذات والوں کے بارے میں منوجی نے جو قانون مقرر کیا تھا، اس میں دو دفعات اس طرح ہیں:

> اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کر کے اس کے حلق میں اتار دی جائے۔
>
> (۸:۲۷۱)
>
> اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجہ اس کے منھ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے۔ (۸:۲۷۲)

مردم سوزی کی تاریخ بہت قدیم ہے، اسلام سے پہلے خاص طور پر ان لوگوں کو یہ سزا دی جاتی تھی، جو اپنے روایتی مذہب سے منحرف ہو جائیں، اس سلسلہ میں دو واقعات کا ذکر تو خود قرآن میں بھی ملتا ہے، ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور دوسرے اصحاب الاخدود (خندق والوں کا)، حضرت ابراہیم علیہ السلام جس ماحول میں پیدا ہوئے، اس میں شرک کی متنوع صورتیں پائی جاتی تھیں، بتوں کی پوجا عام تھی، اور بڑے بڑے بت خانے بنے ہوئے تھے، قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات کواکب پرست بھی تھے اور چاند، سورج اور ستارے سبھی کی پوجا کرتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے ایک مباحثہ بھی ہوا، ان میں بادشاہ پرستی کا مرض بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں بادشاہ وقت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہونے والے مکالمہ کو نقل کیا ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت ہی بردبار، نرم خو اور شفیق انسان تھے، اور انہوں نے ہر طرح اپنی قوم کو اس برائی کی طرف متوجہ کرنا چاہا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھے، لیکن وہ آپ کی اس خیر خواہانہ کوشش کو ذرا بھی خاطر میں نہ لائے، اور اپنی مشرکانہ روش پر ڈٹے رہے، بالآخر حکومت اور عوام نے مل کر بیک آواز فیصلہ کیا کہ آپ کو زندہ نذر آتش کر دیا جائے، اور یہ شب و روز کی بحث ہی باقی نہ رہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا، اور اس بندۂ وفا شعار

کے رضا بتقدیر کو دیکھئے کہ اپنے رب سے یہ بھی درخواست نہ کی کہ مجھے اس آگ سے بچانے کا سروسامان کیا جائے، کیوں کہ خدا کی راہ میں اپنے گوشت و پوست کو جلانے اور اپنی ہڈیوں کو کوئلہ بنانے سے بڑھ کر کسی مؤمن وفا شعار کے لئے اور کیا عمل ہوسکتا ہے؟

قرآن مجید میں دوسرا واقعہ "اصحاب اخدود" (خندق والوں) کا آیا ہے، (البروج، آیت نمبر:۴)____ یہ حق پرست عیسائی تھے، جو دینِ حق پر ایمان رکھتے تھے، اسی کی پاداش میں ان کے لئے گہری خندقیں کھودی گئیں اور انہیں آگ سے پاٹ دیا گیا، پھر جو اہلِ ایمان تھے انہیں ایک ایک کر کے اس خندق میں پھینکا جاتا، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اس طرح کے کئی واقعات متعدد صحابہؓ سے منقول ہیں، اسی لئے اہلِ علم کا خیال ہے کہ ایسے واقعات ایک سے زیادہ دفعہ پیش آئے ہیں، تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض واقعات میں بیس سے چالیس ہزار افراد اسی طرح زندہ نذرِ آتش کر دیئے گئے۔

خود عیسائیوں میں جو مذہبی جھگڑے کھڑے ہوئے اور مختلف مذہبی فرقوں کا وجود ہوا، تو جو فرقہ طاقت حاصل کر لیتا وہ اپنے مخالفین کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لئے مذہبی عدالتیں قائم کرتا، قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے جان ڈیون پورٹ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاک کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہونچتی ہے (رحمۃ للعالمین: ۲/۲۵۴) عام طور پر یہ سزائے قتل اسی طرح جاری ہوتی تھی کہ مقدمہ کی معمولی سماعت کے بعد ملزم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا، صرف اسپین میں جو عیسائی مخالف مذہبی عدالتوں کے حکم پر زندہ نذرِ آتش کر دیئے گئے ان کی تعداد بیس ہزار سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے، پروفیسر لیکی نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں۔

ارتداد اختیار کرنے والوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متبعین پر بھی جب لوگ قابو پا جاتے تو ان کو نذرِ آتش کرنے میں انہیں خوب لطف آتا، صلیبی جنگوں کے درمیان جب ایک مرحلہ میں بیت المقدس پر عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں کو بشمول بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے شہید کیا ہی، لیکن یہودیوں کو ان کی مقدس قربان گاہ میں جمع کر کے ایک ساتھ نذرِ آتش کر دیا ____ اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی انسان سوزی کی

بہیمانہ خو پائی جاتی تھی، منذر بن امرأالقیس جنگ آوارہ میں قبیلہ بنو شیبان پر فتح یاب ہوا، تو اس نے ان کی عورتوں کو زندہ جلانا شروع کر دیا، اور بعض لوگوں کی منت، سماجت پر بڑی مشکل سے اس سے باز آیا، عمرو بن منذر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نذر مانی تھی کہ بنو دارم پر غلبہ پانے کے بعد اس کے سو آدمیوں کو زندہ جلادوں گا، چنانچہ وہ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوا، قبیلہ کے ننانوے افراد ہاتھ آگئے، اس نے ان سب کو نذر آتش کر دیا، ایک شخص کی کمی باقی رہ گئی تھی، بدقسمتی سے اس وقت ایک دوسرے قبیلہ کا ایک شخص وہاں سے گذر رہا تھا، اس نے بھنے ہوئے گوشت کی بو محسوس کی، تو آگے بڑھ کر جھانک کر دیکھا، کہ شاید کھانا پک رہا ہو، عمرو نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کو بھی آگ میں جھونک دیا تا کہ اس کی نذر تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے، زمانہ جاہلیت کے شعراء نے ان قاتلین انسانیت کی بہادری اور شجاعت کے طور پر اس دل دوز واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے: الجہاد فی الاسلام/۱۹۹-۲۰۰)

ہندوستان میں انسان سوزی کی ایک شرمناک رسم رشتہ وتعلق اور محبت کے عنوان سے بھی پائی جاتی تھی، جو عورتیں بیوہ ہو جاتیں، ایک تو انہیں دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی، خواہ وہ کتنی ہی کم عمر ہوں، لیکن بیوہ عورتوں کے لئے مثالی طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلادی جائیں، اور اس کو "ستی" سے موسوم کیا جاتا، ایک تو ستی کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس کو باعث اجر وثواب اور سبب سعادت قرار دیا جاتا، اس لئے عورتیں خود رضا کارانہ اس اندوہناک عمل کے لئے تیار ہو جاتیں، دوسرے بعض اوقات شوہر یا اس لڑکی کے خاندان والے بھی اسے اس انسانیت سوز فعل پر مجبور کرتے، اور اس طرح آئے دن بے قصور و بے گناہ عورتیں اس رسم کی بھینٹ چڑھادی جاتیں۔

اسلام نے اس غیر انسانی حرکت کو ختم کرنے اور ایسے ظالمانہ طریقہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کی نتیجہ خیز کوشش کی، اسلام نے کہا کہ یقیناً بعض جرائم ایسے ہیں، جن پر قتل کی سزا دینا جرم کے سد باب کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، اوّل یہ کہ جرم پوری طرح ثابت ہو جائے، اور وہ جرم واقعی اس درجہ کا ہو، دوسرے قتل بھی ایسے طریقہ پر ہو جو مقتول کو بہت زیادہ اذیت پہونچانے والا اور تکریم انسانیت کے پہلو کو مجروح

کرنے والا نہ ہو۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اگر جانور کو ذبح کرو تو بہتر طریقہ پر کرو، اور کسی مجرم کو قتل کرنے کی نوبت آئے تو قتل میں بھی بہتر طریقہ اختیار کرو، اگر کوئی باغی فطرت انسان جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو جانور کو جلا دینے کا حکم ہے، کیوں کہ اگر وہ چلتا پھرتا رہے تو اس سے برائی کا چرچا پھیلے گا اور جب کسی چیز کا چرچا ہونے لگتا ہے تو اس سے بھی اس چیز کا چلن بڑھ جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں بھی یہ حکم دیا گیا کہ اولاً اس کو ذبح کر دیا جائے پھر اس کے گوشت و پوست جلا دیئے جائیں۔

آپ ﷺ نے عین میدانِ جہاد میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کسی دشمن کو آگ میں جلانے کی سزا دی جائے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مہم پر روانہ فرمایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم فلاں اور فلاں شخص کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلا دینا پھر جب ہم اپنے مہم پر روانہ ہونے لگے تو فرمایا کہ میں نے فلاں اور فلاں شخص کو جلا دینے کا حکم دیا تھا، لیکن آگ سے عذاب دینا صرف اللہ ہی کا حق ہے، اس لئے ایسا نہ کرنا، البتہ اگر وہ تمہارے ہاتھ آئیں تو انہیں قتل کر دینا، **وان لنار لا یعذب بھا الا اللہ فان وجد تموھما فاقتلوا ھما** (بخاری: کتاب الجہاد، حدیث نمبر: ۳۰۱۶) ــــ یہ بات متعدد روایتوں میں آئی ہے کہ آگ میں جلانے کی سزا دینا اللہ ہی کے شایانِ شان ہے، کسی اور کو اس کا حق نہیں۔

اسلام میں کسی کو جلانے کی سزا نہیں دی جاسکتی، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور دوست ہو یا دشمن، نیز وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو، انسان تو کیا، جانوروں کو بھی جلانے کی ممانعت ہے، قرآن مجید میں پیغمبر خدا حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعہ میں چیونٹیوں کے جلانے کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے پہلی شریعتوں میں اس کی اجازت رہی ہو، لیکن شریعت اسلامی میں کسی حیوان کو بھی آگ میں جلانے کی سزا دینا درست نہیں (دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن، ۱۳/۱۱۹) ــــ بلکہ بعض روایات میں جنگ کے موقع پر بلاوجہ سرسبز درختوں اور کھیتوں کو جلانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، گویا نباتات کو بھی بلا وجہ جلا کر خاکستر کر دینا درست نہیں، چہ جائیکہ انسان اور حیوان، اسی لئے اسلامی تاریخ میں

شاید ہی ایسی کوئی مثال مل سکے کہ مسلمانوں نے اپنے مفتوحین کے ساتھ یہ سنگ دلانہ سلوک روا رکھا ہو۔

عجیب بات ہے کہ جو لوگ دوسروں کو دہشت گرد اور امن شکن قرار دیتے ہیں وہ خود انسانیت کے خلاف ایسے گھناؤنے جرم کا منصوبہ بند طریقہ پر ارتکاب کر رہے ہیں، کہ درندے بھی ان کی درندگی پر شرمسار ہوں، اور آتش ظلم بھی ان کو دیکھ کر پانی پانی ہو جائے،___ الٰہی! ان ننگ انسانیت ظالموں کو ہدایت دے اور اگر ان کے لئے ہدایت مقدر نہیں تو اس زمین پر اُنس و محبت کی جو بستی تو نے بسائی ہے، اسے ایسے جفا شعار لوگوں اور درندہ نما انسانوں سے پاک فرما دے!!

(۳ رمئی ۲۰۰۲ء)

درندگی کی فتح

آج کل بہت سی ایسی الکٹرانک مشینیں ہیں جن میں مشین کی اندرونی کیفیت کے اظہار کیلئے اسکرین لگے ہوئے ہیں۔ مشین میں کہیں سے بھی کوئی خرابی ہو تو فوراً اسکرین پر اس کا سگنل نمودار ہوتا ہے' اور جان لیا جاتا ہے کہ مشین کے فلاں پرزہ میں خرابی ہے' اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں جو خوبصورت' محیر العقول اور نازک مشین بنائی ہے اس میں بھی انسانی کیفیات کے اظہار کیلئے علامتی سگنل رکھے گئے ہیں' کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی جسمانی کیفیات سے ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ بہت سی بیماریاں چہرہ' آنکھ' ہونٹ' زبان اور ناخنوں کی رنگت سے پہچانی جاتی ہیں۔ یا نبض کی حرکت کے ذریعہ ان کا علم ہوتا ہے۔ یہ گویا خود انسانی جسم میں لگے ہوئے اسکرین ہیں جن کے ذریعہ انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات کا علم ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی کیفیات کیلئے بھی قدرت کا ایک نظام ہے جسے سر کی آنکھوں سے دیکھا تو نہیں جا سکتا' لیکن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انسان کوئی بھلائی کرے تو اس میں خوشی کا احساس ہوتا ہے' کوئی برائی کر گذرے تو خواہ وہ کتنی ہی لذت اور سرمستی کا باعث ہو لیکن بعد میں پچھتاوے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' ندامت و شرمندگی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو شرمسار محسوس کرتا ہے۔ یہ وہی اخلاقیات کا اسکرین ہے جو آدمی کو اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں حقیقی صورتحال سے آگاہ کرتا ہے۔

انسان کی اسی قوت احساس کو ''ضمیر'' کہا جاتا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی ارشادات میں انسان کی اس فکری استعداد کی طرف اشارہ فرمایا ہے' مثلاً ایک صاحب نے کچھ سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اپنے دل سے سوال کرو''۔ اصل میں بعض دفعہ انسان کوئی کام

کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا ضمیر اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نفس کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ آدمی ایسا کرنا بھی چاہتا ہے، اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی مستند و معتبر شخص سے اس کے جواز کی سند حاصل کر لے، ایسے موقع پر انسان کچھ الٹ پھیر اور ہیرا پھیری کے ساتھ سوالات کرتا ہے تا کہ اس کے نفس کے تقاضوں کے مطابق جواب مل جائے، ایسے ہی مواقع کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ خود اپنے ضمیر سے اس بارے میں سوال کر کے دیکھو، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں کھٹک پیدا ہو''۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں انسان کی اسی فطری قوت کی طرف اشارہ ہے جو برائی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو تھامنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسان کا اس سے محروم ہو جانا نہایت ہی محرومی اور کم نصیبی کی بات ہے، کہ انسان گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے اور اس کا ضمیر اس کو جھنجھوڑ نہ پائے، اس لئے کہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کی نعمت عطا فرمائی ہے اور خیر و شر کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اگر شر کی طاقت اسے برائی کی طرف دعوت دیتی ہے تو خیر کی قوت اسے برائی سے روکتی ہے۔ اس معاملہ میں عقل و شعور اس کیلئے مدد و معاون بنتی ہے اور اس کی فطرت سلیم بدی کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کھینچتی ہے اور کسی نے ایک دفعہ برائی کر لی تو اس پر شرمسار کرتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور طریقہ پر بھی فطرت انسانی کی اس صلاحیت کو سمجھایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو اسے شر کی طرف بلاتی ہے۔ دوسری وہ جو اسے خیر کی طرف بلاتی اور شر سے روکتی ہے۔ پہلا شیطان ہے اور دوسرا فرشتہ' (مشکاۃ المصابیح حدیث: ۴۷، باب فی الوسوسہ جلد ۱/۶۵)۔ پھر اگر انسان سے برائی سرزد ہو ہی جائے تو وہ از سر نو بدی سے نیکی کی طرف سفر کرتا ہے، اسی کو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان غلطی کرتا ہے۔ لیکن بہتر خطا کار وہ ہے، جسے غلطی کرنے کے بعد اپنے کئے پر پچھتاوا ہو۔

آپ نے اپنے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ غلطی پر پچھتاوا فطرت انسانی کا تقاضہ اور اس کا حصہ ہے۔ آپ دیکھئے شیر اور بھیڑیئے درندے ہیں، یہ صبح و شام

کتنے ہی بے قصوروں کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتے ہیں' لیکن کیا کبھی یہ بات سنی گئی کہ شیر کو اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہوتی ہو' سانپ رات کے اندھیروں میں کتنے لوگوں کو ڈس کر اپنی پیاس بجھاتا ہے' لیکن کیا کبھی اسے اپنی اس حرکت پر پچھتاوا بھی ہوا ہے؟ نہیں' کیونکہ درندوں کی فطرت میں چیرنا اور پھاڑنا ہی ہے۔ وہ ظلم کر کے خوش ہوتا ہے۔ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اسے سکون ملتا ہے۔ اسے کبھی اپنی ظلم وزیادتی پر پچھتاوا نہیں ہوتا ہے۔ ندامت وشرمساری ان درندوں کی ڈکشنری ہی میں نہیں ہے۔ وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی کو اس سے محروم رکھا ہے۔

لیکن انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان کیسا بھی برا ہو اور کتنا ہی گیا گذرا ہو۔ اس کی فطرت سلیمہ اسے نیکی کی طرف بلاتی اور برائی سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ کبھی انسان کا ضمیر سو جاتا ہے۔ لیکن یہی فطرت انسانی اسے جگاتی اور بیدار کرتی ہے۔ اسی لئے ایسے تو بہت سے واقعات پیش آتے ہیں کہ ایک شخص بڑا ظلم پیشہ ہے' اس نے قتل کا ارتکاب کیا' لوگوں کی جان اور عزت وآبرو سے کھیلا، ان کے مال واسباب لوٹے لیکن جب نشہ جور وستم اترا تو اب ضمیر نے اسے ملامت کرنا شروع کیا۔ یہ ضمیر کی پکڑ اتنی بڑی اور موثر ہوتی ہے کہ اس کا چین وسکون چھین لیتی ہے۔ اسے بے چین کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت سی ہو جاتی ہے۔ احساس کی یہ شدت بعض دفعہ ذہنی توازن کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ ایسے مجرمین ماہرین نفسیات سے رجوع ہو کر اپنی کہانیاں سناتے ہیں اور ذہنی تناؤ اور اندرونی بے چینی کے علاج کے طلب گار ہوتے ہیں۔

لیکن جب انسان بے ضمیر ہو جاتا ہے تو اسے نہ اپنے جرم پر کوئی ملامت ہوتی ہے' نہ مظلوموں کی آہ وفغاں اسے تڑپاتی ہے اور نہ اس کا ضمیر اس کے دل سنگ کے دروازہ پر کوئی دستک لگاتا ہے۔ ایسا انسان درندوں سے بھی بڑھ جاتا ہے کیوں کہ درندوں کی پیاس تو ایک دو انسان یا جانور کا خون پی کر بجھ جاتی ہے لیکن ایسے درندہ صفت انسانوں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ سینکڑوں ہزاروں انسانوں کا خون بھی اسے آسودہ نہیں کر پاتا۔ اس کو انسانی لہو میں وہ لذت ملتی ہے جو کسی بلانوش بادہ خوار کو جام جم کے پینے میں، جسے ایک سلیم الفطرت انسان

گلاب کی خوش رنگ پھلواری اور سبزہ زار کو دیکھ کر خوش ہوتا اور عش عش کرتا ہے۔ اسی طرح یہ جفا شعار انسان نما درندہ انسان کی تڑپتی اور جلتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر وجد میں آتا اور لذت و سرور محسوس کرتا ہے۔ ایسے انسانوں پر شاید درندے بھی شرمندہ اور انگشت بدنداں ہوں کہ یہ کیسی مخلوق ہے جسے اس کے مالک نے زمین پر اصلاح کیلئے پیدا کیا تھا لیکن اس نے اپنی تخریب اور فساد میں ہم درندوں سے بھی آگے قدم بڑھالیا ہے۔

ایسے درندہ صفت لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں کیوں کہ خدا نے اس کائنات میں یہی نظم رکھا ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹے اور شبنم کے ساتھ شعلے بھی رہا کریں، ایسے ہی درندہ صفت انسانوں میں ایک نمایاں نام نریندر مودی کا ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ امن و آشتی اور صلح و رواداری کے داعی ونقیب مہاتما گاندھی جی بھی یہیں پیدا ہوئے اور نریندر مودی جیسے شخص نے بھی اسی زمین میں جنم لیا۔ درد اور درد کا درماں بھی، زخم بھی اور زخم کا مرہم بھی بھارت واسیوں کو اسی کھیت سے مل رہا ہے۔ مودی کی ظلم و زیادتی اور مردم آزاری وخوں آشامی پر تو جتنا افسوس کیجئے کم ہے ہی، لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک اور شرمناک بات یہ ہے کہ گجرات کے لوگوں نے جور وظلم کے جاری رکھنے کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ ایک بے ضمیر شخص کو رسوا کرنے کی بجائے اسے عزت دی گئی ہے۔ ظلم کے ہاتھ تھامنے کی بجائے اسے مزید طاقتور بنایا گیا ہے۔ یہ اور زیادہ شرمناک بات ہے اور انسانیت، جمہوریت اور رواداری کے نام پر کلنک ہے۔

درندی اور ظلم و جور کی اس فتح میں سیکولر پارٹیوں کا کیا قصور ہے؟ اسے تو وہ سمجھیں، لیکن اس میں ہم مسلمانوں کی غفلت شعاری اور کوتاہی کو کیا دخل ہے؟ اس کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنانے اور ان کے دلوں سے شکوک وشبہات کے کانٹے نکالنے میں کیا محنت کی؟ اپنے پڑوسیوں سے اپنے تعلقات کو بہتر کرنا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے اور اس پر ہر جگہ اور ہر سطح سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۔ سماج ہی انسان کا اصل محافظ ہے اور اس کیلئے معتدل اور خوشگوار تعلقات

ضروری ہیں، یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہوسکتا، اس کیلئے مسلسل اور متواتر محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم حوصلہ نہ ہاریں اور مناسب طور پر اس سمت میں کوشش کریں تو ہم ضرور برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر کر سکتے ہیں اور فرقہ پرست طاقتوں کا سحر توڑنے میں ہمیں کامیابی ہوسکتی ہے۔

دوسری ضروری بات حکمت اور مصلحت اندیشی سے متعلق ہے کہ کس وقت کس بات کا کیا اثر ہوگا؟ کونسی باتیں علی الاعلان کہنے کی ہیں اور کونسی باتیں چھپ کر پہنچانے کی ہیں۔ اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع سے جب حضرت نعیم ابن مسعود مسلمان ہوئے تو آپ نے انہیں اپنا ایمان چھپانے کا مشورہ دیا کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کا مفاد اسی میں تھا۔ گجرات میں علما اور قائدین نے کانگریس کے حق میں متفقہ اپلیں جاری کیں۔ ان اپیلوں کو سنگھ پریوار نے شرانگیزی کا ثبوت دیتے ہوئے فتوی سے تعبیر کیا، اس اعلان نے ہندو ووٹ کو متحد کیا اور جو ووٹ بکھرے ہوئے تھے مذہبی بنیاد پر ان کی صف بندی ہوگئی۔ اسی طرح سنگھ پریوار کی مراد بر آئی اور درندگی نے انسانیت پر اور ظلم نے انصاف پر فتح حاصل کی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے مواقع پر جوش پر ہوش کو غالب رکھیں اور جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقائق اور واقعات کو ملحوظ رکھیں۔

(۲۱ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

ایک مظلوم کا مقدمہ۔انصاف کی عدالت میں

مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں بہت سے غم دیکھے ہیں، چوٹیں سہی ہیں، زخم کھائے ہیں، دکانیں لٹائی ہیں، اپنے عزیزوں اور بزرگوں کی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں، کبھی کبھی عزت وآبرو کی قربانی بھی دینِ حق پر استقامت کی پاداش میں دی ہے اور اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے لہو کے انمٹ نقوش سے لالہ زار کیا ہے، لیکن ۶ر دسمبر کا زخم ایسا ناسور ہے جو کسی طور مندمل نہیں ہوتا، اور جب تک دوبارہ یہاں اللہ کا گھر نہ بن جائے اور اس کے میناروں سے اللہ کی کبریائی اور توحید کی اذان جانفزا بلند نہ ہونے لگے اس وقت تک اس غم کا مداوا نہ ہو سکے گا، مسلمانوں کی اگلی نسلیں بھی اس غم کو فراموش نہ کرسکیں گی، کہ متاعِ غم متاعِ حیات بن چکا ہے اور اسے لٹایا نہیں جا سکتا۔

فرقہ پرست عناصر کہتے ہیں کہ بابری مسجد رام جی کی پیدائشی مقام پر بنائی گئی ہے، یہ دعویٰ عقل ونقل اور تاریخ وآثار ہر پہلو سے غلط ہے، اولاً تو یہ بات ہی متعین نہیں کہ کیا رام جی کا حقیقی معنوں میں وجود تھا یا محض ایک افسانوی نام اور علامتی کردار ہے؟ کیونکہ رام جی سے وابستہ جو تاریخ ہندو مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اس کے توہماتی اور دیومالائی ہونے میں کسی حقیقت پسند ہندو دانشور کو بھی شک وشبہ نہیں، اس لئے بہت سے ہندو دانشوروں کا بھی خیال ہے کہ رام جی، کی حیثیت ایک افسانوی کردار کی ہے نہ کہ حقیقی شخصیت کی۔ اگر مان لیا جائے کہ رام جی کا حقیقی وجود تھا اور آپ ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے تو سوال یہ ہے کہ ایودھیا سے کون سا علاقہ مراد ہے؟ کیوں کہ حال ہی میں آثارِ قدیمہ کے ڈپٹی سپرینڈنٹ ایم وی این کرشنا راؤ نے انکشاف کیا ہے اور ثبوتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ اصل ایودھیا ہریانہ کا مقام ''بناوَلی'' ہے (قومی آواز دہلی ۶ر مارچ ۹۸ء) واضح ہو کہ مسٹر

راؤ آثارِ قدیمہ کے ماہرین میں سے ہیں، رامپور کے ایک پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ رام جی کی پیدائش کی اصل جگہ رام پور ہے، اور اس سلسلہ میں اس کے پاس ثبوت موجود ہے، اس طرح کے دعویٰ کو بے دلیل نہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شہر کسی نام سے معروف تھا اور یہ اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے کافی دور پہنچ گیا، شہر کے باشندے اور کاروباری نقل مکان کرتے رہے اور پھر وہی دوسری جگہ اس شہر کے نام سے موسوم ہوگئی۔

اگر ایودھیا وہی جگہ ہے جو اس وقت ''ایودھیا'' کہلاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس شہر میں رام جی کی پیدائش کس جگہ پر ہوئی؟ کیوں کہ اس وقت ایودھیا میں تقریباً نو دس ایسے مندر موجود ہیں جن کی بابت ان مندروں کے متولیوں کا دعویٰ ہے کہ یہی رام جی کی جائے پیدائش ہے، پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں رام جی کی اصل جائے پیدائش معلوم کرنے کے لئے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اس کمیٹی نے کافی تلاش وجستجو کے بعد دو مقامات کے بارے میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ رام جی کی جائے پیدائش ہو، ان میں سے ایک کا نام ''رام جنم استھل'' رکھا اور دوسرے کا ''رام جنم بھومی''، (DISPUTEDMOSQUE) یہ دونوں جگہیں بابری مسجد کے علاوہ ہیں، بابری مسجد کے محلِ وقوع کے رام جی کے جائے پیدائش ہونے کا ذکر مفسد اور تفرقہ انداز انگریزوں سے پہلے نہ کسی تاریخی کتاب اور سفرنامہ میں ہے اور نہ ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں میں۔

اگر یہ بات فرض بھی کرلی جائے کہ رام جی کی جائے پیدائش وہی جگہ ہے تو بھی اس بات کا ثبوت مطلوب ہوگا کہ اس جگہ پر مندر بھی بنایا گیا تھا؟ اور اگر اس مقام پر مندر کے پائے جانے کا کوئی ثبوت ملتا ہے تب بھی یہ بات محتاجِ دلیل ہے کہ مسلمانوں نے اس جگہ جبراً مسجد بنائی ہے، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقام کے باشندوں نے اس جگہ کو مسلمانوں سے فروخت کردیا ہو اس لئے کہ مسلمانوں کے یہاں مسجد کی زمین خرید و فروخت نہیں کی جاسکتی، لیکن دوسری قوموں کے یہاں مذہبی عبادت گاہوں کے بارے

میں ایسا تقدس نہیں پایا جاتا، چنانچہ یورپ میں یہودی اور عیسائی بے تکلف اپنے چرچ فروخت کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے اس مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کیا تھا، لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابلِ یقین ہے، کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا بھی ہو، بابر نے خودترکی زبان میں ''بابرنامہ'' تحریر کیا ہے نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے، بابرنامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور مقیم ہوا تھا، چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں، (بابر صفحہ ۹۳) پروفیسر آرناتھ (یونیورسٹی جے پور راجستھان) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا، (بابر صفحہ ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہو اس کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے، اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بابر کٹر مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا، منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، راجہ شیو پرشاد نے اپنی کتاب ''آئینہ تاریخ'' کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دور میں نظم حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا، پروفیسر آرناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جاسکے، پروفیسر سری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو، پروفیسر آر سی رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا (بابر صفحہ ۸۰) مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' میں بابر کی

عالی ظرفی اور حسنِ سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پروفیسر بنرجی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مندر اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے، اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے (بابر صفحہ ۸۲) یہاں تک کہ بابر نے اپنے وصیت نامہ میں گاؤکشی سے منع کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ ۱۹۹۵ء میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے۔

> ''میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں...... رام چرت مانش'' یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنایا گیا ہے، اس مقصد کے لئے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کئے کہ مسجد کے ستون غیر اسلامی ہیں وغیرہ، ورنہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کیا تھا، اکبر کو چونکہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا، اس لئے اس نے اس سے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بنوادی، ۱۹۴۶ء سے پہلے غالباً بابری مسجد کے محلِ وقوع کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ

عدالت میں گیا اس وقت مہنت رگھو برداس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو سردی گرمی اور برسات سے بچانے کے لئے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو عدالت نے یہ عرض رد کردی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

پھر غور کیجئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا جائز نہیں گو کہ نماز اس سے ادا ہو جاتی ہے لیکن مغصوبہ زمین پر نماز ادا کرنے والا گنہگار ہے اور ظاہر ہے کہ مسجدیں ثواب کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں نہ کہ گناہ کے لئے، تو کوئی مسلمان کیسے ایک زمین غصب کر کے مسجد تعمیر کر سکتا ہے؟ اس لئے نہ عقل اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، نہ تاریخ کی گواہی اس کے حق میں ہے، علم الآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ عقل ہی اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، اس لئے بابری مسجد کا مسئلہ اس ملک کی جمہوریت اور نظام عدل کے لئے ایک چیلینج اور امتحان ہے جب تک اس مظلوم مسجد کو انصاف نہیں ملے گا اس ملک کی جمہوریت اور رواداری کا چہرہ داغ دار رہے گا۔

(یکم ر دسمبر ۲۰۰۰ء)

دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یوں تو اللہ تعالیٰ کا ہر حکم بندہ کے لئے واجب التعمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی نسبت سے جو گناہ بہ ظاہر معمولی نظر آتا ہے، وہ بھی غیر معمولی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں، جن سے دین اور امتِ اسلامیہ کی شناخت متعلق ہے، ایسی ہی چیزوں کو قرآن مجید نے شعائر اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ بات فرمائی ہے کہ ان کی حرمت پامالی نہ کرو، **لا تحلوا شعائر الله** (المائدۃ:۱) اسی کو قرآن میں دوسری جگہ "**حرمت الله**" سے تعبیر فرمایا گیا ہے، (الحج:۳۰) اور بتایا گیا ہے کہ جو اللہ کی حرمتوں کی عظمتوں کو برقرار رکھے گا وہ اس کے لئے اس کے پروردگار کے نزدیک بھلائی کا سامان ہوگا، **فھو خیر لہ عند ربہ** (الحج:۳۰) یہ بھی ارشاد ہوا کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم نیک دل اور خدا ترس ہونے کی علامت ہے، **ومن یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب** (الحج:۳۲)

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا، اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب نے انہیں آ پکڑا، قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سفینۂ نجات بنایا، یہ بھی اللہ کی ایک نشانی تھی، آپ علیہ السلام کی قوم نے کشتی کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کا برتاؤ کیا، اور بالآخر پوری قوم عذاب خداوندی میں مبتلا ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر اونٹنی کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، جسے قرآن نے "**ناقة الله**" یعنی اللہ کی اونٹنی کا نام دیا ہے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ایسے عذاب میں گرفتار ہوئی کہ صفحۂ ہستی سے نام ونشان تک مٹ گیا، اس طرح کے کتنے ہی عبرت خیز واقعات ہیں، جو قرآن اور بعض دیگر آسمانی

کتابوں میں نشانِ عبرت کے طور پر مذکور ہیں۔

مساجد بھی شعائر اللہ میں داخل ہیں، یہ اللہ کی عبادت و بندگی کا مرکز ہیں، مسجد کو دیکھتے ہوئے غافل سے غافل بندہ کو بھی ایک لمحہ کے لئے سہی، اپنا خالق و مالک یاد آتا ہے، یہیں سے شب و روز اور بار بار اللہ کی توحید اور کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے، اس لئے یقیناً مسجدیں شعائر اللہ میں داخل ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے احترام کا خصوصی حکم دیا، اور ناواقفیت میں اگر کبھی کسی سے کوئی بات احترامِ مسجد کے خلاف ہوگئی تو تنبیہ کے طور پر اس پر جی برہمی کا اظہار فرمایا، مسجد کی عظمت و تقدس کے لئے یہ بات کافی ہے کہ انبیاء کرام نے عملی طور پر مساجد کی تعمیر میں شرکت فرمائی ہے، ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنے مبارک ہاتھوں سے کعبۃ اللہ کی تعمیر کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے، اور مسجد نبوی میں پیغمبر اسلام ﷺ کے پتھر اٹھانے کا احادیث میں ذکر آیا ہے، اس لئے خدا کی نظر میں اس کے گھر کی جو اہمیت و عظمت ہے، اور اس کی حرمت و مرتبہ کی رعایت جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔

اس لئے مساجد کی بے حرمتی کرنے والے اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے، دیر سویر خدا کا ہاتھ ضرور انہیں آپکڑے گا، قرآن مجید نے اس طرح کے ایک واقعہ کی طرف بہت واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے، اور وہ ابرہہ کے کعبۃ اللہ پر حملہ کی مذموم کوشش کا واقعہ ہے، ابرہہ یمن کا فرماں روا تھا، اور یمن میں اس وقت عیسائیت کو غلبہ حاصل تھا، فرماں روائے یمن چاہتا تھا کہ عربوں کا جو رجوع کعبۃ اللہ کی طرف ہے، وہ یمن کی طرف ہو جائے، چنانچہ اس نے ایک بہت عظیم الشان گرجا ''قلیس'' نام سے تعمیر کیا، اور عربوں سے خواہش کی کہ اب وہ کعبۃ اللہ کے بجائے یمن آکر اس گھر کا طواف کیا کریں، اس دعوت میں مذہبی جذبہ کے ساتھ ساتھ معاشی مفاد کا خیال بھی کارفرما رہا ہوگا۔ کہ اتنے سارے لوگوں کے آنے کی وجہ سے یمن کی تجارتی منڈی اور زیادہ نفع بخش ہو جائے گی۔ اور باشندگان یمن کو مالی فوائد حاصل ہوسکیں گے۔

لیکن عربوں کے دل میں کعبۃ اللہ کی عظمت تھی، وہ ہرگز اس طرح نکل نہ سکتی تھی، اسی لئے بعض سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق بعض عربوں کی جانب سے قلیس کی بے حرمتی کی وجہ سے ابرہہ نے طے کرلیا کہ اسے مکہ پر چڑھائی کرنی ہے، چنانچہ ابرہہ ہاتھیوں کا ایک لشکرِ جرار لے کر حجاز کی طرف بڑھا، اور مکہ سے بالکل قریب آ گیا، عین اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابابیل پرندوں کا ظہور ہوا، جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں کنکری لے رکھی تھی، انہوں نے یہ کنکریاں برسائیں، اور کیا ہاتھی اور کیا ہاتھی بان؟ سبھی قرآن کی زبان میں ''کھائی ہوئی بھوس کی مانند'' ہوگئے، (الفیل) خدا کی قدرت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کی تذلیل کا کیسا سامان کیا کہ ایک معمولی پرندہ اور اس سے بھی زیادہ معمولی کنکریوں کے ذریعہ اس لشکر کا صفایا کر دیا گیا، یہ انسان کی تحقیر کی نہایت ہے!—— چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس مبارک گھر کو ظالم و جابر لوگوں کی دستبرد سے بچائے رہیں گے، **فلم ینلہ جبار قط** (مجمع الزوائد: ۲۹۶/۳) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں ایک فوج کعبۃ اللہ پر حملہ آور ہوگی، جب یہ فوج مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء نامی جگہ پر پہونچے گی تو پورے کے پورے لوگ از اوّل تا آخر زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے۔ **فاذا کانوا ببیداء من الارض یخسف باولھم و آخرھم** (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۱۸)

اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو چیزیں اسلام کے شعار کے درجہ میں ہوں، ان کی خاص اہمیت ہے، اور ان کے ساتھ بے حرمتی اسی قدر عذاب وعقاب کا موجب، چنانچہ اذان سنت ہے نہ واجب، لیکن اگر کسی جگہ تمام لوگ اذان کے ترک کر لینے پر اتفاق کرلیں تو چوں کہ یہ شعائرِ دین کی بے حرمتی ہے، اس لئے ان سے جہاد کا حکم ہے، مشہور فقیہ علامہ شامی امام محمد کا قول نقل کرتے ہیں:

> **لو اجتمع أھل بلدۃ علی ترکہ قاتلتھم علیہ** (ردالمحتار: ۴۹/۲)
> اگر کسی شہر کے لوگ ترکِ اذان پر اتفاق کرلیں تو اس بات پر ان سے جہاد کیا جائے۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں پیش آیا، یہ ایسا شرمناک واقعہ ہے کہ شاید اس پر شیطان کو بھی اپنی کم حوصلگی کا گلہ ہوا ہوگا، شاید ہی ایسی کوئی مثال ملے کہ اس شور و ہنگامہ کے ساتھ علی الاعلان بہ زور طاقت اخلاق وقانون کی تمام حدود کو پامال کرتے ہوئے کسی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کیا گیا ہو، منہدم ان غنڈوں نے نہیں کیا ہو جو غنڈہ گرد ہونے کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، بلکہ ان غنڈوں نے کیا کہ جن کی سیاسی قیادت ہندوستان کی سیاسی افق پر مہر و ماہ بن چکی تھی، مسلمان نہتے اور مجبور تھے، ستم رسیدہ اور کمزور تھے، پولیس نے ایودھیا میں غنڈہ کارسیوکوں پر گولیاں نہ چلا کر جو کچھ بارود بچا رکھا تھا، بے قصور اور پُر امن مسلمان احتجاجیوں پر ان گولیوں کو بے تکلف خرچ کیا، اور کتنے ہی جوان اور بوڑھے اور عورتیں اور بچے خاک وخون میں تڑپ اٹھے، جو لوگ اقتدار کے نشہ میں مست تھے وہ سمجھتے تھے کہ کسی مظلوم کا ہاتھ ان کی گردن تک پہونچ سکے گا؟ شاید انہیں اللہ کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔

لیکن مقامِ حیرت ہے کہ اللہ نے کس طرح ان کو ذلیل ورسوا کیا ہے، کلیان سنگھ جن کی راست حکومت میں یہ سب کچھ ہوا، ان کو خود ان کی پارٹی نے ایسا بے آبرو کر کے نکال باہر کیا کہ کم اس کی مثال ملے گی، ارون نہرو اور بوٹا سنگھ راجیو گاندھی کے زمانہ میں شیلانیاس کرانے کے ذمہ دار تھے، ارون تو ایسی سیاسی موت مرے کہ نام ونشان بھی باقی نہ رہا، اور بوٹا سنگھ جو کسی زمانہ میں وزیر داخلہ تھے۔ آج جیل کی ہوا کھانے کے لئے تیار ہیں، نرسمہا راؤ ایسے مغرور وزیر اعظم تھے کہ کوئی ان کے سامنے پر نہیں مار سکتا تھا، لیکن آج ایسے یک وتنہا ہیں کہ عدالت نے ان کے لئے جو سزا مقرر کی ہے، اس پر کوئی آنسو بہانے اور اظہار افسوس کرنے والا بھی نہیں، اور ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' کی مثال بنے ہوئے ہیں، مسجد کی شہادت میں لاتور اور عثمان آباد کے شیوسینک سب سے آگے آگے تھے، زلزلہ نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا، کہ اپنی ہولنا کی اور تباہ کاری کے اعتبار سے وہ تاریخ کے مشہور زلزلوں میں سے ایک ہو گیا، سورت کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ جو حیوانیت برتی گئی، اور کھلے عام عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، سورت والوں نے پلیگ کی وباء کی

صورت میں اپنے اس ظلم کا مزہ چکھ لیا ہے، اور جن لوگوں کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کیا ہے، ابھی کچھ اور چہرے ہیں، جو آج روشن نظر آتے ہیں، لیکن عذابِ خداوندی کا طمانچہ ان کو سیاہ فام کر کے رہے گا، خدا کے دشمن اپنی طاقت پر نازاں ہیں، اور غیبی طاقت ان پر خندہ زن ہے کہ:

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے

(۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

تم صرف پیچھے ہٹے ہو!

رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو ایک فوجی مہم پر روانہ کیا۔ یہ حضرات گئے، مقابلہ بھی بہادری کے ساتھ کیا، لیکن مقابلہ میں جم نہ سکے اور راہ ﷺ فرار اختیار کرنی پڑی۔ جب مدینہ واپس آئے تو مارے شرم کے چھپے پھرتے تھے اور آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے، کہتے تھے کہ ہم لوگ تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، نحن الفرارون۔ آپ ﷺ داناؤں کے دانا اور حکیموں سے بڑھ کر حکیم تھے، موقع و محل کی خوب پہچان رکھتے تھے اور انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے، آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ موقع زجر و توبیخ اور شرمساروں کو مزید شرمسار کرنے کا نہیں، بلکہ ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کا ہے۔ آپ ﷺ نے لطف و کرم کا لب و لہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ تم بھاگے نہیں ہو بلکہ تم اس لئے پیچھے ہٹے ہو کہ پیچھے آکر دوبارہ حملہ کرو، تم نے اس لئے پسپائی اختیار کی ہے کہ نئی کمک ساتھ لے کر مقابلہ پر اُترو، أنتم الکرارون ، أنتم العکارون، یعنی اس واقعہ کو تم "بزدلی" کے بجائے "تدبیر" کا واقعہ بنادو، گویا یہ ایک طرح کی فوجی تدبیر ہے کہ پیچھے ہٹ کر پھر مقابلہ کیا جائے، یہ ایک جنگی چال ہے نہ کہ شکست و ہزیمت۔

انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور ایک کا اندر کی دنیا سے۔ باہر کی دنیا میں ضروری ہے کہ اس کام کے لئے مطلوبہ وسائل اختیار کئے جائیں، فوجی اور سپاہی ہے تو اسلحہ اور حملہ کرنے اور دفاع کرنے کے آلات سے لیس ہو، تاجر ہے تو تجارت کا تجربہ اور ضروری سرمایہ رکھتا ہو، طالب علم ہے تو اس کے پاس کتابیں ہوں اور اچھے اساتذہ سے اس کا ربط ہو، انسان کے اندر کی دنیا سا کا "دل" ہے اور اس کا سرمایہ حوصلہ و ہمت اور یقین ہے۔

کسی بھی اہم کام کے لئے حوصلہ اور یقین سب سے بنیادی ضرورت ہے، اس بات کا حوصلہ کہ وہ اس کام کو کر سکے گا، اس بات کا یقین کہ وہ اس کام کو ضرور اس کے انجام تک پہنچا کر رہے گا اور اپنے آپ پر اعتماد کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ راستہ کی مشکلات آسان کرتا ہے، منزل کی جستجو کو بڑھاتا ہے، ہمت وحوصلہ کی طاقت ظاہری وسائل کی کمی کا بدل ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تاریخ میں کتنے ہی واقعات آپ کو مل جائیں گے کہ ایک بے سروسامان شخص اٹھا، نہ اس کے پاس فوج تھی نہ حکومت اور نہ مادی وسائل، لیکن بلند حوصلگی، عالی ہمتی، اپنے مقصد پر یقین اور خود اعتمادی نے اس کو اتنی طاقت بہم پہنچائی کہ اپنے زمانہ کے فراعین کی گردنیں بھی اس کے سامنے خم ہوگئیں اور وہ طوفانوں کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوگیا، اور ایسی مثالیں بھی آپ کو ملیں گی کہ وسائل کی فراوانی ہے اور تعداد کی کثرت ہے، لیکن پست حوصلگی اور کم ہمتی نے پوری قوم کو غلامی میں پابہ زنجیر کردیا۔

مسلمانوں نے بھی بحیثیت قوم اس کا خوب تجربہ کیا ہے، غور کیجئے کہ وہ مسلمان ہی تھے جو عرب کے ریگزار سے اٹھے اور افریقہ و یورپ سے مشرقِ بعید تک ابر رحمت کی طرح چھا گئے، محض سولہ سال کے ایک نوجوان نے سمندر پار اُتر کر ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کو اسلام اور اسلامی نظام کی نعمت عظمیٰ سے ہم کنار کیا اور اسپین پر اپنی فتح مندی کے نقوش ثبت کئے اور وہ بھی مسلمان ہی تھے جنھوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود علمی اور فنی لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کیا، تحقیق وریسرچ کا جو چراغ یورپ میں بجھ چکا تھا اور جہاں کسی سائنسی تحقیق اور نظریہ کا پیش کرنا بھی گردن زدنی جرم تھا، وہاں علم وفن کی نئی بزمیں آراستہ کیں اور تحقیق واکتشاف کی ایک نئی دُنیا کو وجود بخشا، یہ دراصل اسی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا کرشمہ تھا۔

اور وہ بھی مسلمان ہی تھے کہ جب تاتاریوں کا فتنہ اٹھا تو چند تاتاریوں کا وجود پوری مسلمان فوج کی شکست کے لئے کافی ہوتا تھا اور ایک تاتاری عورت بھی دسیوں مسلمان مردوں کو تہ تیغ کرسکتی تھی اور آج ہماری بدنصیب آنکھیں اس منظر کو دیکھ رہی ہیں کہ

مسلمانوں کے پاس دنیا کے بہترین معاشی ذرائع ہیں، کثیر افرادی وسائل ہیں، ذہانتیں اور صلاحیتیں ہیں، لیکن علم و تحقیق کے میدان میں ان کا درجہ صفر ہے اور عالمی سطح پر ان کا شمار پسماندہ اقوام میں ہے۔ اس میں بڑا دخل اسی کم ہمتی کو ہے۔ جب کسی قوم میں پست حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہمت ہار دیتی ہے، تو پھر محنت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور وہ دشوار گزار راہیں طے نہیں کر سکتی۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، وہ کسی بھی باعزت قوم کے شایانِ شان نہیں۔ سیاسی اعتبار سے وہ ایک منتشر انبوہ ہیں، افرادی قوت کے لحاظ سے ملکی سیاست پر ان کا کوئی اثر نہیں، معاشی اعتبار سے ان کی پسماندگی ضرب المثل ہے، نہ تجارت میں ان کا قابل لحاظ حصہ، نہ صنعت میں۔ سب سے افسوسناک بات مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی ہی ہے، جس نے ان کو سیاسی شعور سے بھی محروم رکھا اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا ہے، اس لئے کہ اس دور میں ملازمت ہی نہیں، اعلیٰ درجہ کی صنعت و تجارت بھی تعلیم کی رہین منت ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ خود کوئی سیاسی قوت نہیں ہیں، اس بات نے عام طور پر مسلمان قائدین کو بے ہمتی کا شکار اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ مسلمان تجارت میں اترنے کا حوصلہ نہیں پاتے، معمولی تجارتوں پر قانع ہیں، صنعت اور کاروبار آج مقابلہ کا اصل میدان ہے اور سخت محنت اور اعلیٰ صلاحیت کے بغیر کوئی اسے سر نہیں کر سکتا، اس میدان میں قدم رکھنے سے بھی مسلمان گھبراتے ہیں۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ مسلمان طلبہ ایک طرح کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اعلیٰ مقابلاتی امتحان میں شرکت کا تناسب مسلمان طلبہ کا بہت معمولی ہے۔

ملک میں جہاں مسلمانوں نے بہت سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، وہیں ایک ایسے ادارہ یا ٹیم کی بھی ضرورت ہے جو مختلف میدانوں میں ان لوگوں کی اخلاقی مدد کرے اور حوصلہ افزاء مشورے دے، جن کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور وہ پست حوصلگی کے باعث میدانِ مسابقت چھوڑنے لگیں۔ کتنے ہی مسلمان طلبہ ہیں جو ساتویں جماعت کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں لیکن جماعت دہم تک نہیں پہنچ پاتے، کتنے مسلمان تاجر

ہیں جو اُبھرتے ہیں لیکن کسی وقتی واقعہ کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لے اس میدان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ یہی حال ہر شعبۂ زندگی کا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ہمت دلائی جائے اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے، ان کو اس تجربہ سے آگاہ کیا جائے کہ بعض طلبہ میٹرک میں فیل ہو گئے، لیکن پھر مسلسل اور مردانہ وار کوشش نے ان وک اس لائق بنا دیا کہ انہوں نے اعلیٰ مسابقتی امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ تجارتی نقصان نے ان کو دیوالیہ کر دیا لیکن بلند حوصلگی کے ساتھ محنت نے ان کو از سر نو کھڑا کر دیا۔ اسی طرح ان کو شکست اور بے یقینی کے دلدل سے نکال کر خود اعتمادی اور یقین سے بہرہ ور کیا جائے کہ شکست کے احساس اور پست ہمتی کے ساتھ کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی!!

(۲۷ر مارچ ۱۹۹۸ء)

•••

چشمِ صیاد بہر سونگراں آج بھی ہے

اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو عقیدہ خطِ امتیاز کھینچتا ہے وہ توحیدِ خالص کا عقیدہ ہے۔ ''توحید خالص'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اکیلا ہے، نہ کوئی اس کا باپ ہے اور نہ ماں، نہ بیوی اور نہ اولاد، نہ خاندان اور کنبہ، اپنی صفات اور اختیارات میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور بے مثل ہے۔ حیات و موت، رزق میں وسعت اور تنگی، صحت اور بیماری، علم اور علم سے محرومی کی تمام کنجیاں اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، نہ کوئی طاقت کا دیوتا ہے، نہ کوئی تعلیم و رزق کی دیوی۔ توحید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی اور اس میں شریک و سہیم نہیں، عبادت اور بندگی اللہ ہی کی کرنی ہے، دُعاء اللہ ہی سے مانگنی ہے، اللہ ہی سجدہ کا مستحق ہے، حلال و حرام کرنے کی کلید اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، نہ اور کسی کی پوجا جائز ہے، نہ سجدہ کرنا اور نہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنا، یعنی توحید ذات میں بھی ہے، ''صفات'' میں بھی اور ''حقوق'' میں بھی۔

اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں یا تو صریحاً شرک کے داعی ہیں یا اگر توحید کے قائل ہیں تو بالواسطہ شرک میں مبتلا ہیں۔ کوئی خدا کے لئے اولاد کا قائل ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ خدا نے بھی کائنات کے نظام کے لئے کابینہ بنا رکھی ہے اور اپنے اختیارات کو مختلف وزارتوں کے حوالہ کر دیا ہے، کوئی زبان سے خدا کو ایک کہتا ہے، لیکن اپنی پیشانی مختلف چوکھٹوں پر جھکاتا ہے، خالص اور بے آمیز توحید اسلام کی خصوصیت ہے اور یہ انسانیت کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، یہ توحید مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور دردر ہاتھ پھیلانے سے نجات دیتی ہے، انسانی مساوات و برابری کا یقین پیدا کرتی ہے، رنگ و

نسل کی بنیاد پر انسان اور انسان کے فرق کو مٹاتی ہے اور اسلام کی تمام تعلیمات کے لئے عنوان کا درجہ رکھتی ہے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر اور رسول آئے، ان سب کا اصل مشن یہی دعوتِ توحید تھا، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین تھے اور ضرور تھا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ تصورِ توحید کو اس درجہ راسخ کر دیا جائے کہ ہمیشہ کے لئے علمی اور استدلالی اعتبار سے تصورِ شرک مغلوب اور مفتوح ہو جائے، آپ ﷺ نے اس دعوت کے لئے بے حد تکلیفیں اٹھائیں، گلیوں، کوچوں میں آبلہ پائی کی، چوٹیں کھائیں، پتھر کھائے، کڑوی کسیلی برداشت کی، فاقہ مستیوں سے گزرے اور ہر طرح کی تکلیف اٹھاتے ہوئے ایک ایک شخص کی خوشامد کی کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار کرو اور کامیابی سے ہمکنار ہو، "قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"۔

اسلام سے پہلے عقیدہ شرک کو ایسا فکری غلبہ حاصل تھا کہ جو مذاہب توحید کی دعوت لے کر اٹھتے تھے، وہ بھی شرک سے اپنا دامن بچا نہیں پاتے تھے۔ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید ہی کی تھی، لیکن بتدریج بودھ مت ایک مشرکانہ مذہب بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ایک ڈیڑھ صدی کے اندر ہی عیسائیت تثلیث کے سانچہ میں ڈھل گئی، خود ہندو مذہب کے قدیم مآخذ کو دیکھا جائے تو ان میں بھی نمایاں طور پر توحید کی تعلیم ملتی ہے، لیکن اس وقت ہندو مت شاید دُنیا میں مشرکانہ تصور کا سب سے بڑا نمائندہ ہے، جس کے پاس دیویوں اور دیوتاؤں کی اتنی بڑی فوج ہے کہ ان کا شمار کرنا بھی آسان نہیں۔

یہ اسلام کی انقلابی شان ہے کہ اس نے اس فکر کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی اور عقیدۂ توحید کو ایسا غالب کیا کہ جو مشرک مذاہب تھے وہ بھی اپنے اندر توحید کے عناصر تلاش کرنے لگے، عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا، جس نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا انکار کیا، ہندوؤں میں آریہ سماجی تحریک اٹھی جس کا مقصد مورتی پوجا کی مخالفت تھی، بہت سے مشرک مذاہب تو وہ تھے جو اسلام کی آمد کے بعد ناپید ہو گئے، یا ان کا دائرہ

اتنا محدود ہو گیا کہ ان کا شمار نا پید ہونے میں ہے۔

ہندوستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہندو مذہب نے پہلے تو دوسرے مذاہب کو بزور طاقت ملک بدر کرنے کی کوشش کی، بودھ مت اور جین مت اس کی مثال ہیں، لیکن جب یہ بات ممکن نہ ہو سکی تو اس نے دوسرے مذاہب کو اپنے اندر جذب کرنے کی تدبیر کی اور اس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، بودھ مت اور جین مت عملاً اس وقت ہندو مت ہی کی ایک شاخ ہے، یہی حال گرونانک جی کے قائم کیے ہوئے ''سکھ مت'' کا ہوا۔ اسلام کے ساتھ بھی ہندو مت نے اپنی اس تاریخ کو دہرانا چاہا، وحدتِ ادیان کا تصور اور اس تصور کے تحت ہندوتاریخ کی مشہور'' بھگتی تحریک'' ایسی ہی کوششوں کا حصہ ہے، بعد کو اکبر اور داراشکوہ جیسے فرماں رواؤں کے ذریعہ اس تحریک کی تقویت کا سامان کیا گیا، جس کو اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے صاحب علم، صاحبِ دل اور بالغ نظر مدبّر نے ناکام کر دیا، جو اقبال کی زبان میں'' ترکش مارا خدنگ آخریں'' کا مصداق تھا۔

جو لوگ ہندوستان کو صرف ہندو مذہب کے زیر سایہ دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ بات پریشانی کا باعث ہے کہ آخر صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان ہندو مذہب اور تہذیب میں کیوں ضم نہیں کئے جاسکے؟ اس لوہے کے چنے کو کس طرح پگھلایا جائے؟ اس کے لئے پہلے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ مسلمان تنگ آکر اسلامی تصورات اور اسلامی تہذیب کا دامن چھوڑ دیں، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور دنیا نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کے لئے اپنا آخری قطرۂ خون دے دینا زیادہ آسان ہے، لیکن وہ اپنے مذہب اور دین سے دستبردار نہیں ہو سکتے، پھر مسلمانوں کے شخصی قانون کو نشانہ بنایا گیا کہ اگر یہ قوانین نہ رہیں تو مسلمان اور برادرانِ وطن کے درمیان تہذیبی فاصلہ ختم ہو جائے گا اور شاید اس طرح وہ اس قوم کو اپنے ساتھ جذب کر لیں گے، لیکن ملتِ اسلامیہ ہند کی وحدت نے اس سازش کو بھی ناکام کیا۔

اس پس منظر میں فرقہ پرست عناصر نے محسوس کر لیا ہے کہ فکر و عمل کی اصل شہ رگ تعلیم گاہیں ہیں، جب تک تعلیم گاہوں سے توحید اور شرک کی اس دوئی کو مٹایا نہ جائے، یہ

مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا، اسی تناظر میں ایک طرف دینی درسگاہوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے، جو ادارے حقیقی معنوں میں انسانیت کے علمبردار ہیں، ان کو دہشت گرد کہا جارہا ہے اور دوسری طرف سرکاری درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی لائی جارہی ہے کہ وہ عملاً ہندو مذہب کا تعارف اور اس کی دعوت بن جائے اور دوسری قوموں میں کمتری اور محرومی کا احساس پیدا ہو، اس کے ساتھ ساتھ ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' پڑھنے کی تحریک شروع کی جارہی ہے، وندے ماترم مشرکانہ نظم ہے، جس میں زمین کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے، یہ ایک ایسے قوم دشمن شخص کی نظم ہے جو انگریزوں کی آمد پر خوشی مناتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بوتا ہے، سرسوتی جی ہندو بھائیوں کے یہاں تعلیم کی دیوی ہیں ''سرسوتی وندنا'' کا مطلب سرسوتی جی کی پوجا کرنا ہے، ان ناپاک تدابیر کا اصل مقصد ونشانہ یہی ہے کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو ہندو مذہب اور تہذیب میں جذب کرلیا جائے، وہ شرک سے مانوس ہو جائیں اور توحید کے پاکیزہ تصور سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں یا کسی اور قوم سے ان باتوں کا مطالبہ درحقیقت اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی اعتقادات اور تصورات سے سبکدوش ہوکر اکثریت کے مذہبی افکار کو قبول کرلیں، یہ بالواسطہ تبدیلی مذہب کی سازش ہے، یہ محض قومی مسئلہ نہیں، بلکہ خالص مذہبی اور اعتقادی مسئلہ ہے اور مسلمانوں کے لئے مذہبی اعتبار سے گویا یہ موت وزیست کا مسئلہ ہے۔

یہ نہ صرف اقلیتوں کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ ہمارے اس کثیر قومی ملک کے سیکولر کردار اور جمہوری اقدار کا بھی علانیہ قتل ہے، اس لئے یقیناً یہ ایسی بات ہے جو ہر محب وطن شہری کو تڑپادے اور اس ملک سے پیار رکھنے والوں کو بے چین کردے۔

اسلام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سب سے زیادہ مقدس مقامات ہیں، لیکن یہاں کی خاک بھی ان کے لئے لائق پرستش نہیں، انبیاءِ کرام اور محمد رسول اللہ ﷺ ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ برگزیدہ شخصیتیں ہیں، لیکن وہ ان کی ''وندنا'' اور ''بندگی'' کے بھی قائل

نہیں، اس لئے وہ کیوں کر ایسے مطالبات کو پورا کر سکتے ہیں! پھر مسلمانوں نے اس ملک پر کم وبیش ایک ہزار سال حکومت کی ہے، اگر انہوں نے عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں جبر کا یہ راستہ اختیار کیا ہوتا تو شاید یہاں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ نہیں ہوتا اور پورا برصغیر ایک مذہب اور ایک تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوتا، لیکن مسلمانوں نے مذہب وعقیدہ، تہذیب وتمدن یہاں تک کہ زبان کے بارے میں بھی کبھی جبر ودباؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ:

۱) وہ زیادہ سے زیادہ نجی عصری درس گاہیں قائم کریں، تاکہ سرکاری درسگاہوں کی اس ''مذہبی دہشت گردی'' سے محفوظ رہ سکیں۔

۲) نصابِ تعلیم میں ہونے والی زہر آلود تبدیلیوں اور نئی تاریخ لکھنے کی کوشش کا پوری قوت سے مقابلہ کریں اور سرکاری درس گاہوں میں ''وندے ماترم'' کے صرف لزوم ہی کی مخالفت نہ کریں، بلکہ ملک کے سیکولر کردار اور دستوری تحفظات کے پس منظر میں اس بات کی مہم چلائیں کہ کوئی بھی مذہبی نظم اسکولوں میں پڑھی ہی نہ جائے۔

۳) گاؤں گاؤں، قریہ قریہ دینی تعلیم کے جزء وقتی اور ہمہ وقتی مراکز قائم کریں، اس بات کا نظم کریں کہ کوئی مسلمان بچہ دین کی بنیادی تعلیم سے نا آشنا نہ رہے، نیز مسلمان اپنے زیرِ انتظام عصری درسگاہوں میں بنیادی دینی تعلیم کا اہتمام کریں اور طلبۂ وطالبات کو اسلامی تہذیب سے قریب کریں۔

۴) دینی مدارس اس وقت ہمارے ملک میں اسلامی اقدار کی حفاظت اور اسلام کے خلاف فتنوں کی مدافعت کا سب سے بڑا مرکز ہیں، ان کو تقویت پہنچائیں اور ان پر کوئی آنچ نہ آنے دیں۔

۵) اپنے بچوں کے دلوں میں شرک کی نفرت بٹھائیں اور عقیدۂ توحید کو ان کے دلوں میں خوب راسخ کریں۔

۶) نئی نسل کو منظم طور پر مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی، علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ سے روشناس کریں۔ ہندوستان کی سچی اور حقیقت پر مبنی تاریخ انہیں پڑھائیں، تاکہ

مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں اور وہ یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ہم نے ہندوستان کو لوٹا نہیں، بلکہ اس ملک کو سنوارا ہے اور اس کو بہت کچھ دیا ہے۔

۷) برادرانِ وطن میں تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور سادہ ذہن لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی اور تقریری وتحریری طور پر بتائیں کہ وندے ماترم اور اس جیسی باتوں کا مطالبہ کرنا گویا ان سے اپنے دین ومذہب سے سبکدوش ہو جانے کا مطالبہ ہے۔

اگر ہم نے اس وقت اس جانب توجہ نہیں دی تو نہ معلوم مستقبل کا نقشہ کیا ہوگا؟؟_ کہ:

گوشۂ امن نہیں آج بھی بلبل کو نصیب
چشمِ صیاد بہر سو نگراں آج بھی ہے

(۱۴ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

پھر کسی صلاح الدین ایوبیؒ کی ضرورت ہے!

۴۴ سال پہلے عالم اسلام پر ایک ایسی کاری ضرب لگی جس کا درد ہر باشعور مسلمان کو تڑپاتا ہے اور جس کی ٹیس ہر صاحب ایمان اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے، یہ زخم تھا ۷؍ جون ۱۹۶۷ء کو مسلمانوں کے قبلۂ اوّل بیت المقدس پر اسرائیل کے قبضہ کا، افسوس کہ عام مسلمان یہاں تک کہ مسلم ممالک بھی اس ناقابل فراموش واقعہ کو فراموش کرتے جارہے ہیں، کسی قوم کے لئے سب سے بڑی محرومی کی بات یہ ہے کہ وہ لٹ جائے اور اسے لٹنے کا احساس نہ ہو، وہ اپنے سرمایۂ غم سے بھی محروم ہو جائے، اور محرومی کا احساس بھی اس کے دل ودماغ سے رخصت ہو جائے، علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بیت المقدس وہ مقدس مقام ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں طور پر متبرک ہے، یہیں معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو عالم بالا کا سفر کرایا گیا، پیغمبر اسلام ﷺ نے نبوت کے بعد سولہ ماہ سے زیادہ عرصہ تک اسی طرف رُخ کرکے نماز ادا فرمائی، اس لئے یہ مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوا ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے بیت المقدس کی بھی تعمیر فرمائی تھی، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام، حضرت مسیح علیہ السلام اور کتنے ہی انبیاء کرام کی حیات طیبہ اس مبارک مقام سے متعلق رہی ہے، شہر بیت المقدس کے قرب وجوار میں بھی مختلف علاقے ہیں، جو مختلف پیغمبروں سے منسوب ہیں، اسی لئے

اسلام کی نگاہ میں اس شہر اور اس مسجد کی خاص اہمیت ہے۔

ایک صاحبؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ حشر و نشر کی سرزمین ہے، یہاں آؤ اور نماز ادا کرو، کہ اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نماز ادا کرنے کے برابر ہے، ان صاحبؓ نے استفسار کیا کہ اگر میرے اندر وہاں تک جانے کی استطاعت نہ ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کم سے کم تیل کا ہدیہ ہی بھیج دو جو وہاں چراغ میں کام آئے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۱۴۰۷)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائی، اس میں ایک دعاء ایسی حکومت کی تھی جو آپ کے بعد کسی کو میسر نہ آئے اور اس میں ایک دعاء یہ بھی تھی کہ جو اس مسجد میں صرف نماز کے لئے آئے، تو اس کے گناہ اس طرح معاف ہو جائیں کہ گویا وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین دعاؤں میں سے دو تو مقبول ہو ہی گئی، اور مجھے امید ہے کہ یہ تیسری دعاء جو مغفرت سے متعلق تھی، وہ بھی مقبول ہوگئی ہوگی (ابن ماجہ: حدیث نمبر: ۱۴۰۶) اور یہ روایت تو حدیث کی متعدد کتابوں میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خاص طور پر تین ہی مسجدوں کے لئے سفر کرنا درست ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۴۰۸، ۱۴۰۷) اس لئے مسلمانوں کو اس مقدس اور متبرک مقام سے ہمیشہ قلبی اور جذباتی تعلق رہا ہے۔

اسلام سے پہلے یہ شہر بار بار تخت و تاراج کیا گیا، خاص کر چھٹی صدی قبل مسیح، بابل کے حکمراں بخت نصر نے اس شہر اور اس کے مقدس مقامات کی جس طرح اینٹ سے اینٹ بجائی اور ایک لاکھ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا، وہ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک ہے، یہودی جو اپنے آپ کو اس شہر کا اصل وارث سمجھتے ہیں صرف تہتر ۷۳ رسال ہی اس شہر پر برسر اقتدار رہے، حضرت عمرؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں بیت المقدس کا علاقہ حضرت عمرو ابن العاصؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے فتح کیا، مسلمان چاہتے تھے کہ شہر میں خون ریزی نہ ہو اور صلح کی صورت نکل آئے، عیسائیوں نے یہ شرط لگائی کہ خلیفۃ المسلمین

خود آکر دستاویز پر دستخط کریں، حضرت عمرؓ نے اسے قبول فرمالیا، اور مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنا کر رجب ۱۶ء میں بیت المقدس تشریف لائے، بیت المقدس سے پہلے ہی جابیہ نامی مقام پر اسلامی لشکر نے حضرت عمرؓ کا استقبال کیا، وہیں عیسائی رہنما بھی آگئے، اور معاہدۂ صلح کی تحریر عمل میں آئی، اس معاہدہ کے تحت عیسائی باشندوں کی جان ومال، مذہبی مقامات، حضرت مسیح کی مورتیوں وغیرہ کی حفاظت کی ضمانت دی گئی، بلکہ عیسائی یہودیوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی اس خواہش کو بھی قبول فرمایا، اور یہودیوں کی الگ آبادی بنائی گئی۔

اس کے بعد سے یہاں برابر مسلمان حکمراں رہے یہاں تک کہ گیارہویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، اور ۲۳ رشعبان ۴۹۲ھ کو عیسائی دوبارہ فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوئے، انہوں نے شہر میں ایسا قتل عام مچایا کہ بچے، بوڑھے، جوان اور مرد و عورت کو بلا امتیاز تہہ تیغ کیا گیا، شہر میں لاشوں کے انبار لگ گئے! خود مغرب مورخین نے اس خوں آشامی کا اعتراف کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ صرف ایک دن میں شہر اور اس کے مضافات میں ستر ہزار افراد شہید کئے گئے، یہ سفا کانہ رویہ ٹھیک اس کے برعکس تھا، جو حضرت عمرؓ اور مسلمان فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ روا رکھا تھا، سقوط بیت المقدس کے اس واقعہ نے پورے عالمِ اسلام کو بے چین اور بے سکون کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ ۱۱۶۹ء میں سلطان نور الدین زنگی جیسے خدا ترس بادشاہ کے بیٹے مجاہد الاسلام سلطان صلاح الدین ایوبیؒ مصر کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے، اور شام کے علاقے فتح کرتے ہوئے ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو فتح کیا، صلاح الدین ایوبیؒ نے احسان فراموش عیسائیوں کے ساتھ ایسی رحم دلی کا سلوک کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ملے گی، چنانچہ خود عیسائی دنیا (جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا تھی) پر اس کا گہرا اثر پڑا، آخرا کانوے ۹۱ سال کے بعد قبۃ الصخرہ پر لگائی گئی سنہری صلیب اتاری گئی، اور اس کی جگہ ''ہلال'' نصب کیا گیا، جب ہی سے ہلال مسلم ملکوں کا شعار سمجھا جانے لگا، یہ اکیانوے ۹۱ سال کا عرصہ مسلمانوں کے لئے ایسا تکلیف دہ اور غم انگیز عرصہ تھا، کہ پورے

عالمِ اسلام کی آنکھیں بے سکون اور دل بے قرار تھے۔

خلافت عثمانیہ ترکیہ کے دور میں ہی یہودیوں نے سازشیں بنی شروع کردی تھیں، لیکن خلیفہ نے کسی قیمت پر یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت نہیں دی، بالآخر مغربی سازشوں سے خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا، اور ۱۹۴۸ء میں عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپ دیا گیا، یہ زخم بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کا قبلہ اوّل ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا، میرے خیال میں پہلی صلیبی جنگ کی شکست اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ اور سب سے اندوہ ناک سانحہ تھا، کہ اگر اس واقعہ پر آسمان خون کے آنسو بہاتا اور زمین کا سینہ شق ہو جاتا تو بھی باعث تعجب نہ تھا، لیکن آہ! ہم مسلمانوں کی بے حسی اور بے شعوری کہ ہماری نسلوں نے تو اس واقعہ کو بھی اپنے صفحہ دل سے مٹا دیا ہے، اور مسلمان حکمراں اسرائیل سے ایسا کٹا کاٹا اور عاجز و مجبور فلسطین مانگ رہے ہیں، کہ شاید کوئی فقیر بھی ایسی الحاح و لجاجت سے دست سوال دراز نہ کرتا ہوگا، اور کیوں نہ ہو، کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"!

صورت حال یہ ہے کہ ہزار خوشامد کے بعد عربوں سے کچھ وعدے کئے جاتے ہیں اور پھر بلا ادنیٰ جواز کے ان سے انکار کردیا جاتا ہے، ۱۳؍ستمبر تک فلسطین کے سلسلہ میں قطعی معاہدہ کی تاریخ طے تھی اور خیال ہوتا تھا کہ شاید مسلمان قبلہ اوّل کی واپسی کا مژدۂ جانفزا سنیں گے، لیکن معاہدہ تو کیا ہوتا؟ اب طرح طرح کے شکوک و شبہات کی گھٹائیں چھاتی جا رہی ہیں اور ڈر لگتا ہے کہ خدانخواستہ اقتدار کا لالچی گروہ بیت المقدس کے حق سے ہی دست بردار نہ ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو اس محرومی کے ساتھ فلسطینی مسلمانوں کے لئے ایک جسد بے روح ہی ہوگی۔

اگر مسلمان اپنی صفوں میں وحدت کا ثبوت دیتے اور عالم اسلام ٹکریوں میں بٹ نہ گیا ہوتا، قومی تعصب اور علاقائیت کے غیر اسلامی نعروں نے عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں کی صورت میں بانٹ نہ دیا ہوتا، تو آج مسلمانوں کو ایک حقیر گداگر کی طرح ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ وہی اس سرزمین کی قسمت کا مالک ہوتے، انسان کی

طلب اور اس کی تڑپ کے اعتبار سے نصرت الٰہی متوجہ ہوتی ہے، جب انسان کا دل سچی طلب سے خالی ہو اور خدا کے بجائے ظاہری وفانی سہاروں پر انسان نے انحصار کر رکھا ہو، تو ان کے ساتھ کیوں کر خدا کی مدد ہو سکتی ہے؟ عرب ممالک پر قومیت کا ایسا نشہ مسلط ہوا کہ عرب زعماء اللہ کے نام کے بجائے عرب قومیت کے نام سے اپنے خطبے کا آغاز کرتے تھے، اور مذہب کے بجائے خالص قومی مسئلہ کی حیثیت سے اس مسئلہ کو پیش کرتے تھے، اس سے بڑھ کر اپنے خالق و مالک سے بغاوت کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اسی لئے افغانستان میں نہتے اور بے کس و بے آسرا مجاہدین نے روس جیسی بڑی طاقت کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ بوسنیا میں ہر طرح کی اعانت سے محروم دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمان اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن فلسطین میں ایسا کچھ نہ ہوسکا، خود فلسطینی تحریک میں بھی جب تک مخلص مجاہدین اور تحریک حماس کی شرکت نہ ہوئی کامیابی کی منزل دور سے دور تک ہوتی رہی، آج اگر اسرائیل یاسر عرفات سے گفتگو کرتا ہے تو یہ عرب قوم پرستوں کی جدوجہد کا نہیں بلکہ مخلص مجاہدین کی سعی وکاوش کا نتیجہ ہے۔

اس لئے پھر ضرورت ہے کہ قبلۂ اوّل کی محرومی کا احساس مسلمانوں کو تڑپائے، اور یہ تڑپ خدا کی طرف ان کو متوجہ کرے، جب ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت متوجہ ہو سکتی ہے، اور مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ان کو واپس مل سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج پھر عالم اسلام کو وقت کے صلاح الدین کا انتظار ہے، خدا کرے وہ وقت جلد آئے، اور مسلمانانِ عالم کو اس ذلت ونکبت اور رسوائی سے نجات ملے، جس سے وہ اس وقت دوچار ہیں!!

(۱۵/ ۹/ ۲۰۰۰)

تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں!

جس وقت یہ سطریں قارئین کی نظروں سے گذریں گی، نہ معلوم حوصلہ مند، غیور اور خوددار افغانوں کی سرزمین پر کیا گذر رہی ہوگی؟ وہ افغان جنہوں نے پورے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اختیار کر لینے کے باوجود افغانستان میں ان کے قدم جمنے نہیں دیئے، اور جن کی غیرت ایمانی اور حمیت افغانی نے روس جیسے ملک جو کسی خطۂ ارض میں ایک بار قدم رکھنے کے بعد وہاں سے ہٹنا نہ جانتے تھے، اور سربزیری اور خمیدگی جس کی لغت میں نہیں تھی، بھی ہمت جواں اور حوصلۂ لازوال کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، اور یہیں سے سودیت یونین کا بکھراؤ شروع ہوا، اب اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے متکبر طاقت امریکہ اس لٹی پٹی بے سروسامان لیکن غیرت ایمانی سے معمور قوم سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہے، افغانوں کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو نہ جانے کتنی بار امریکہ کے سامنے رکوع وسجود بجالا چکی ہوتی، لیکن یہ اس قوم کی ہمت مردانہ ہے، کہ وہ اب بھی خم ٹھوک کر کہہ رہی ہے کہ :

ادھر آؤ ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

دیکھئے! یہ آزمائش کیا رنگ لاتی ہے، مغربی لٹیروں کے ہاتھوں کیسی کیسی انسانیت سوزیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور مغرب کی روایتی دہشت گردی اور آبائی صفتِ خوں آشامی کیا رنگ لاتی ہے؟ اللهم زلزل اقدامهم و خذهم اخذ عزيز مقتدر !

بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب عیار فطرت قوم یہودیوں کی سازش ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کو بدنام کرنا، امریکہ اور مغربی ملکوں کو مسلمانوں کے بارے میں بدگمان کرنا اور

صدر بش یہودیوں کے بارے میں جو ایک گونہ ناموافق ذہن رکھتے ہیں، اس رُخ کو موڑنا ہے، انتخاب کے وقت بش اور یہودیوں کے درمیان ان بن رہی ہے، اور امریکی قوم نے واضح طور پر اس کو محسوس کیا ہے، پھر بش کابینہ میں کسی یہودی کو جگہ نہ مل سکی، اور کولن پاول جن کا یہودیوں سے بُعد معروف ہے، کابینہ میں ایک اہم منصب کے حامل ہوئے، اس پس منظر میں مسلمانوں کی طرف نفرت کا رخ موڑنے کے لئے یہودیوں نے یہ بات ضروری محسوس کی ہوگی کہ اسامہ بن لادن کا ہوا کھڑا کیا جائے، چنانچہ امریکی فوجی انٹیلیجنس کی ایک رپورٹ میں ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگن کے حادثہ میں اسرائیلی خفیہ سروس ''موساد'' کا ذکر آنے لگا ہے، مگر اندیشہ اس بات کا ہے کہ یہودی میڈیا بہت ہی خوبصورتی سے اس کو پس منظر میں ڈال دے۔ اور امریکہ کو ورغلا کر ایک نئی جنگ میں جھونک دے۔

دنیا کے قانون میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سزا مجرم کو دی جاتی ہے نہ کہ ملزم کو، ملزم وہ ہے جس پر جرم کا الزام ہو، اور مجرم وہ ہے جس پر یہ الزام ثابت ہو گیا ہو، اسامہ بن لادن کے معاملہ میں طالبان یہی کہتے ہیں کہ اگر ان کے جرم کا ثبوت پیش کر دیا جائے تو وہ انہیں حوالہ کرنے کو تیار ہیں، باوجودیکہ افغانستان اور امریکہ کے درمیان حوالگیٔ مجرمین کا کوئی معاہدہ نہیں ہے، پھر بھی افغانستان کی طرف سے یہ پیشکش ان کی فراخدلی اور انصاف پروری کو ظاہر کرتی ہے، اور عین مطابق انصاف ہے۔ لیکن امریکہ کو ایک ہی بیجا اصرار ہے کہ اسامہ کو زندہ یا مردہ اس کے حوالہ کر دیا جائے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حادثہ پیش آیا، اور جس طرح اس میں بے قصور لوگوں کی جانیں گئیں، وہ انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ بات ہے، اور اس سے امریکہ جیسی سوپر طاقت کا سیکوریٹی نظام مشکوک ہو کر رہ گیا ہے، اور ایک ایسی سپر طاقت کے لئے اس طرح کا واقعہ پیش آ جانا نہایت رسوا کن امر ہے، لیکن محض اپنی جھینپ کو دور کرنے کے لئے بلا تحقیق کسی کو اپنے جور و استبداد کا ہدف بنا دینا اس دہشت گردی سے بڑھ کر دہشت گردی ہوگی؟

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کیا تمام انسانوں کے خون کی قیمت برابر ہے، یا ایک خطہ میں بسنے والے انسانوں کا خون زیادہ اہم اور دوسرے خطہ میں بسنے والے انسانوں کا

کم اہم ہے؟ فرق درست نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غیر مسلموں کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح ہیں، دمائهم کدمائنا و اموالهم کاموالنا۔ امریکہ خود جس دہشت گردی کا مرتکب ہوتا رہا ہے اور جس طرح اس نے انسانی خون کو ارزاں کیا ہے، جنگ کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، ۱۹۴۵ء میں اس نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا، جس میں ۷۰ر ہزار اشخاص بیک لمحہ موت کی نیند سو گئے، اور اتنے ہی زخمی ہوئے، اور صرف تین دنوں بعد ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا، جس میں چالیس ہزار افراد یکلخت لقمۂ اجل بن گئے، اتنے ہی زخمی ہوئے، اور اب تک اس خطہ میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ معذور اور ناقص الخلقت، اور زمین ایسی بنجر ہوگئی ہے کہ اب تک سبزہ کی روئیدگی سے محروم ہے، عراق میں امریکہ کی بے جا پابندیوں کی وجہ سے لاکھوں بچے مر چکے ہیں، اور کتنے ہی مریض ہیں جو دواؤں کے لئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، امریکہ کی کھلی ہوئی پشت پناہی کی بنا پر اسرائیل ہر دن بے قصور فلسطینیوں کا قتل عام کر رہا ہے، کیا ان انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کیا یہ دہشت گردی نہیں تو انسانیت نوازی ہے؟

عجیب بات ہے کہ مغربی ممالک مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں، بلکہ مغرب کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلام اور دہشت گردی مترادف الفاظ ہو گئے ہیں، حالاں کہ دہشت گردی تو اصل میں مغرب کا طرۂ امتیاز رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کن قوموں کی دین ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم میں ۹۰ لاکھ فوجی ہلاک ۲ر کروڑ ۲۰ر لاکھ معذور اور ۲ر کروڑ ۵۰ر لاکھ لاپتہ ہوئے، اور دوسری جنگِ عظیم میں ساڑھے تین کروڑ آدمی مارے گئے۔ اور دو کروڑ معذور ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس نے معذور فوجیوں کے لئے مصنوعی اعضاء بنانے اپنے کارخانوں کو جو آرڈر دیئے وہ تو دیئے ہی، جب یہ کافی نہ ہوئے تو ۴۰ر لاکھ مصنوعی پیر بنانے کا آرڈر امریکی کارخانوں کو دیا، اور یہ سب کچھ معذور فوجیوں کے لئے، عام شہری جو معذور ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں، فرانس نے الجزائر پر جو مظالم ڈھائے، برطانیہ اور پرتگال نے اپنی نو آبادیات پر جو جور و ستم روا

رکھا اور امریکہ نے ویتنام میں جو خوں آشامی کی، وہ آج بھی تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں، بوسنیا میں جس طرح مسلمانوں کا قتل عام ہوا، بے قصوروں سے عقوبت خانے سجائے گئے، عورتوں کی کھلے عام عصمت دری کی گئی، اور سینکڑوں مسجدیں شہید کردی گئیں، اور اذیت رسانی کے ایسے واقعات پیش آئے کہ شاید ہی ظلم و جور کی تاریخ میں اس کی مثال مل سکے، یہ سب مغرب کی دہشت گردی کی ادنیٰ مثال ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی اس وقت دہشت گردی کی مذمت میں پیش پیش ہے، اور وزیر داخلہ جناب ایڈوانی بار بار بمبئی بم دھماکہ کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دھماکہ دہشت گردی کا واقعہ ہے، لیکن کیا بھاگلپور اور مرادآباد کا قتل عام، بمبئی اور سورت میں بربریت کا برہنہ رقص، ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے خلاف خونی یلغار اور عیسائی مبلغین پر انسانیت سوز حملے، دہشت گردی نہیں ہے؟ جب ہم دہشت گردی کی مذمت کریں تو اس میں تفریق و امتیاز نہ ہونا چاہئے، اور ہمیں اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ شدت پسند غیر قانونی گروہوں کے مقابلہ قانون کی پابند کسی ریاست یا مملکت کی دہشت گردی زیادہ شرمناک، زیادہ لائق افسوس اور زیادہ قابل مذمت ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت نہایت نازک اور صبر آزما ہے، کہ ایک مسلم ملک کو بے ثبوت اور بلا دلیل ظلم و جور کا ہدف بنایا جا رہا ہے، تمام باطل طاقتیں اپنے ناپاک عزائم کے لئے متحد ہیں، اور مسلمان حکومتیں حقائق کا سامنا کرنے سے آنکھیں چرا رہی ہیں، اور بزدلی کا شکار، نیز: "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کی حقیقی تصویر بنی ہوئی ہیں، ان حالات کی عکاسی رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے والے دسترخوان پر گرتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا: کیا اس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن تمہارے اندر "وہن" پیدا ہو جائے گا، صحابہؓ نے دریافت کیا، "وہن" کیا شئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ لوگ تم پر جری ہو جائیں گے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی وجہ دو باتیں ہوں گی: حب الدنیا و کراهیة الموت "زندگی کی

محبت، اور موت کا خوف'' (ابوداؤد)

اس وقت واقعہ ہے کہ یہودی، عیسائی اور زعفرانی طاقتیں اسلام کے خلاف متحد ہو کر کھڑی ہوگئی ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے تین باتیں نہایت اہم ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اور اللہ سے اعداء دین اور معاندین اسلام کے مقابلہ کے لئے نصرت غیبی کی طلب، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلوٰۃ اور صبر کے ذریعہ اللہ کی مدد کے طلب گار ہو، استعینوا بالصبر و الصلوٰۃ صلوٰۃ کا ترجمہ گو نماز سے کیا جاتا ہے، لیکن صلوٰۃ دراصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے، کیوں کہ نماز کی کیفیت ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنا سراپا خدا کے حضور بچھا دیتا ہے، اور یہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی کامل ترین صورت ہے، چنانچہ اس وقت مسجدوں میں دعاء اور قنوت نازلہ کا اہتمام ہونا چاہئے۔ دوسری ضروری چیز حکمت و تدبیر ہے، تدبیر کیا ہے؟ عقل کو جذبات پر اور ہوش کو جوش پر غالب رکھنے کا نام! غالباً اسی کو قرآن نے ''صبر'' سے تعبیر کیا ہے، اور اس کو حدیث میں ''فراست ایمانی'' کہا گیا ہے، بعض اوقات حکیمانہ فیصلے کے لئے اپنے جذبات کا آپ خون کرنا پڑتا ہے، لیکن اسی میں وسیع تر مستقبل کی بھلائی اور فلاح مضمر ہوتی ہے۔

تیسری ضروری چیز امت کی وحدت اور اس کی شیرازہ بندی ہے، اس وقت مسلمانوں کا باہمی اختلاف و انتشار ضرب المثل بن چکا ہے، اور محلہ کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک یہ بکھراؤ موجود ہے، اگر اس وقت عالم اسلام متحد ہوتا تو مغربی طاقتوں کے لئے ایسی بے دلیل و حجت ستم انگیزی کی شاید جرأت نہ ہوتی، خود ہم ہندوستان کے حالات دیکھیں، کہ ایک طرف فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں، مسلم درس گاہوں اور تحریکات کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہیں، اور صیہونی اور صلیبی طاقتوں سے ان کا ربط مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، اور دوسری طرف ہم اپنے فروعی مسائل میں مناظرہ کی مجلسیں گرم کر رہے ہیں، اور ایک دوسرے کی تذلیل و تحقیر کی مہم چلا رہے ہیں، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورت حال ہے، اور ہماری فراست ایمانی اور غیرت اسلامی

کے لئے کھلا ہوا چیلنج ہے۔

گو حالات بہت ابتر ہیں، لیکن اسلام بارہا ایسی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا مقابلہ کر چکا ہے، اور یقین ہے کہ اعداءِ دین کسی قدر بھی ظلم و تعدی اور فریب و عیاری کی راہ اختیار کریں وہ حق و راستی کے چراغ کو بجھا نہ پائیں گے۔ اور یہ نور اپنے اوجِ کمال کو پہنچ کر ہی رہے گا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون !!

(.................)

کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟

اس وقت مادی اعتبار سے دنیا کے سب سے طاقتور ملک نے ایک ایسے چھوٹے پس ماندہ ملک کو کسی دلیل و حجت کے بغیر اپنی دست درازی اور ستم فرمائی کا نشانہ بنا رکھا ہے جو قدرتی طور پر قحط زدہ، معاشی اعتبار سے مفلوج، اور سالہا سال سے جنگی حالات سے دوچار ہے، اور جو ایک دہے سے زیادہ ایک دوسری بڑی طاقت کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکا ہے، اس قوم کی غیرت وحمیت کا حال یہ ہے کہ اس پسماندہ اور نہتے ملک کا مغرب ومشرق کی طاقتوں نے بار بار امتحان لیا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امتحان میں پورا اترا ہے، جن لوگوں کو اپنے دست وبازو پر ناز ہے، اس بے دست قوم نے اُن سے پنجہ آزمائی کی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مددِ خاص کے ذریعہ ان کو ان کی بد اعمالیوں کا مزا چکھایا ہے، خدا کرے کہ پھر اس غیبی طاقت کو جوش آئے، اور اس عہد کا فرعون پاش پاش ہو کر رہ جائے، **وما ذلك على الله بعزيز**۔

سوال یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے ان مظلوم اور نہتے بھائیوں کی اخلاقی مدد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے، انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے، ــــ رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول بیان فرمادیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اول اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے، یعنی دل سے بُرا سمجھے، اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قدرت دیں گے، وہ اُسے روکنے کی کوشش کرے گا (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۳۴۰) ـــ ظلم وجور سے بڑھ کر کوئی فکر اور برائی نہیں، یہ تو دنیا میں شرک سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ دنیوی احکام کی حد تک شرک کو گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ظلم ایسی برائی ہے کہ وہ کسی

طور پر قابلِ قبول نہیں، ایسا جرم نہیں کہ جو شخص پہلے سے اس عقیدہ پر ہو، اُسے قتل کرنا جائز ہو، لیکن اگر کوئی شخص کسی کا مال لے لے، کسی کی عزت وآبرو پر حملہ آور ہو، یا کسی کو قتل کر دے تو وہ ضرور لائق سزا ہے، پس ظلم سب سے بڑی بُرائی ہے، اور اپنی طاقت وصلاحیت بھر اس کی مخالفت واجب ہے! ---

مخالفت اور ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ترکِ تعلق بھی ہے، اور ظالموں کے ساتھ ترکِ تعلق کی تعلیم خود قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء، بعضھم اولیاء بعض، ومن یتولھم منکم فانہ منھم، ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین :(المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بیشک اللہ ظلم شعار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ ''دوست نہ بنانے'' کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلب ونگاہ کی محبت، فکر ونظر کا تاثر، سماجی زندگی کی مماثلت اور مالی معاملات وتعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی شدت پر مبنی حکم نہیں ہے، بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا، کہ جو یہود ونصاریٰ ظلم وجور پر کمر بستہ ہوں، مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوا کم فی الدین و

اخرجوا کم من دیارکم وظاهروا علی اخراجکم ان تولوهم، ومن یتولهم فاولئك هم الظالمون (الممتحنہ:۹)

بیشک اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا، محض دین کی بناپر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہونچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل بدطینت یہودیوں اور نصرانیوں سے بےتعلق برتنے کا حکم دیا گیا ہے، غور کیجئے کہ کیا آج امریکہ و برطانیہ ان جرائم کے مرتکب نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام میں در پردہ برطانیہ نے ظالم سربوں کی مدد کی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج ان ممالک کی جفا کاریوں اور ستم انگیزیوں کی وجہ سے افغانستان کے بے آسرا مسلمان اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہیں؟ کیا یہ اس ظالم اسرائیل کے ناصر ومددگار نہیں ہیں، جو آئے دن بےقصور فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہیں؟ اور جنہوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے مادر وطن میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے؟ قرآن نے جن یہود و نصاریٰ سے بےتعلق ہونے اور رشتۂ محبت کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، ان مغربی طاقتوں میں ان میں سے کون سی بات نہیں پائی جاتی؟

جناب بُش نے اس جنگ کو تہذیبی اور صلیبی جنگ کا نام دے کر کیا اس بات کا صاف اعلان نہیں کر دیا کہ انہیں افغانستان کے بے آب و گیاہ صحراؤں اور خشک پہاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا اصل نشانہ وہ لوگ ہیں، جو اپنی سرزمین میں اس سرزمین کے باسیوں کی رضامندی سے اللہ کے دین کو جاری وقائم کرنا چاہتے ہیں، نہ وہ کسی ملک سے قرض کے طلب گار ہیں، نہ انہوں نے پڑوسی ملک کی طرح معاشی

امداد کا کاسۂ گدائی مغرب کے دروازہ پر بڑھایا ہے، انکا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کے اس حصہ زمین پر، جو خود ان کے قبضہ میں ہے، خدا کے دین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، پھر کیا ایسے اعداء دین سے بے تعلقی واجب نہ ہوگی؟

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوا کم فی الدین ولم یخرجوا کم من دیار کم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین ،(الممتحنہ:۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا، جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں، اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں، اور ان کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں — بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور نا منصفانہ روش اختیار کر رکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص شخص کی حوالگی یا کسی خاص مطالبہ کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن کردے گی، اور اسلام کے خلاف بغض وعناد کی جو آگ ان کے سینوں میں سلگی ہوئی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہوجائے گی، محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکر و عقیدہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، اور اسلامی نظامِ حیات ہے، قرآن نے یہود و نصاریٰ کی نفسیات اور ان کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے، اور یہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مبنی بر واقعہ تھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

لن ترضی عنك الیھود ولا النصاریٰ حتی تتبع ملتھم، قل ان ھدی اللہ ھو الھدی ولئن اتبعت اھواء ھم بعد الذی جاء ك من العلم، مالك من اللہ من ولی

ولا نصیر ۔ (البقرہ ۱۲۰)

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود و نصاریٰ کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے، اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالم اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں، اس لئے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیر باد نہ کہدیں اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبین تسلیم خم نہ کردیں، ان کی تشفی نہیں ہوسکتی، اور انشاء اللہ مسلمان کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ دین کے لئے سب کچھ کھونے کو ''پانا'' اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو ''جینا'' تصور کرتے ہیں، اور یہ ان کے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے!

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں، اور انہیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں، منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومت ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی ناوابستہ پالیسی پر قائم رہے، اور امریکہ کی آنکھ بند کر کے حمایت نہ کرے، ورنہ اندیشہ ہے کہ کل ہو کر ان کا پنجۂ استبداد ہمارے ملک کی طرف بھی بڑھے گا، اور انہیں ہمارے ساتھ بھی تحکم آمیز رویہ اختیار کرنے کی جرأت پیدا ہوگی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور برطانیہ کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے،

اور شرعاً بہ حیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، یہ انسانی فریضہ ہے، یہ شرعی ذمہ داری ہے، اور حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی للکار کر ہم سے پوچھ رہی ہے کہ کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

(۲۰۰۱/۱۰/۱۶ء)

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!

مغربی قومیں بہ ظاہر رواداد، انسانیت دوست اور تہذیب کی علمبردار سمجھی جاتی ہیں، اور دوسروں کے گھر میں انسانی حقوق کی حفاظت کا تو گویا انہوں نے بیڑہ اٹھا رکھا ہے، لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے، یہ حقیقی تصویر نہیں، بلکہ اس پر چڑھایا ہوا خوبصورت اور دبیز غلاف ہے، اس قوم کا باطن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض وعناد اور کدورت سے بھرا ہوا ہے، گو انہیں اپنی اس اندرونی کیفیت کے چھپانے کا بڑا ملکہ حاصل ہے، لیکن جیسے برتن لبریز ہو جائے تو پانی چھلک ہی جاتا ہے، اسی طرح وقتاً فوقتاً ان کے حقیقی ارادے کسی نہ کسی طرح نوک زبان پر آہی جاتے ہیں، دشمنانِ اسلام کی نفسیات اور ان کی کیفیات کے بارے میں قرآن مجید کا کیا خوب ارشاد ہے:

قد بدت البغضاء من افواههم و ماتخفي صدورهم اكبر، قد بينا لكم الآيات ان كنتم تعقلون ،(آل عمران:۱۱۸)

بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوا چاہتا ہے، اور ان کے سینوں نے جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور ہم نے احکام کو کھول کر بیان کر دیا ہے، تاکہ تم لوگ دانائی سے کام لو،

یہ حقیقت اس وقت ظاہر ہوگئی، جب جناب بُش صدر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کو "صلیبی جنگ" کے تعصب انگیز لفظ سے تعبیر کیا، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، مسٹر آئی یوجین روستو نائب وزیر خارجہ امریکہ نے ۱۹۶۷ء میں صاف کہا تھا کہ ہم یورپ اور مسلمانوں کے درمیان ہر قیمت پر صلیبی جنگیں جاری رکھیں گے، اور فرانس نے مراقش میں جنگ وجدال کے بارے میں پوری صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جنگ ہلال اور صلیب کے درمیان ہے،

بوسنیا میں عیسائی مظالم نے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا کہ صلیبی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ صرف عنوان اور اسلوب بدل گیا ہے، اگست ۱۹۹۲ء میں بوسنیائی شہر تزلہ کے ایک سرب پادری ''واصل'' نے کہا کہ ''بوسنیا کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ایک جنگ مقدس ہے،'' یہ سب اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے، کہ صلیبی جنگوں کی ہزیمت ابھی یورپ کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہے، اور اس وقت عالم اسلام اس کا واحد نشانہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خوں آشامی اور محسن کشی مغرب کی فطرت کا ایک حصہ ہے، عیسائی کلیساؤں نے اپنے دور اقتدار میں جو مظالم ڈھائے ہیں، کون تاریخ آشنا اس سے نا آشنا ہوگا، کہا جاتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں ۵۰ / لاکھ اشخاص کو کلیسا نے پوپ کی حکم عدولی پر نہایت ہی بے رحمی کے ساتھ اور سخت ایذاؤں سے گذار کر سولی پر چڑھا دیا، ۱۴۸۱ء سے ۱۴۹۹ء تک صرف ۱۸ / سال کے عرصہ میں ملحدین کی تفتیش کرنے والے محکمہ نے ایک ہزار بیس افراد کو زندہ جلا دیا، ۶۸۶۰ / انسانوں کو دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ سائنس دانوں اور دانش وروں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، کہا جاتا ہے کہ محکمہ تفتیش نے ۳ / لاکھ سے زیادہ اہلِ علم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا، پارنیلی (Parnili) کو صرف یہ کہنے پر کہ ''ستارے اپنی جگہ سے نہیں گرتے'' بے تحاشہ تازیانے لگائے گئے، کامپلانڈ (Campland) کو محض اس عقیدہ کی بنیاد پر کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں ہیں، ۲۷ / دفعہ جیل بھیجا گیا، بعض سائنس دانوں کو صرف یہ کہنے کے جرم میں کہ انسان کی رگوں میں خون حرکت کرتا ہے، سخت ترین سزائیں دی گئیں، گیلیلیو (Galileo) یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ زمین متحرک ہے، عیسائی علماء اسے خلاف مذہب تصور کرتے تھے، اس بنیاد پر اسے قید بامشقت کی سزا دی گئی، حد یہ تھی کہ مردوں کے خلاف بھی عقیدہ کی تفتیش کی جاتی تھی، اور اگر کسی میت کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ بدعقیدہ تھا، تو اس کی جائداد ضبط کر لی جاتی، ورثا محروم کر دیئے جاتے، اور مخبری کرنے والوں کو ۳۵ / سے ۵۰ / فیصد تک اس کا ترکہ دے دیا جاتا تھا، (مغربی تمدن کی ایک جھلک، سید مجتبیٰ موسوی: ۳۲،۳۳)

۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۰ء تک مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگوں کا سلسلہ رہا ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور فراخدلی

کامظاہرہ کیا، لیکن صلیبی فوج بچوں، عورتوں، بوڑھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی اور مفتوحین کے ساتھ ایسا سلوک کرتی کہ درندوں نے بھی خواب وخیال میں اس کا تصور نہ کیا ہوگا، خود عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو یہ حال تھا کہ گذرنے والے گھوڑے زانوں تک خون میں ڈوب جاتے تھے، اور ہر طرف انسانوں کے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں نظر آتے تھے۔

اس وقت جو مغربی ممالک انسانیت دوستی کا علم اٹھائے ہیں، خود ان کا کیا حال ہے؟ گوئٹے مالا سی آئی اے کی سازش سے ا؍لاکھ ۱۰؍ ہزار افراد کا قتل عام ہوا، الجزائر میں فرانس نے ظلم وبربریت کا جوننگا رقص کیا ہے، وہ استعماریت کی تاریخ کا نہایت ہی سیاہ باب ہے، کہا جاتا ہے کہ کم سے کم دس لاکھ مسلمان اس جہادِ آزادی میں قربان ہوئے، اور اب جمہوریت کو کچل کر فرانس کے تعاون سے جو فوجی حکومت قائم ہے، ان کے ہاتھوں تہ تیغ ہونے والوں کی تعداد بھی تقریباً ۳۰؍ ہزار ہے، (رواداری اور مغرب: ۱۱۹)

امریکہ اور یورپ کی ناجائز اولاد اسرائیل کی ستم انگیزیاں اور وحشت خیزیاں بھی در اصل مغرب ہی کے کھاتہ میں ہیں، ستمبر ۱۹۸۲ء میں صابرہ اور شتیلہ میں فلسطینیوں کا جو قتلِ عام کیا گیا، اس کی یادیں اتنی دردناک ہیں، کہ ان کا پڑھنا بھی حساس دلوں کے لئے ایک آزمائش ہے، لبنان کے پولیس اور اسپتالوں کے ریکارڈ کے مطابق صرف ۴؍ جون تا ۳۱؍ اگست ۱۹۸۲ء میں قریب ۱۸؍ ہزار فلسطینی اسرائیلی بمباری سے شہید ہوئے، اور اسرائیل کی درندگی کے جو واقعات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، وہ محتاجِ بیان نہیں، اقوامِ متحدہ کی پابندیوں کی وجہ سے ۵؍ لاکھ سے زیادہ عراقی بچے اب تک لقمۂ اجل بن چکے ہیں، یہ سب مغرب کی شرافت کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔

یورپ کی انسانیت سوزی کی سب سے کھلی ہوئی مثال بوسنیا میں ہونے والے مظالم اور انسانیت کش واقعات ہیں، بوسنیا میں بوگومیل نامی عیسائی فرقہ پر رومن کیتھولک نے سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کردئے تھے، اس فرقہ کے لوگ عاجز تھے، انہوں نے ترکی خلیفہ سے ان کے علاقہ میں فوج کشی کی التجا کی، تاکہ انہیں اس ظلم سے نجات مل سکے، چنانچہ سلطان محمد ثانی

نے بوسنیا پر فوج کشی کی ،اور صرف ایک ہفتہ کے اندر ستر شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے ، کیونکہ سربیا کی عوام خود اپنے حکمرانوں کے مظالم سے پریشان تھی ، اور انہیں مسلمانوں کی صورت نجات دہندہ مل گئے سینکڑوں سال بعد سربوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ اس کا انتقام لیا۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، زندہ انسانوں کے سینوں پر خنجروں سے صلیبیں بنائی گئیں، والدین کو بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا ،مسلمانوں کے تن سے جدا کئے ہوئے سروں سے فٹبال کھیلے گئے، مسجدیں شہید کی گئیں، قیدیوں کی آنکھیں نکال دی گئیں ،لوگوں کو زندہ نذر آتش کیا گیا، ہزاروں عورتوں کی برسرِ عام عصمت ریزی کی گئی، انہیں زبردستی حاملہ کیا گیا، تاکہ وہ سرب بچوں کو جنم دیں، زندہ انسانوں کے سر ہتھوڑے سے توڑ دیئے گئے ، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے ، بچوں کے سر کا تحفہ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ میں مغربی وحشت ناکیوں کے واقعات اتنے تکلیف دہ ہیں، کہ سنگ دل سے سنگ دل آدمی بھی انہیں سننے کی تاب نہیں لا سکتا، اور پھر پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر جو مظالم ہوئے ، وہ بھی ان ستم انگیزیوں کے مقابلہ ہلکے محسوس ہوتے ہیں، کیونکہ ان بمباریوں میں تو یکلخت لوگ زندگی کے قفص سے آزاد ہو گئے تھے، لیکن قلب یورپ کے ان مظلوموں کو تو گویا بار بار اور مسلسل قتل کیا گیا، عزت و آبرو کا قتل، جسم و جان کا قتل، آنکھوں کے سامنے معصوم نونہالوں اور بے زبان آبگینوں کا قتل، تاریخی ورثاء اور قومی یادگاروں کا قتل ، ہر قتل ایسا کہ دلوں کو تڑپا دے، اور زبان سے گویائی چھین لے۔

عجیب بات ہے کہ جتنے انسانیت سوز ہتھیار بن رہے ہیں، وہ سب مغرب ہی کا تحفہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ کے پاس دو سو چالیس ہزار ، روس کے پاس ۸۰ / ہزار اور برطانیہ کے پاس پندرہ ہزار صرف میگائی بم ہیں، جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرنے والے بم سے کئی ہزار گنا زیادہ طاقت ور ہیں، ایک محقق کا تجزیہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں اسلحہ سازی اور جنگ میں جتنی رقم خرچ ہوئی ہے، اس سے پچاس سال تک دنیا کے تمام لوگوں کو مفت غذا اور دو تہائی آبادی کے لئے مکان فراہم کیا جا سکتا تھا، لیکن مغرب کو موت کی سوداگری کا جو شوق ہے، اس کی وجہ سے مہلک ہتھیاروں کی صنعت اس وقت سب سے بڑی

صنعت ہے، اور دن رات ایسے ہتھیار بنانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسان ہلاک اور آبادیاں ویران کی جاسکیں، اور موت و ہلاکت کے یہ تاجر الٹے مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہراتے ہیں۔

افسوس کہ منصوبہ بندی کے فقدان اور ذرائع ابلاغ تک رسائی سے محرومی نے مسلمانوں کو مظلوم ہونے کے باوجود ظالموں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، حالانکہ مغرب کی تاریخ کا ایک ایک حرف بے گناہوں کے خون سے سرخ فام ہے، اور اس کے ہر بن مو سے آواز آرہی ہے کہ:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

(۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

افغان جنگ کا ایک مرحلہ تمام ہو چکا ہے، اور اس میں خونِ مسلم کی جو ارزانی ہوئی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، حقیقت یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط، مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ اور جزیرۃ العرب میں یہود ونصاریٰ کی واپسی کے بعد عالمِ اسلام کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ ہے یہ عدل پر ظلم کی فتح اور دلیل و حجت کی طاقت پر آہن وفولاد کی طاقت کا غلبہ ہے، یہ اصول وقانون کے مقابلہ لاقانونیت کی جیت ہے، اس نے مغرب کی ستمگری اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے جور و جفا اور ناانصافی کو بے نقاب کر دیا ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ایشیائی اور ترقی پذیر ممالک کو مغربی طاقتوں کا کھلونا بن کر رہنا پڑے گا، اور اگر وہ اپنے حقوق کے معاملے میں سرخمیدگی کے بجائے سرفرازی کا راستہ اختیار کریں گے تو کسی دلیل وحجت کے بغیر ان کا سر کچل دیا جائے گا۔

دراصل طالبان اس وقت اسلام کی فرماروائی اور اس کی حکمرانی کی صلاحیت کی ایک علامت بن گئے تھے، طالبان کی آمد سے پہلے افغانستان میں امن اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں تھی، طوائف الملوکی کی کیفیت تھی، مختلف علاقے مختلف کمانڈروں کے زیر اختیار تھے، اور ہر گروہ اپنے مخالفین کے ساتھ نہایت سفاکی سے پیش آتا تھا، ان حالات میں طالبان ابرِ رحمت بن کر اس ملک کی فضاء میں اترے، اور بہت کم عرصہ میں پورا ملک ان کے زیر نگیں آگیا، وہ جس علاقہ میں گئے وہاں امن وسلامتی، حسنِ سلوک، اسلامی اخوت اور انسانی محبت کی سوغات لے گئے، جہاں تین دوپہر میں دکانیں لوٹ لی جاتی تھی، وہاں یہ حال ہو گیا کہ لوگ رات میں بھی اپنی دوکان کو مقفل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

کمیونسٹوں کے عہدِ اقتدار میں اس بات کی منظم کوشش کی گئی کہ مسلمان اسلامی تہذیب کو خیر آباد کہہ دیں، منصوبہ بند طور پر بے حجابی اور بے نقابی کو فروغ دیا گیا، اور زندگی کے ہر گوشہ میں ملحدانہ ثقافت کا رنگ گھولنے کی کوشش کی گئی، طالبان نے نہایت کامیابی کے ساتھ سماج میں پھیلے ہوئے اس کینسر کا علاج کیا، یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اس میں غلو اور افراط کے واقعات بھی پیش آئے، لیکن اس سے زیادہ غیر جمہوری واقعات دوسرے ملکوں اور حکومتوں میں پیش آتے رہے ہیں، اس لئے وہ کچھ اس قدر نا قابلِ برداشت بھی نہ تھے جو ایک ملک کے دوسرے ملک میں مداخلت کا جواز فراہم کرتے ہوں۔

مغرب کو افغانستان کا یہی اسلامی کردار کھٹکتا رہتا تھا، کیوں کہ افغانستان نے یہ بات ثابت کردی تھی کہ اسلام بحیثیت سماج وسیاسی نظام کے آج بھی نہ صرف قابلِ نفاذ ہے، بلکہ دنیائے انسانیت کی کامیاب رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے، مغرب نے معاشی پابندیاں لگا کر ہر چہار طرف سے خشکی سے گھرے ہوئے اس ملک کو مفلوج کرنے کی کوشش کی، اور سمجھا کہ اس طرح افغان مغربی طاقتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے نہایت ہی استقامت کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور حکومت کے ذمہ داروں اور عہدیداروں نے ایسی سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی اختیار کی کہ دیکھنے والوں کو خلافت راشدہ کا دور یاد آجاتا تھا، ملک کے پچانوے فی صد حصہ پر قابض ہونے کے باوجود ان کو ملک کا جابر حکمراں تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا، اور انہیں بین الاقوامی سطح پر تنہا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی، لیکن انہوں نے خدا پر بھروسہ رکھا، اور انسانی سہاروں کی فکر نہیں کی، نہ کبھی انہوں نے قرض کے ہاتھ پھیلائے، نہ کسی سے اعانت و امداد کے طالب ہوئے، اور یہ بھی وضاحت کرتے رہے کہ اس ملک کا اسلامی نظام یہاں کے باشندوں کی مرضی سے ہے، اور ہم اسے کسی دوسرے ملک پر تھوپنا نہیں چاہتے۔

گیارہ ستمبر کو امریکہ کی بے آبروئی کے واقعہ کے بعد بھی امریکہ کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کرسکا جو دہشت گردی کے اس واقعہ میں اسامہ بن لادن، القاعدہ یا افغانستان کی شرکت کو بتلاتا ہو، بلکہ متعدد قرائن اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ اصل میں یہ سب کچھ

یہودیوں کی کارستانی تھی، جن کی تاریخ سازشوں، ریشہ دوانیوں اور دہشت گردی کے واقعات سے پُر ہے، لیکن چوں کہ افغانستان کی اسلامی شناخت مغرب کی نظر میں چبھ رہی تھی اس لئے بلا ثبوت اور بلا حجت ودلیل افغانستان پر ظالمانہ اور نا منصفانہ فوجی کارروائی کی گئی، جس نے ہزاروں بے قصوروں کی جان لے لی، اور ایک جائز حکومت کو حق حکمرانی سے محروم کردیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ کسی ملک سے خطرہ کم اور محدود ہوتا ہے، اگر اس ملک کو فتح کرلیا جائے تو وہ ملک قابو میں آجاتا ہے، لیکن نظریہ کی طاقت ملک اور حکومت سے زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا دائرہ اثر بہت وسیع ہوتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ کوئی ایسا مذہب مدمقابل ہو جو آفاقی حیثیت کا حامل ہو، مغرب پر گو مذہباً عیسائیت کا غلبہ ہے، لیکن عملاً وہ ایک غیر مذہبی نظام حیات کا نقیب ہے، کلیسا اور حکومت کی جنگ کے بعد عملی زندگی سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا ہے، اور قیصر کو "خدا" سے زیادہ بااختیار بنادیا گیا ہے۔

اس نظام حیات کا لب لباب ایسی زندگی ہے جو اخلاق اور آخرت کے جوابدہی کے تصور سے یکسر آزاد ہے، جو ایسی ثقافتی آزادی کا داعی ہے کہ اس میں بہت سی مسلمہ اخلاقی قدروں کی آمیزش تک نہ ہو، جس میں شرم وحیا کو خود قابلِ حیاء سمجھا جاتا ہو، جو عیش کوشی اور عشرت سامانی میں کہیں حائل نہ ہوتا ہو، انسان کی خواہشات اور عیش کامیوں کے اصل سرچشمے دو ہیں، جنس اور مال، یہ اباحیت پسند نظام حیات ان دونوں کو کھلی آزادی اور بے قید اجازت عطاء کرتا ہے، اس کی وجہ سے مغرب میں بہت سی برائیوں کے ساتھ خاص طور پر دو چیزوں نے بہت فروغ پایا، ایک تو غیر قانونی جنسی تعلق، یہاں تک کہ وہ رشتے جن سے جنسی اتصال کے بارے میں خود فطرتِ انسانی اباء کرتی ہے، ان پر بھی کوئی قدغن باقی نہیں رہی، اور ہم جنسی جیسے غیر فطری اور صحت انسانی کے لئے مضرت رساں فعل کو بھی قانونی اجازت دے دی گئی۔

معاشی تگ ودو میں سرمایہ داروں کو اس بات کی پوری چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جیسے چاہیں کمائیں، اور جس طرح پر منظور ہو غریبوں کا استحصال کریں، چنانچہ لوگوں کو عیش

پرستانہ زندگی کا خوگر بنایا گیا، اسباب عشرت کی فراہمی کو آسان کر دیا گیا، اور اس طرح سودی نظام کو ایسا مستحکم کیا گیا کہ آج مغرب زدہ ممالک میں سود سے بچ کر کسی کاروبار کا انجام دینا دشوار ہو گیا ہے، اور خود مغربی ممالک میں تو روز مرہ کی ضروریات میں بھی سود سے بچنا مشکل ہو گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ غریب مزدور پوری زندگی کماتے اور سود بھرتے جاتے ہیں، اور دولت مندوں کی تجوریاں ان کے لہو سے سدا آباد رہتی ہیں۔

مغرب کے استحصالی نظام کے مقابلہ کمیونسٹ تحریک کھڑی ہوئی جو مزدوروں کے استحصال کے خلاف برسر پیکار تھی، اور سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ظلم تصور کرتی تھی، لیکن اشتراکی نظام چونکہ کسی مثبت فکر کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا تھا، بلکہ منفی سوچ اور ردعمل کے طور پر اس کی نشونما ہوئی تھی، اس لئے وہ افراط وتفریط سے خالی نہیں رہا، انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی اور سرکاری ملکیت، مزدوروں کے لئے حق حکومت، اور شخصی آزادی کا اس حد تک گلا گھونٹ دینا کہ اس نظام کے خلاف کسی زبان کو جنبش کی بھی اجازت نہیں، وہ امور تھے جنہوں نے اشتراکی نظام کے بت کو سو سال سے بھی کم عرصہ میں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

اب دنیا میں اس اباحی نظام حیات کے مقابلہ اسلام کے سوا کوئی اور نظام حیات نہیں، کیوں کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس کا دائرہ مسجد تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ہمہ گیر نظام ہے، جس نے انفرادی اور شخصی زندگی سے لے کر سماجی زندگی، معاشی وسیاسی نظام اور بین ملکی تعلقات تک ہر گوشہ کا احاطہ کیا ہے، اور بحیثیت مسلمان ہر صاحب ایمان کے لئے اسلام کی ان وسیع الاثر تعلیمات پر ایمان رکھنا ضروری ہے، پھر یہ ایسا معتدل، متوازن، فطرت انسانی سے ہم آہنگ اور عہد کے تقاضوں کے مطابق ہے، کہ انسانی فطرت اور عقل سلیم بے اختیار اس پر لبیک کہتی ہے، اس میں شخصی آزادی بھی ہے، لیکن اس کی معقول حدود ہیں، اس میں معاشی مسابقت کی حوصلہ افزائی بھی ہے، لیکن استحصال کی اجازت نہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہے، لیکن مرد وعورت کے درمیان صلاحیت کا جو قدرتی فرق پایا جاتا ہے اس کا لحاظ بھی ہے، اس میں صلح وامن اور بین ملکی

تعلقات سے متعلق ہدایات بھی ہیں، لیکن بلا دلیل وحجت کسی ایک گروہ کے پوری انسانیت پر مسلط ہو جانے کا موقع نہیں، اس میں افراد واشخاص کی صلاحیتوں میں پائے جانے والے تفاوت کا لحاظ بھی ہے، لیکن بحیثیت انسان، انسانی وحدت ومساوات کا تصور بھی۔

پھر چوں کہ یہ دین قدم قدم پر انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور انسانی ضرورتوں کا پاسدار ہے، اس لئے یہ ایک عملی دین ہے، ایک ایسا دین جو افلاطون وارسطو کے تھیوری کی طرح محض کتابوں کے صفحات میں نہیں رہا، بلکہ ایک ہزار سال سے زیادہ بڑی حد تک وہ زندگی کے تمام شعبوں میں جاری وساری رہا ہے، اور اس نے ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے خطہ پر حکمرانی کی ہے، مغربی اقوام کو اصل پریشانی یہی ہے کہ ان کے جدید اباحیت پسندانہ آزادانہ نظام حیات کو پورے عالم تک وسعت دینے میں سوائے اسلام کے کوئی اور مزاحم نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ کمیونزم کے زوال کے بعد، سے اس طرح کی باتیں شروع کر دی گئی تھیں کہ اب اس کے بعد اس سے بڑا مد مقابل اسلام ہے، بوسنیا کی جنگ کے موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم جان میجر نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ہم یورپ کے قلب میں کسی مسلم مملکت کو برداشت نہیں کر سکتے، اہل مغرب بوسنیا، میں سفا کی کا شب وروز مشاہدہ کرتے رہے، اور انسانیت اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کو سربوں کی خوں آشامی اور غارت گری پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا، چیچنیا اور کوسوو میں بھی انسانیت سوزی کا ننگا رقص ہوتا رہا، اور مغربی اقوام کو اس وقت مظلوموں کی دادرسی کا کوئی خیال نہیں آیا، ایران نے اسلامی نظام کا علم اٹھایا، تو عراق کو اس کے خلاف اکسایا گیا، پھر عراق کی طاقت کو توڑنے کے لئے ایک خاص منصوبہ کے تحت عراق وکویت جنگ کرائی گئی، اور اب کسی دلیل وثبوت کے بغیر افغانستان کی طالبان حکومت کو نشانہ بنایا گیا، اور صدر امریکہ جناب بش اس کو تہذیبی اور صلیبی جنگ قرار دے کر دل میں چھپے ہوئے بغض کو اپنی زبان تک لے آئے۔

دراصل کسی نظریہ اور نظامِ حیات کا مقابلہ نظامِ حیات ہی سے ہو سکتا ہے، فولاد وآہن سے زمین فتح کی جا سکتی ہے، اور ملکوں کو تخت وتاراج کیا جا سکتا ہے لیکن دلوں کی

دنیا نہیں جیتی جاسکتی، اور ذہن و دماغ کی مملکت کو اپنا تابع نہیں بنایا جاسکتا، غور کیجئے کہ ایرانیوں، تاتاریوں اور مغلوں نے ابتدائی دور میں عالم اسلام پر کیسی یلغاریں کیں؟ ایسا لگتا تھا کہ ان کی تلاطم خیز موجوں کے آگے اسلام خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا، لیکن ان قوموں کے پاس فوج تھی، سپاہی تھے، تیر و شمشیر کی کثرت تھی، معرکہ کارزار کے لئے مطلوبہ سواریاں تھیں، لیکن ان کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے، اور ان کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی قابل عمل نظام حیات، اور قلب و روح کو اپنی طرف کھینچنے والی کوئی فکر سلیم موجود نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک و زمین اور حکومت واقتدار کے فاتح قلب ونگاہ کے مفتوح بن گئے، اور جو طوفان اسلام کو تہہ و بالا کرنے کے لئے اٹھا تھا وہی مدتوں اس دین حق کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتا رہا، اسی کو اقبال نے کہا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانے سے

مغرب پر اسلام کی جاذبیت، اس کی کشش، قلب و روح میں اتر جانے کی صلاحیت، فکر ونظر پر فتح پانے کی لیاقت اور اپنے متبعین میں حق و راستی کے لئے آتش انقلاب سلگا دینے اور جوشِ جنوں بھر دینے کی اہلیت کا خوف چھایا ہوا ہے۔

افسوس کہ ہم مسلمان بھی آج کل واقعات کو مادی نتائج کے پیمانوں میں تولنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور ظاہری ظفر مندی و فتح سامانی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن اسلام میں اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی آخر دم تک اپنے آپ کو حق پر ثابت قدم رکھے، سچائیوں کے لئے گنوانا ''کمانا'' ہے۔ حق و راستی کے لئے کھونا ''پانا'' ہے، اہلِ جنوں کو اپنی منزل کے لئے لٹ جانے میں بھی لطف آتا ہے، اس صحابی کے واقعہ کو یاد کیجئے کہ دشمن نے تیر ماری، اور جان نکل رہی ہے، لیکن اس وقت بھی زبان اپنی شادکامی وکامرانی کا نعرہ بلند کرتی ہے کہ ''فزتُ ورب الکعبة'' (رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا) پیغمبروں کو اپنا وطن چھوڑنا، بے وطنی اور جلا وطنی کو قبول کرنا پڑا، بعض انبیاء گذرے ہیں کہ آروں سے جسم مبارک دولخت کر دیا گیا، تو کیا نعوذ باللہ یہ انبیاء ناکام رہے؟ ہرگز نہیں! کیوں کہ اپنے

مقصد میں آخری درجہ کی کوشش اور اس کے لئے سب کچھ نثار و قربان کر دینا ہی اصل کامیابی ہے۔

مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہئے، اور یہ عزم رکھنا چاہئے کہ وہ ہر طرح کی آزمائش سے گزریں گے، لیکن ہمیشہ حق کے طرف دار اور اسلام کے علمبردار بن کر رہیں گے، اور دنیا کو سمجھ لینا چاہئے کہ یلغار کے مظالم یا افغانستان کی جنگ سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکتے، اور نہ ان کے ایمان کا سودا کیا جاسکتا ہے، یہ وہ نشہ ہے کہ جس قدر اتارنے کی کوشش کی جائے اسی قدر چڑھتا جاتا ہے، یہ وہ پودا ہے کہ جس قدر تراشا جاتا ہے اسی قدر سر بلند اور سایہ دار ہوتا جاتا ہے۔ قلعہ مسمار کئے جاسکتے ہیں، کاشانے ویرانے میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں، پہاڑ کی چوٹیوں کو خاکستر بنایا جاسکتا ہے، آتش فشاں بجھائے اور دریاؤں کے رُخ موڑے جاسکتے ہیں، ملکوں کے جغرافیہ تبدیل ہو سکتے ہیں اور تختِ اقتدار پر بیٹھنے والوں کو تختۂ دار کی زینت بنایا جاسکتا ہے، لیکن دلوں میں جو ایمان کی انگیٹھیاں سلگی ہوئی ہیں، اسے بجھایا نہیں جاسکتا، اور ذہن و دماغ کی مملکت پر ایمان کی حکمرانی کے جو نقشِ دوام ثبت ہیں انہیں مٹایا نہیں جاسکتا، اس لئے اقبال کا شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بے تکلف زبان پر آتا ہے کہ ؂

اگر افغانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۲۱۔ دسمبر۔ ۲۰۰۱ء)

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

جب انسان پر کوئی مصیبت اور آزمائش آئے تو ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادفع بالتی ھی احسن السیئة (المومنون:۹۶)

بری بات کے جواب میں بہتر طریقہ اختیار کرو

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس جانب بھی متوجہ فرمایا ہے کہ یہ بہتر طریقہ جواب (دفاع بالاحسن) دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرتا ہے، یہ صبر آزما ہے، لیکن کامیابی کی کلید ہے:

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة، ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم، و ما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذو حظ عظیم

(المومن:۳۴،۳۵)

نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہی دلی دوست ہو جائے، اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو قوتِ برداشت رکھتے ہوں، اور یہ بات اسے حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

یہ ''بہتر بات'' کیا ہے؟۔ قرآن ہی نے اس کو ان آیات سے پہلی آیت میں بیان فرمایا ہے:

و من احسن قولا ممن دعاء الی الله وعمل صالحا

وقال انني من المسلمين (المومن:۳۳)

اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے، خود بھی نیک عمل کرے، اور کہے: میں فرماں برداروں میں سے ہوں؟

یعنی بہتر بات سے ''دعوت الی اللہ'' مراد ہے، دعوت دشمن کو دوست بناتی ہے، دعوتِ حق کی علمبردار قوم کو نصیب ور بناتی ہے، البتہ اس کے لئے صبر، قوتِ برداشت اور حسن تدبیر کی ضرورت ہے، صبر کے معنی صرف چوٹ کھا کر خاموش رہنے کے نہیں ہیں، بلکہ صبر بڑے مقصد کے لئے مصیبتوں اور آزمائشوں کو سہنے اور حوصلہ شکن حالات میں بے برداشت ہونے کے بجائے حکمت و تدبیر سے کام لینے کے ہیں۔

اس وقت عالمی حالات مسلمانوں کے لئے بہ ظاہر بہت حوصلہ شکن اور ہمت کو پست کرنے والے ہیں، اچھی خبروں کے لئے کان ترستے ہیں، خوش کن نتائج کو دیکھنے کے لئے آنکھیں سراپا انتظار ہیں، سکون و طمانینت دینے والی اطلاعات کے لئے قلوب بے چین ہیں، بہ ظاہر ہر طرف ظلمت کی گھٹائیں اور اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، لیکن مومن کا کام یہ ہے کہ وہ ان اندھیروں میں بھی روشنی تلاش کر لے، ناامیدیوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں سے بھی امید کی کرنیں اسے نظر آئیں اور وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، صحابہ کا یہی طریقہ تھا، وہ ناموافق حالات میں بھی ایسے پہلو تلاش کر لیتے تھے، جس سے طمانینت ہو اور جس سے ان کا خدا راضی ہو جائے، لوگ انہیں خوف دلاتے، کہ پوری دنیا تمہارے مقابلہ پر جمع ہوگئی ہے، اور وہ کہتے ہمارے لئے خدا کافی ہے، **حسبنا اللہ و نعم الوکیل**، ان کے ایمان میں ایسی وحشت انگیز خبروں سے اضافہ ہی ہو جاتا، لوگ انہیں ان کے رفقاء کی شہادت کا طعنہ دیتے اور وہ اسے اپنے بھائیوں کے لئے انعام تصور کرتے۔

اس وقت حالات گو بہت بُرے ہیں، لیکن اس میں ایک پہلو خیر کا بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے اور اسلام کے بارے میں جاننے کا جو رجحان اس وقت پیدا ہوا ہے، کم از کم پچھلے پچاس سال میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اسلام کے خلاف میڈیا کی زہرافشانی اور اس کے نتیجہ میں اسلام کو جاننے کی خواہش کو دیکھتے ہوئے سیرت کا وہ واقعہ یاد آتا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی میں جب حج کا موسم آتا، یا کوئی بڑا تجارتی میلہ لگتا، تو آپ کی طرف سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لئے اہلِ مکہ طرح طرح کی باتیں کرتے، اور زیادہ تر یہ کہا جاتا کہ آپ جادوگر یا مجنون ہیں، (والعیاذ باللہ) اور ایسا جادو جانتے ہیں، جس کے ذریعہ والدین اور اولاد اور شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے ہیں، لیکن یہی پروپیگنڈہ آپ کی طرف لوگوں کی توجہ کا باعث بن جاتا، باہر سے آنے والوں میں ایک کھوج پیدا ہو جاتی کہ آخر یہ کون شخص ہے جس کی مخالفت اس شدو... کے ساتھ کی جارہی ہے؟ یہی تجسس لوگوں کو بارگاہ نبوت تک لاتا، پھر وہ آپ سے متاثر ہو کر اور دامن دل کو ایمان سے بھر کر واپس ہوتے، یہ آپ کی دعوتی زندگی کا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا، آپ ہر بری بات کا جواب ''بہتر بات'' یعنی سنجیدہ طریقہ پر دعوت الی اللہ سے دیتے، لوگ گالیاں دیتے، اور آپ ان کے لئے ایمان کی دعاء فرماتے، لوگ بُرا بھلا کہتے، اور آپ کی راہوں میں کانٹے بچھاتے، اور آپ ان پر میٹھے بول کے پھول برساتے، اور کہتے: **قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحون**، (خدائے حقیقی سے اپنا رشتہ جوڑلو تو تم کامیاب ہوگے) لوگ آپ کے خلاف زہر افشانی کرتے لیکن آپ کی زبان مبارک سے کبھی ان کی ذات کے لئے کوئی تلخ کلمہ بھی نہیں نکلتا، لوگ آپ کی ذات کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے، اور آپ شب وروز خدا کی توحید کا اعلان فرماتے، لوگ نفرتوں کی آگ سلگاتے، اور اس کی آنچ کو تیز تر کرنے کی کوشش کرتے، اور آپ محبت کی پھوار سے اسے بجھانے کی راہ اختیار کرتے۔

یہی وہ ''طریقہ احسن'' ہے جس کی قرآن نے دعوت دی ہے، اور جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کا پیکر ہوں، موجودہ حالات میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم نفرت کا جواب کلمہ محبت سے دیں، مشتعل کر دینے والی باتوں کا جواب سنجیدہ، مدلل اور حقیقت پسندانہ اسلوب میں دیا کریں، تو اس طرح ہم اسی شر کو اپنے لئے سرچشمۂ خیر بنا سکتے ہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد وسط دسمبر تک کی اطلاع یہ ہے کہ امریکہ میں ۳۵ ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سالانہ قبول اسلام کی شرح

۲۵ر ہزار ہے، لیکن ۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد اس میں چار گونہ اضافہ ہوگیا ہے (ماہانہ رفیق منزل، جنوری ۲۰۰۲ء: ۲۳) پوری دنیا میں اسلامی ویب سائٹس کے وزیٹرس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

سعودی عرب میں اٹلی کے سفیر نارکوٹو کارڈیلی نے قبول اسلام کا اعلان کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریاض کے ایک مرکز دعوت میں پورے رمضان المبارک اس سال ہر دن اوسطاً ۵ر غیر مسلم آکر اسلام قبول کرتے رہے، جب کہ صرف ریاض میں اس طرح کے تقریباً ۲۰ر مراکز ہیں، (حوالۂ سابق بحوالہ عرب نیوز ۲۷ر نومبر) یہ بات قارئین کے علم میں ہوگی کہ جو امریکن فوج سعودی عرب آئی تھی، اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمان سماج سے متأثر ہوکر ان میں سے دو ہزار سپاہیوں نے اسلام قبول کرلیا، اس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شکست مسلمانوں نے کھائی ہے نہ کہ اسلام نے، مسلمانوں کے فاتح تاریخ میں اکثر اسلام کے مفتوح بنتے رہے ہیں، اور آج بھی یہ تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ منصوبہ بند پروپیگنڈہ کا جواب منصوبہ بند دعوت سے دیا جائے، اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ہر علاقہ اور ہر ملک میں اسلام کا تعارف پیش کریں، اسلام نے امن و آشتی، صلح و رواداری اور محبت کا جو پیغام انسانیت کے لئے دیا ہے، اس پیغام کی خوشبو سے ہم پوری دنیا کی فضاء کو عطر بار بنادیں، اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کریں کہ اسلام محبت اور انسانی اخوت کو جلا دینے والی بادسموم نہیں، بلکہ انسانیت کو اخوت و بھائی چارہ کی خنکی سے ہمکنار کرنے والی بادنسیم ہے۔

ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریہ قریہ، شہر شہر، محلّہ محلّہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات رکھیں، اور قرآن صلح و امن کی جو تعلیم دیتا ہے اس کو خوش اسلوبی سے پیش کریں، ان آیات کے ترجموں پر مشتمل ورقئے طبع کرائیں، اور اسے برادران وطن تک پہونچائیں، تلگو اور مقامی زبان کے اخبارات تک ایسے مضامین پہنچانے کی کوشش کریں، گو اس سلسلہ میں انگریزی اخبارات کا رویہ ایک حد تک غیر

حقیقت پسندانہ رہا ہے، اور یہ شکایت عام ہے کہ اسلام کے خلاف جو بے سروپا باتیں آتی ہیں، انہیں تو یہ بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں، اور اس کے جواب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اسے بہت کم قابل اعتناء سمجھتے ہیں، لیکن اس میں ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، ہم اس بات کی کوئی منظم کوشش نہیں کرتے کہ ایسے مضامین اور مراسلات کا سنجیدہ، غیر جذباتی اور مدلل جواب دیں، اور انگریزی اخبارات کے ذمہ داروں تک پہنچ کر انہیں مسلمانوں کی شکایت کی طرف متوجہ کریں، ہم اشتعال واحتجاج کے بجائے انہیں قائل کریں، اس طرح ہم انگریزی اخبارات تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ ایک ایسے ذریعہ ابلاغ تک ہمیں رسائی حاصل ہوئی ہے، جس میں اپنی بات، اپنی زبان اور اپنے قلم سے پہنچانے کا پورا موقع حاصل ہے، اس میں ہم نہ کسی سہارے کے محتاج ہیں، اور نہ کثیر وسائل کے، اور اس وقت یہ سمجھدار اور باشعور لوگوں تک رسائی کے لئے نہایت وسیع الاثر ذریعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرے ذرائع ابلاغ بھی ہیں، جن کے ذریعہ ہم لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان وسائل وذرائع سے استفادہ کریں، اور جذبات کے بجائے حکمت وتدبیر اور اشتعال کے بجائے صبر واستقامت کی راہ اختیار کریں، اس طرح ممکن ہے کہ یہی طوفانِ مغرب امتِ مسلمہ کو ایک نئے ساحل سے ہمکنار کر دے، بہ قول شاعر اسلام علامہ اقبال:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

(۱۵ر فروری ۲۰۰۲ء)

بہار ہو کہ خزاں

کامیابی اور ناکامی، جیت اور ہار انسان کی زندگی کا ساتھی ہے، اسلام کی نگاہ میں غلبہ اور کامیابی حق ہونے کی اور مغلوبیت اور ظاہری ناکامی کسی بات کے غلط ہونے یا کسی انسان یا جماعت کے ناحق ہونے کی دلیل نہیں، ایسا ہوتا تو کبھی کفر کو اسلام پر ظاہری غلبہ حاصل نہ ہو پاتا، لیکن بسا اوقات اور تو اور خود انبیاء کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، بدر کی لڑائی بے سروسامانی کی تھی، اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، حنین واحد میں خود حضور ﷺ موجود تھے، لیکن ایک میں ابتداءً اور دوسری میں آخری مرحلہ میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے تاکہ برے وقتوں میں بھی امت کے لئے نبی کا اسوہ موجود رہے۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان کا ہاتھ حق اور سچائی کے لئے اٹھے، سچائی کی مدد اصل کامیابی ہے۔ اگر یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہو جب بھی انسان ناکام نہیں اور غلطی میں تعاون بہر صورت ناکامی ہے، گو بظاہر نتیجہ اس کے حق میں ہو جائے۔

اصل میں یہ دونوں گھڑیاں اہل ایمان کے لئے امتحان کی ہیں، مومن وہ ہے کہ جب فتح مند ہو اور کامیابی اس کے قدم چومے، تو اس کا سر جھکا ہوا ہو، اس کی زبان پر خدا کی حمد ہو، اس کی پیشانی اللہ کے سامنے خم ہونے کو بے قرار ہو جائے، وہ اکڑفوں میں مبتلا نہ ہو جائے، تواضع و نیاز مندی اس کے ایک ایک انگ سے نمایاں اور عجز و فروتنی اس کے ایک ایک بول سے ہویدا ہو، جن سے اس کا اختلاف رہا ہو، ان کے لئے وہ ریشم کی طرح نرم ہو جائے، فتح مکہ کا موقع ہے، اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کے لئے خوشی کا کیا موقع ہو سکتا تھا؟ جہاں ٹھکرایا گیا، جھٹلایا گیا، ارض وطن چھوڑ کر نکلنے پر مجبور کیا گیا اور سر پر انعام مقرر ہوا، آج وہی سرزمین مکہ آپ کے استقبال

کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے اور دس ہزار جان نثاروں کا لشکر جرار اپنا سر دھڑ آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ یہ موقع ہے پر جوش نعروں کا، دشمنوں پر کم سے کم فقرہ بازیوں اور طعنہ اندازیوں کا، سینہ تنا ہوا اور سر مارے فخر کے اونچا نہ ہو تو جشن فتح کا کیا لطف آئے؟ لیکن آج آپ ﷺ پر عبدیت و بندگی کا رنگ ہر دن سے بڑھ کر ہے، اونٹنی پر سوار ہیں، زبانِ مبارک حمد الٰہی سے تر ہے، تواضع سے سر مبارک جھکا ہوا اور بار ہا اونٹنی کی کوہان سے لگ جاتا ہے، مکہ میں داخل ہوئے تو حضرت ام ہانی کے گھر کو اپنی میزبانی سے رونق بخشی اور وہیں غسل کر کے نماز شکر ادا فرمائی۔

اگر کبھی ہزیمت ہو، شکست ہو، ظاہری ناکامی سے انسان دوچار ہو، تو اس وقت بھی توازن قائم رکھے، صبر و استقامت کی راہ اختیار کرے اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرے، طائف کے واقعہ سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ واقعہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش نہیں آیا، آپ ﷺ اہلِ مکہ سے مایوس بڑی امیدوں کے ساتھ طائف پہنچے تھے، لیکن اہلِ طائف کا سلوک اہل مکہ سے بھی برا ثابت ہوا، پتھروں کی بارش نے جسم مبارک کو لہولہان کر دیا تھا، آپ ﷺ اس دُکھ بھری گھڑی میں اللہ سے رجوع ہوئے اور ایسی درد انگیز دُعاء فرمائی کہ آج بھی قلب سلیم اس سے لرز اٹھتا ہے، مگر اس وقت بھی زبانِ مہربان پر اپنی قوم کے لئے دُعاء کے الفاظ ہیں اور خدائے رحمان سے کوئی گلہ نہیں؛ بلکہ ایک ایک لفظ سے صبر و رضا اور بر و وفا ظاہر ہے۔

ایمان انسان کے اندر خدا کی خشیت پیدا کرتا ہے، جس انسان کے اندر خدا کا خوف اور اس پر یقین پیدا ہوتا ہے وہ پوری دنیا سے بے خوف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ یقین رکھتا ہے کہ نفع و نقصان کے فیصلے دنیا میں نہیں آسمان میں ہوتے ہیں، خدا کی مشیت کے بغیر نہ کوئی اسے نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، ایمان انسان کو بے ضمیری اور اُصولوں پر سمجھوتہ سے باز رکھتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں پر کیا کچھ آزمائشیں نہ آئیں، وہ کن کن ابتلاؤں سے نہیں گزرے؟ اور ان کو راہِ حق سے منحرف کرنے اور کفر و شرک سے سمجھوتہ کرنے کے لئے ترغیب و تحریص کے کیا کیا وسائل اختیار نہ کئے گئے؟ مال و زر کے، اعلیٰ

عہدوں کے، حکومت واقتدار کے اور حسن و جمال کے، فکر و ایمان کی قوت نے کبھی پائے استقامت میں تزلزل نہیں آنے دیا، مسلمان جہاں کہیں بھی رہے، اس کی پیشانی صرف خدا کے سامنے جھکتی ہے، وہ حالات کے سامنے سپر نہیں ڈال سکتا، وہ مقابلہ کی ہمت وحوصلہ سے محروم نہیں ہوسکتا، وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرسکتا، وہ ایمان فروش نہیں ہوسکتا اور اس کے دین وایمان کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔

''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے'' یہ احساس اس کو موجوں سے کھیلنے کا حوصلہ بخشتا ہے اور وہ سرد وگرم کو سہتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے، ہر حال میں اللہ کی طرف نگاہ ہو، یہی ایک مسلمان کے لئے اصل اسوہ ہے۔

جب انسان پر برا وقت آئے، ایسے حکمراں مسلط ہوں یا ایسے لوگ حکمرانی سے قریب پہنچ جائیں جن سے ظلم وجبر اور حق تلفی وناانصافی کا اندیشہ ہو تو اپنے اعمال پر نگاہ کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان کے اعمال ہی کے مطابق اس کو احوال بھی پیش آتے ہیں۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا، قتل عام کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ ہماری بداعمالیوں نے نادر کی صورت اختیار کرلی ہے'' شامت اعمال درصورت نادر گرفت!''۔ اس لئے ایسے حالات دعوت دیتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں اور اپنے حالات پر نظر کریں کہ کہیں ہماری بداعمالیوں نے تو ہم کو یہاں تک نہیں پہنچایا ہے، فرقہ بندی، افتراق، باہمی دل شکستگی، رجوع الی اللہ کی کمی، احکامِ الٰہی کے ساتھ بے نیازی اور دین سے بے تعلقی نے تو ہم کو اس صورتِ حال سے دوچار نہیں کیا ہے؟

غرض مؤمن کی نگاہ ہر حال میں خدا کی طرف ہونی چاہئے، نہ فتح مندی اسے مغرور کرے، نہ ظاہری شکست مایوس وپست ہمت۔

بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

(۶/مارچ ۱۹۹۸ء)

بیسویں صدی کا سبق

بیسویں صدی گذر چکی ہے اور ہم لوگ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں، زندہ قوموں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ماضی سے سبق لیتی ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کا نقشہ تیار کرتی ہیں، اسی لئے قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی قوموں کے کتنے ہی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان واقعات میں عبرت وموعظت کے جو پہلو ہیں، انہیں نمایاں فرمایا گیا ہے، تاکہ اگلی قومیں اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور اس چراغ کی روشنی میں اپنا سفر طے کریں۔ پس امتِ مسلمہ کا یہ طریقہ ہونا چاہئے کہ ماضی سے سرسری طور پر نہ گذر جائے، بلکہ اس کا جائزہ لے، خود اپنا احتساب کرے اور اس کی روشنی میں مستقبل کے لئے لائحۂ عمل طے کرے۔ اس لئے ہمیں بھی گذری ہوئی صدی کا جائزہ لینا چاہئے اور اس کو اپنے لئے آئینہ بنا کر اپنے اجتماعی چہرہ کو سنوارنا اور آراستہ کرنا چاہئے۔

اس صدی میں متعدد ایسے حادثات ہوئے ہیں، بلکہ پیہم ہوتے رہے ہیں جنہوں نے بار بار دردمند دلوں کو بے چین اور آنکھوں کو اشکبار کیا ہے اور امت پر ایسے ایسے طوفان آئے ہیں کہ بہت سی قومیں اس سے معمولی واقعات پیش آنے پر بکھر کر رہ گئیں اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا، لیکن ان میں سے تین واقعات ایسے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جو ہمیشہ مسلمانوں کو بے سکون اور مضطرب رکھیں گے۔ ان میں پہلا واقعہ خلافتِ عثمانیہ ترکی کے سقوط کا ہے، جو ۱۹۲۳ء میں پیش آیا۔ خلافتِ عثمانیہ اخیر زمانہ میں گو اثر ونفوذ کھو چکی تھی اور شوکت وشکوہ سے محروم ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور عالم اسلام کی وحدت کی ایک علامت تھی، چنانچہ افریقہ سے لے کر ہندوستان تک جمعہ کے خطبوں میں خلیفۂ عثمانی کا نام لیا جاتا تھا، دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے،

ایوانِ خلافت کی طرف لوگوں کی نگاہ اٹھتی تھی اور گو ترکی کو یورپ کا ''مردِ بیمار'' کہا جاتا تھا، لیکن اس کی صدائے حق مغرب اور مشرق کے ایوانہائے حکومت کو متأثر کئے بغیر نہ رہتی تھی، مغربی دنیا کو صلیبی جنگوں میں عالمِ اسلام سے جو پے بہ پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں اور ہزار سازشوں کے باوجود وہ خلافتِ اسلامیہ کے تار و پود بکھیرنے سے قاصر رہے، اس چیز نے ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ جب تک خلافت کی قبا چاک نہ ہوگی اور مسلمانوں کی اجتماعیت اور وحدت کا یہ علامتی ادارہ ختم نہ ہو جائے گا، عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کرنا، ان کو اپنی مرضیات کے تابع کرنا، اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنانا اور ان کی ہمتوں کو پست کرنا ممکن نہیں، چنانچہ ایک زبردست سازش کے نتیجہ میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے عالمِ اسلام میں قومیت اور وطنیت کے فتنہ کو نہایت ہی قوت کے ساتھ ابھارا گیا، عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا گیا اور خود عالمِ عرب میں بھی مختلف علاقوں میں علیحدہ قومیت کے نعرے لگائے گئے، ادھر جنگِ عظیم میں جرمن اور اس کے اتحادیوں کی شکست نے ترکوں کو بے وزن کر ہی دیا تھا، عربوں کو ترکوں کے خلاف کھڑا کر کے خود ترکوں میں بھی اپنی قومی عظمت کا صور پھونکا گیا اور اس طرح خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کا سقوط ہوا اور پورا عالمِ اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔

سقوطِ خلافت کے پیچھے خاص طور پر یہودی سازش کار فرما تھی، اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے یہ افسوس ناک حقیقت کافی ہے کہ جس یہودی نمائندہ نے آخری عثمانی خلیفہ سے بیت المقدس اور فلسطین میں یہودیوں کے زمین خریدنے کی اجازت مانگی تھی اور کہا تھا کہ اگر خلیفہ اس درخواست کو قبول کرلیں تو قرضوں سے دبی ہوئی خلافت کے پورے قرضے یہودی ادا کردیں گے، وہی یہودی مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے الغاءِ خلافت کا پروانہ لے کر خلیفہ عبد المجید کے پاس گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس گہری سازش اور دور رس گھیرا بندی کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کا چراغ بجھایا گیا اور عالمِ اسلام کو فوجی اعتبار سے بے اثر کرنے کے لئے ایسی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا جو کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز و قاصر رہے، پھر چوں کہ عالمِ اسلام کے اکثر حصہ

پر مغرب کی استعماری طاقتیں براجمان تھیں، اس لئے ان ملکوں کو آزاد کرتے ہوئے ان چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے درمیان بھی سرحدی جھگڑے برقرار رکھے گئے، تاکہ یہ کبھی اپنی باہمی آویزشوں سے آزاد نہ ہونے پائیں اور ہمیشہ صلیبی اور صیہونی طاقتوں کا لقمۂ تر بن کر رہیں۔

چنانچہ خلافت کے سقوط کے بعد جلد ہی فلسطین میں اس اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کا صدیوں سے یہودی خواب دیکھتے تھے اور جو ۱۹۴۸ء سے آج تک عالمِ اسلام کے قلب میں ایسا ناسور ہے جس سے امت کا پورا وجود کراہ رہا ہے۔ آخر یہی اسرائیل توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ پر قابض ہوا اور نہ صرف فلسطین بلکہ مصر و اردن اور شام تک کے ایک بہت بڑے علاقہ پر صرف چھ دن کے عرصہ میں بزورِ طاقت قبضہ کرلیا۔ یہ اس صدی کا دوسرا بڑا حادثہ ہے جو مسلمانوں کے لئے المناک بھی ہے اور شرمناک بھی، کہ ایک چھوٹا سا ملک غاصبانہ مسلمانوں کے قبلۂ اوّل پر قابض ہے اور پچاس سے زیادہ عرب اور مسلم ممالک مل کر اس کو بازیاب کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ اگر عوام کا خوف نہ ہو تو بعض عرب قائدین تو مقامِ مقدس کا سودا کرنے کو بھی تیار ہیں۔ اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ اور فلسطینی بھائیوں پر جور و ستم جس قدر افسوس ناک ہے اس سے زیادہ حسرت عالمِ اسلام کی بے بسی، اعداءِ اسلام سے ان کی قربت اور اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت سے ان کی محرومی پر ہوتی ہے۔ صلاح الدین ایوبیؒ سے پہلے جب بیت المقدس صلیبی طاقتوں کے قبضہ میں گیا اور کم و بیش ۹۰ سال مسلمان اپنے اس مقدس مقام سے محروم رہے تو اس وقت امت کا ایک ایک فرد بیت المقدس کے حصول کے لئے بے چین تھا اور سلاطینِ اسلام سمجھتے تھے کہ صرف یہی ان کا مقصدِ وجود ہے، لیکن آج اسلامی ممالک اس معاملہ میں اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ گویا کوئی اہم واقعہ ہی نہیں، اور اگر بعض مسلم حکمرانوں کو اپنی عوام کے احتجاج کا اندیشہ نہ ہو تو شاید وہ طشت میں سجا کر اس مقامِ مقدس کو اسرائیل کے حوالے کردیں، حیرت اس بے حیائی پر ہوتی ہے کہ بعض مسلم ممالک نے ایسی غاصب یہودی قوت کے ساتھ اپنے تجارتی اور دفاعی معاہدات

بھی قائم رکھے ہیں۔

تیسرا بڑا حادثہ وہ ہے جو ۶ / دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں پیش آیا۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے پہلے کوئی مسجد شہید نہ کی گئی ہو، خاص کر ہندو پاک کی تقسیم کے وقت کتنی ہی مسجدیں ہیں جن پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا، لیکن بابری مسجد کی نوعیت ان سب سے الگ ہے، بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے ایک ایسی تاریخ گھڑی گئی جس کے لئے کوئی سند نہیں، پھر اسے بت خانہ میں تبدیل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بند مہم چھیڑی گئی، فرقہ پرستی کی آگ بھڑکائی گئی اور شہر شہر، قریہ قریہ، فرقہ پرست طاقتوں نے اس موضوع کو ہر عام و خاص کے ذہن میں داخل کیا اور پھر علی الاعلان مجمع عام میں پہلے سے دی گئی تاریخ پر مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور اللہ کے گھر کو بت خانہ میں تبدیل کردیا گیا، یہ صرف ایک مسجد کی شہادت نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد پورے اعلان و اظہار کے ساتھ شعائرِ اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر تھی، جس کے ذریعہ پوری دنیا میں امتِ مسلمہ کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ایک مجبور و مقہور قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہیں، اسلامی ممالک کی اس واقعہ پر خاموشی اور بہت سے ممالک کے ردعمل کے اظہار سے بھی گریز نے اس بات کو صاف ظاہر کردیا کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کے ساتھ کتنا بڑا واقعہ بھی پیش آئے، عالمِ اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں، بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں یہ واقعہ اسرائیل کے اگلے منصوبہ کے لئے آزمائش نہ ہو۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ بھی اصل میں اسی یہودی ذہن کی غماز ہے جو اسرائیل کے وجود کے پیچھے کارفرما ہے، یہودی اور برہمن دو ایسی قومیں ہیں جو اپنی نسلی برتری کی دعویدار ہیں اور یہ قومی تفاخر کا جذبہ محض سماجی رسم و رواج کے درجہ میں ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے عقیدہ و ایمان کا حصہ ہے، چنانچہ ہندوستان میں جب نچلی ذات کے لوگ کھڑے ہونے لگے اور انہوں نے برہمنوں کو چیلنج کیا، تو ہندوستان کی برہمن طاقت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو اٹھایا، تاکہ یہ نئی تحریک دب جائے اور فرقہ وارانہ منافرت اپنے شباب کو پہنچ

جائے، یہاں تک کہ برہمن فکر کی نمائندہ فرقہ پرست تنظیمیں بامِ اقتدار پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں، جیسے یہودی مغرب کی معیشت اور ذرائع ابلاغ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں اور کلیدی عہدے پر متمکن ہیں، اسی طرح ہندوستان میں برہمنوں نے ملک کی معیشت اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اسی لئے اقتدار کے تمام کلیدی عہدوں پر ان کا قبضہ ہے، ہندوستان اور اسرائیل کی قربت نے ان دونوں ہم فکر قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، ان کی قوت کو توڑنے اور انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی تدبیروں اور سازشوں میں دونوں دوش بدوش ہیں۔

غور کیا جائے تو مسلمانوں کی اس پسپائی اور وقتی ہزیمت کے اسباب میں سے دو نہایت اہم سبب ہیں: ایک مسلمانوں کا باہمی اختلاف، دوسرے مسلمانوں اور عالمِ اسلام کے دشمنوں اور کھلے ہوئے مخالفوں کے ساتھ مسلمانوں کے ایک طبقہ کی دوستی اور قربت۔

عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک جہاں کہیں مسلمانوں نے نقصان اٹھایا ہے، بنیادی طور پر اس کا سبب باہمی اختلاف وانتشار ہے۔ عالمِ اسلام پر جتنی بڑی بڑی آفتیں آئی ہیں، وہ سب اسی اختلاف کی دین ہیں، تاتاریوں کا فتنہ کیوں کر داخل ہوا اور کس طرح اس نے دار الخلافہ بغداد تک کی اینٹ سے اینٹ بجادی؟ اسپین سے مسلمانوں کو آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد پھر کیوں رختِ سفر باندھنا پڑا؟ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں مغربی قومیں کیوں کر فتح یاب ہوئیں؟ عالمِ اسلام کے قلب میں اسرائیل کا وجود کیسے پنپ سکا؟ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سورج کیوں اور کب غروب ہوا؟ تاریخ کے صحیفہ میں اس طرح کے جتنے واقعات موجود ہیں ان سب کے بارے میں سوال کر لیجئے اور تاریخ کی عدالت سے اس کا جواب پوچھئے تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلاف نے ان کی قوت کو پاش پاش کیا، ان کے دشمنوں کی جرأتیں بڑھائیں اور پھر فتح مندی اور ظفر مندی نے ان سے ایسا منہ موڑا کہ گویا اس قوم کی قسمت میں یہ چیز آئی ہی نہ ہو۔

یہ امت کے ترقی وتنزل اور فتح وشکست کے اس الٰہی قانون کے عین مطابق ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے:

''وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْھَبَ رِیْحُکُمْ ۔'' (انفال:۴۶)

''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔''

یعنی مسلمانوں کے اختلاف وانتشار کے ساتھ ان کی پسپائی اور ہوا خیزی اللہ کی طرف سے مقدر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا قانون بدل نہیں سکتا۔

دوسرا سبب مسلمانوں کی اعداءِ اسلام کے ساتھ قربت، یہاں تک کہ رازدارانہ معاملات میں بھی ان پر اعتماد واعتبار ہے۔ قرآن میں کتنے ہی مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیونکہ وہ تم کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور ہمیشہ تمہاری تکلیف اور مشقت کے آرزومند رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ''بطانۃ'' (آل عمران:۱۱۸) کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ''بطانہ'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اندورنی حالات اور رازہائے دروں سے واقف ہو۔ آج عالمِ اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی فوجی تنصیبات اعداءِ اسلام کے ہاتھوں میں ہے، ملک کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی ان کے حوالے ہے۔ یہ بات کس قدر حیرت ناک ہے کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر کے متعدد کمانڈر وہ تھے جن کی بیویاں یہودی تھیں اور اس لئے جنگ کی تمام تدبیریں اسرائیل کے سامنے اس طرح تھیں جیسے کوئی شخص آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا ہو۔ آج بھی بڑے بڑے عرب فرمانرواؤں کے نکاح میں اسرائیل اور یہودی عورتیں ہیں، خود ہندوستان میں ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو لوگ علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں اور جن جماعتوں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کو اپنا منشاء ومقصود بنا رکھا ہے، ان کو بھی مسلمان ہم نوا اور مسلمان دوست مل جاتے ہیں۔ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں یہودی اور عیسائی ایک ہی ہیں، ان میں کوئی فرق

نہیں ، کیوں کہ مسلمانوں کے مقابلہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور ہم نوا ہیں ، لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (المائدۃ :۵۱) اور جو فطرت یہودیوں کی ہے وہی مشرکین کی ہے، اسی لئے مسلمانوں کی عداوت میں قرآن نے دونوں کو ہم پلہ قرار دیا ہے۔

یہی افتراق اور اسلام دشمنوں کے ساتھ دوستی (موالات) ہے، جس نے اس صدی میں عالمِ اسلام اور امتِ مسلمہ کو قدم قدم پر نقصان پہونچایا اور ذلت ونکبت سے دو چار کیا ہے اور ضرورت ہے کہ اب مسلمان اس عالمی سازش کو سمجھیں ، اپنے آپ کو انتشار سے بچائیں ،خوش تدبیری کا راستہ اختیار کریں اور ان عناصر سے اپنے آپ کو دور رکھیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار ہیں، کہ یہ چیز ہمیں کمزور بھی کرتی ہے اور اللہ کی مدد سے محروم بھی رکھتی ہے! جہاں گذرنے والی صدی نے زخم اور کسک کے نقوش امت کو دیئے ہیں وہیں اس صدی کے بعض ایسے خوش آئند اور خوش گوار پہلو بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی صدی ہے کہ یہودی ،عیسائی اور کمیونسٹ جو قریب قریب پوری دنیا پر بلا واسطہ یا بالواسطہ حکومت کررہے تھے ،انہوں نے اسلام کو مٹانے ،مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے ،ان میں احساسِ کمتری اور فکری تشکیک پیدا کرنے اور انہیں اپنے اندر جذب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ،ترغیب وتحریص کے وسائل بھی اختیار کئے گئے ،علمی اور فکری یلغاریں بھی ہوئیں ،سازشوں کے نوع بنوع جال بھی بنے گئے ،جور وستم بھی ایک سے بڑھ کر ایک روا رکھا گیا اور سارے حربے مسلمانوں پر آزمائے گئے ، غالباً دشمنانِ اسلام کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہیں تھا جو اسلام اور مسلمانوں پر پھینکا نہ گیا ہو، لیکن اس کے باوجود نہ وہ مسلمانوں کے قدم کو متزلزل کر سکے اور نہ اسلام کی محبت کی جو تخم ان کے دلوں میں ہے وہ اسے اکھاڑنے میں کامیاب ہوئے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی بیداری اور اسلامی حمیت میں اضافہ ہی ہوا، جتنا انہیں دبایا گیا وہ اتنے ہی اونچے اٹھے اور جتنا انہیں تپایا گیا اسی قدر ان کے حوصلہ وہمت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اہل یورپ سمجھتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا چل چلاؤ ہے اور

کچھ ہی عرصہ میں وہ اسلام کے خلاف عداوت اور نفرت وانتقام کی جو آگ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں، کی پیاس بجھ جائے گی، لیکن یقیناً وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکے، شاید انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کو عیسائیت اور دوسری قوموں پر قیاس کیا، کہ جیسے عیسائیوں نے مظالم سے بچنے کے لئے ایک ایسے مذہبی تصور کو قبول کرلیا جو یونان کی قدیم بت پرستی سے ہم آہنگ تھی اور اصل عیسائیت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی، اور جیسے ہندوستان میں برہمنوں کے جور وستم سے عاجز اور ان کی سازشوں کا شکار ہوکر مختلف مذہبی اکائیوں نے ہندو مذہب اور ہندو سماج میں جذب ہوجانے کو گوارا کرلیا، اسی طرح جب خلافت کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت بکھر کر رہ جائے گی اور وہ فوجی اور عسکری طاقت کے اعتبار سے اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ شکست خوردہ ہوجائیں گے، نیز مغرب کی طرف سے اسلامی عقیدہ سے لے کر شریعتِ اسلامی کے ماخذ، اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین پر فکری یورشیں منصوبہ کے ساتھ کی جائیں گی تو بالآخر مسلمان وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوں گے جو ان دوسری مظلوم ومقہور قوموں نے کیا ہے۔

لیکن سخت ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں نے جس استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، وہ بھی ایک مثال ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے روشن مثال ماضی قریب میں بوسنیا، کوسووا اور چیچنیا کی ہے۔ مغرب جو اپنے آپ کو تہذیب کا علمبردار کہتا ہے، اس نے یورپ کے قلب میں جیسی انسانیت سوز حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے اور ظلم وستم کے بازار گرم کئے ہیں، شاید درندے بھی ان کو دیکھ کر عرق آلود ہوگئے ہوں اور شیطان نے بھی ان کا لوہا مان لیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام، عصمت دری اور عزت ریزی کے اجتماعی مراکز کا قیام، اور نہ جانے کیسی کیسی شرمناک اور ہولناک حرکتیں کہ جن کا تصور کرکے بھی کلیجہ منہ کو آئے اور یہ سب کچھ مغربی طاقتوں نے باہمی یگانگت کے ساتھ کیا ہے اور کوئی قوم ہوتی تو یقیناً سرِ تسلیم خم کردیتی اور اپنے دین ومذہب کا سودا کرچکی ہوتی لیکن قربان جایئے اس علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں پر، جو مدتوں سے کمیونسٹ حکومتوں کے زیرِ اقتدار رہنے کے باوجود اپنے سینوں میں ایمان کا آتش فشاں چھپائے بیٹھے تھے،

جنہیں جور وستم کا سمندر بھی بجھا نہ سکا اور آخر ایسے نہتے وسائل سے محروم قوم نے ہر طرف سے تعاون اور مدد کے راستے منقطع ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے ایمان کو باقی رکھا بلکہ بوسنیا اور کوسووو تو اپنے سیاسی وجود کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور چیچنیا کو گو روس نے جبر و تشدد کے ذریعہ حاصل کرلیا ہے لیکن مجاہدین کی جرأت فرزانہ نے آج بھی ان کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اگر کوئی ایسی تاریخ مرتب کی جائے جس میں اپنے مذہب اور اپنے دین کے بقاء کے لئے پیش کی جانے والی قربانیوں کی داستان رقم کی جائے تو یقیناً یہ اس کے زریں ابواب ہوں گے۔

روس میں کمیونزم کے ستر سالہ جابرانہ اقتدار کے بعد پھر اس کے بطن سے پانچ مسلمان ملکوں کا ظہور اور ان میں اپنے اسلامی اور مذہبی تشخص کا شعور خود ایک ایسا واقعہ ہے جس کو اس صدی کا معجزہ کہا جاسکتا ہے اور جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک ایسی طاقت ہے کہ نہ کوئی آگ اسے جلا سکتی ہے اور نہ کوئی طوفان اسے نابود کرسکتا ہے، اس کی جڑیں اہلِ ایمان کے قلوب میں اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں اکھاڑا جانا ممکن نہیں۔ اسلام کی فتح و کامیابی اور نصرت و ظفرمندی کی سب سے بڑی اور روشن مثال نہایت ہی ذلت و حقارت کے ساتھ افغانستان سے روس جیسی سپر طاقت کا ناکام اور نامراد واپس ہونا ہے۔

اسلام دشمن طاقتیں یہ سمجھتی تھیں کہ مسلمانوں کو سیم وزر سے خریدنا اور دنیا کی متاعِ حقیر کے ذریعہ ان سے دین و ایمان کا سودا کرنا تو ممکن نہیں، لیکن شاید جبر و استبداد کے ذریعہ ان کے مذہبی جذبات کو کچلا جاسکتا ہے، لیکن ان کا یہ اندازہ غلط ہی ثابت ہوگا۔ جس شخص نے اسلامی تاریخ پڑھی ہے اور کم سے کم فتنۂ تاتار کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آگ کے سمندر سے گذر کر بھی اپنی متاعِ ایمان کو بچایا اور اسلام اور پیغمبر اسلام سے تعلق پر اپنی جان و مال اور اپنے اقارب و اولاد کو اس طرح نثار کیا ہے جیسے کوئی شخص کسی پودے کو تناور کرنے کے لئے بے قیمت اور مفت کا پانی اس کی جڑوں میں ڈالتا ہے۔

فتنۂ تاتار کے موقع سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ماوراء النہر، خراسان اور عراق کا علاقہ خون کے سمندر میں تبدیل ہوگیا، کتنے ہی شہر لاشوں کے ڈھیر میں بدل گئے، بخارا کے قلعہ میں تیس ہزار اور شہر میں ستر ہزار، نیز سمرقند میں ایک لاکھ مرد، عورت اور بچے تہہ تیغ کردیئے گئے، خوارزم میں ایک لاکھ افراد کو قیدی بنالیا گیا اور پھر انہیں زندہ نذرِ آتش کردیا گیا، یہ ان تین لاکھ لوگوں کے علاوہ ہیں جو وہیں قتل کردیئے گئے، خراسان اور مرو میں تیرہ لاکھ مرد، عورت اور بچے ذبح کردیئے گئے، نیشاپور جوان شہروں میں تھا، جسے اسلامی تہذیب وثقافت میں ایک خاص مقام حاصل تھا، وہاں عورتوں اور بچوں کے علاوہ دس لاکھ چالیس ہزار صرف مرد قتل کیے گئے، ہرات ایک بہت ہی آباد علاقہ تھا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہاں سولہ لاکھ مسلمان قتل کیے گئے اور صرف پندرہ آدمی باقی رہ گئے، بغداد کا تو ذکر ہی کیا، کہ تین دنوں تک بغداد کے گلی کوچوں میں پانی کے بجائے خون بہتا رہا اور دجلہ کا پانی میلوں تک سرخ ہوگیا، چھ ہفتوں تک مسلسل قتل عام کا سلسلہ رہا، مدارس میں طلبہ اور اساتذہ کو ذبح کیا گیا، قبریں اکھیڑ دی گئیں اور بڑے بڑے کتب خانے ایسے جلائے گئے کہ مہینوں ان سے دھواں اٹھتا رہا، غرض کہ تاتاری ایسی قہر سامانی کے ساتھ عالمِ اسلام پر ٹوٹ پڑے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی کہ لگتا تھا کہ واقعی اب دنیا میں اس قوم کا آخری دن ہے، ۱۲۱۸ء سے ۱۲۶۰ء تک ۴۲ سال عالمِ اسلام پر ایسی قیامت ٹوٹتی رہی کہ مؤرخین کا قلم یہاں پہنچ کر خون کے آنسو بہاتا ہے اور شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے کہ اس واقعہ پر آسمان خون برساتا تو حق بجانب ہوتا۔

''آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں''

لیکن ایسی قیامت کے باوجود بحمد اللہ مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کو متاثر نہیں کیا جاسکا، ایک طرف اسلام کی کشش نے خود تاتاریوں کو دامنِ اسلام سے باندھ دیا اور زمینوں کی فاتح قوم دلوں کی مفتوح ہوکر خود اسلام کی محافظ بن کر کھڑی ہوئی جب ۱۲۵۶ء میں چنگیز خاں کا پرپوتا دامنِ اسلام میں آگیا اور دوسری طرف مسلمانوں نے اپنی اجتماعیت کو بچانے کے لئے خلیفہ معتصم باللہ کی شہادت کے بعد دو سالوں کے اندر عباسی خاندان

کے ایک زندہ بچ جانے والے شخص ابوالقاسم احمد کو مستنصر باللہ نام سے خلیفہ تسلیم کرلیا اور سب سے پہلے سلطان بیبرس نے خود خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یقیناً بیسویں صدی میں بھی بہت سے طوفانوں سے گذرنے کے باوجود مسلمانوں نے اسلام سے اپنی اٹوٹ وابستگی کو برقرار رکھا ہے اور اپنے ایمان کی حفاظت کو ہر قربانی پر ترجیح دی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ان میں تین باتیں زیادہ اہم ہیں: اول پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے امت کی والہانہ محبت اور آپ ﷺ کی حرمت پر ہر قربانی کا ان کی نگاہ میں آسان بلکہ سامانِ سعادت ہونا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی جو دین کے بارے میں بہت زیادہ شعور نہیں رکھتے، اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں، شریعت کے بہت سے احکام ان کی زندگیوں میں نہیں ہیں، یہاں تک کہ بنیادی فرائض اور ارکان کی توفیق سے بھی محروم ہیں، برائیوں اور گناہوں نے ان کے پورے وجود کو اپنا اسیر بنالیا ہے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی چاہت سے ان کے قلوب معمور ہیں، آپ ﷺ کا نام نامی آتے ہی چشم عقیدت جھک جاتی ہے، آپ ﷺ کے ذکر گرامی پر ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں، اس کے کان ایسی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے جس سے ذرا بھی آپ ﷺ کی بے احترامی کی بو آئے، اس کی زبان ہر معاملہ میں بدل جائے، لیکن اپنے نبی ﷺ کے ذکر میں محبت واحترام کا وضو کر کے ہی کچھ کہتی اور بولتی ہے، یہ حب رسول اللہ ﷺ جو ایمان کی بنیادوں میں سے ایک ہے، جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا اور جو صحابہؓ سے نسل در نسل مسلمانوں کو میراث میں ملی ہے، اس محبت نے عام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، اسلام اور شریعتِ اسلامی اور سنتِ رسول ﷺ سے ان کی وابستگی اور اسلام کے لئے مر مٹنے اور سب کچھ نثار کر دینے کے جذبہ کی برقراری میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اسی لئے مغربی مصنفین اور یہودی اور عیسائی مستشرقین نے سب سے زیادہ سیرتِ محمدی ﷺ ہی کو اپنا نشانہ بنایا ہے اور آپ ﷺ کے تقدس اور صداقت کو مشکوک کرنے کی بہت ہی منصوبہ بند اور غیر محسوس کوششیں کی ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی انتہاء محبت اور آپ ﷺ کے نام پر مر مٹنے کا بے

پناہ جذبہ مسلمانوں کی ایک خداداد میراث ہے جو آپ ﷺ کے جلیل القدر رفقاء اور صحابہؓ سے آج تک مسلمانوں میں چلی آتی ہے اور انشاء اللہ قیامت تک باقی رہے گی اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ محبت اور عشق وشیفتگی کے اس جذباتی عنصر کو اپنی اگلی نسلوں تک مسلسل پہنچاتے رہیں، ان کے ساتھ آج ان کا دوستانہ ہیں، ہندوؤں میں کتنے ہی لوگ ہیں جو علی الاعلان دیویوں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن یہودی، عیسائی یا ہندو سماج میں اس سے کوئی ردعمل نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ اپنے پیشواؤں کے تئیں محبت واحترام کا وہ اتھاہ جذبہ ان کے اندر موجود نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ودیعت کیا ہے اور جو ہمارے لئے ایمان کی حفاظت کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔

دوسرا اہم سبب من جانب اللہ اس امت میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتوں اور تحریکوں کا تسلسل ہے، چوں کہ سلسلۂ نبوت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ امت اصحابِ خیر مصلحین اور اصلاحی وتجدیدی تحریکوں سے خالی رہی ہو، دوسری قوموں میں ایسی تحریکیں تو موجود ہیں جو ان میں قومی نخوت پیدا کریں، جو ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کریں اور جو ان کو دوسری قوموں سے پنجہ آزمائی پر اکساتی رہیں، لیکن ایسی مثبت تحریکیں جو محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے لوگوں کو اس مذہب پر قائم رکھنے کی جدوجہد کرے جسے وہ حق سمجھتے ہوں اور جس کا مقصد ہی دین کو آمیزشوں سے بچانا اور مخلوق کو خالق سے جوڑنا ہو، موجود نہیں۔

یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس امت میں ہر عہد میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور وہ دین کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا کام سرانجام دیں گی، چنانچہ اس صدی میں سنوسی تحریک، سید احمد شہیدؒ کی تحریک، عالمِ عرب میں الاخوان المسلمون، ہندوستان میں مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تحریک امارت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریکِ اسلامی وغیرہ ایسی تحریکات ہیں جن سے یہ تو ممکن ہے کہ بعض افکار اور نقاطِ نظر میں اختلاف کیا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد

ایسے مخلصین کی ہے جن کا مقصد خالصتاً لوجہ اللہ، اللہ کے دین کی حفاظت واشاعت اور اس کی سربلندی ہے اور غالباً ان تمام تحریکات سے زیادہ خاص کر ہندوستان میں جس تحریک نے اثر ڈالا ہے وہ دینی مدارس کی تحریک ہے، جسے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء نے اٹھایا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دار العلوم دیوبند، مولانا شاہ انوار اللہ صاحبؒ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی، مرزا حاجی منور علی صاحب نے دربھنگہ (بہار) میں مدرسہ امدادیہ کی اور آپ ﷺ کے مختلف متوسلین نے مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں سے چھوٹی بڑی درسگاہوں کی بنیاد رکھی۔

یہ ان تحریکات ہی کا اثر ہے جس نے نہ صرف بوڑھوں بلکہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسلام سے قریب کیا، جن کی کوششوں سے مسجدیں آباد ہیں اور جن کی مساعی سے اسلامی شعائر زندہ ہیں، بلکہ بعض غیر مسلم ممالک میں بہ مقابلہ مسلم ملکوں کے دینی بیداری اور ایمانی حمیت کے مظاہر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنی سیاسی، تعلیمی اور معاشی مساعی کے ساتھ ساتھ خالص مذہبی اور دینی، اصلاحی کوششوں سے اپنے آپ کو مربوط رکھیں، کہ اس کی وجہ سے ان کے ایمان کو ایک نئی تازگی اور ان کے دینی رجحان کو ایک نئی توانائی حاصل ہوتی رہے گی۔

تیسرا اہم سبب روحِ جہاد کی از سرِ نو بیداری ہے، دوسری جنگ عظیم، خلافتِ عثمانیہ کے سقوط اور عالمِ اسلام کی پسپائی کے بعد ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کی ڈکشنری سے جہاد اور باطل سے پنجہ آزمائی کا لفظ ہی نکل گیا ہے، اگر مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار ہوتی، اللہ کے لئے جاں نثاری ان کا مطمحِ نظر ہوتا اور آرزوئے شہادت ان کو تڑپاتی رہتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایک چھوٹا سا ملک مسلمانوں سے ان کا قبلۂ اوّل چھین لے، دنیا کی قومیں پیشہ ورانہ بنیادوں پر جنگ کرتی ہیں، جس کا مقصد ملک گیری اور کشور کشائی ہے، تنخواہوں اور معاشی سہولتوں کی لالچ میں سپاہی اپنی جان ہتھیلی پر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جہاد ایسے فاسد جذبہ اور فاسد مقصد کے تحت کی جانے والی لڑائی نہیں ہے، جہاد یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور شہادت کی آرزو کے ساتھ باطل کا مقابلہ اور اسلام کی سربلندی کے

لئے ایک سپاہی اپنا قدم آگے بڑھائے، اس کا مقصود مظلوموں کی مدد اور اللہ کے دین کی حفاظت ہو، نہ کہ ملک وعلاقہ کی فتح اور سیم وزر کا حصول اور دوسری قوموں پر ظلم وجور، جہاد کا مطمح نظر اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے، اس لئے اس راہ میں ناکامی کے لئے کوئی جگہ نہیں، کہ اس میں جیتنے والا بھی فتح مند ہے اور بظاہر ہارنے والا بھی، بلکہ بعض اوقات پانے والے سے زیادہ کامیاب کھونے والا ہے، یہ جذبۂ جہاد امت میں ایمانی حمیت کو باقی رکھتا اور اسلامی اخوت کو پروان چڑھاتا ہے، دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر خنجر چلے اور دوسرے کونہ میں رہنے والا مسلمان تڑپ اٹھے، رسول اللہ ﷺ نے اس امت کی سربلندی اور عزت کو جہاد سے متعلق بتایا ہے، چنانچہ اس بات کی خاص طور پر کوشش کی گئی کہ مسلمانوں سے مجاہدانہ اسپرٹ ختم کردی جائے اور اس لفظ کو اتنا بدنام کردیا جائے کہ دوسرے تو دوسرے اپنے بھی اس کو بولنے اور لکھنے سے گھبرائیں۔

افغانستان میں غاصب روسیوں کے خلاف افغانوں کی تحریک جہاد نے امت کو دوبارہ جہاد سے لذت آشنا کیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے غیبی نصرت ومدد کے ایسے نظارے دیکھے کہ جسے وہ صرف تاریخ میں پڑھتے تھے، اور ان پر مشکل سے یقین کرتے تھے، ایک ایسی قوم جس کے پاس نہ ہتھیار تھے نہ کوئی تربیت یافتہ فوج تھی، نہ افرادی قوت کے اعتبار سے دنیا کی بڑی قوموں میں ان کا شمار تھا، نہ بین الاقوامی سطح پر ان کی کوئی ساکھ تھی اور انہوں نے ایسی ایسی طاقت کا مقابلہ کیا جو اسلحہ کے اعتبار سے دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک اور فوج کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور جس کے بین الاقوامی اثر ورسوخ کا حال یہ ہے کہ اسے اقوامِ متحدہ میں ''ویٹو'' کا حق حاصل تھا، نیز ایشاء، یورپ بلکہ جنوبی امریکہ میں بھی کتنی ہی حکومتیں اس کے چشم وابرو کے اشارہ پر عمل کرتی تھیں اور شکست ونامرادی کا لفظ کئی دہائیوں سے اس کی تاریخ میں کہیں نہیں آیا تھا، اس کے باوجود اس بے سروسامان قافلہ نے اتنی بڑی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔

اس نے پوری دنیا میں مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، ایک نئی ہمت اور طاقت عطا

کی، اللہ کی نصرت پر اس کا یقین بڑھا، بڑی طاقتوں سے مرعوبیت ان کے دلوں سے نکلی اور ظالموں اور حقیقی دہشت گردوں کے خلاف پوری دنیا میں جہاد کی ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، بوسنیا ہو یا کوسوو، چیچنیا ہو یا تاجکستان، فلسطین کا انتفاضہ ہو یا فلپائن کا جنوبی علاقہ، برما کے مظلوم مسلمان ہوں یا جنوبی سوڈان کے، ہر جگہ مسلمانوں میں صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نیا حوصلہ پیدا ہوا اور یہی حوصلہ ہے جس نے آج مشرق و مغرب کو لرزہ براندام کر رکھا ہے کہ وہ کتنی بھی جالیں بن لیتے ہیں مگر بالآخر وہ تارِ عنکبوت ہی ثابت ہوتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کی ایمانی حمیت میں اضافہ کیا ہے اور خاص کر جدید تعلیم یافتہ نئی نسل میں ایک نئی اُمنگ پیدا کی ہے، یہ بات کچھ بہت پہلے کی نہیں کہ ہماری مسجدیں صرف چند بوڑھے اور ضعیف لوگوں سے آباد ہوتی تھیں، لیکن آج ہماری مسجدیں نوجوانوں سے آباد ہیں، دو دہے پہلے مسلمانوں میں ڈاڑھی رکھنے اور اسلامی لباس اور وضع قطع کو اختیار کرنے سے ایک طرح کا گریز پایا جاتا تھا، لیکن آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ایسے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں ایک عام آدمی کو مدرسہ کا طالب علم ہونے کا گمان ہوتا ہے، مساجد و مدارس اور دینی کاموں کے لئے مسلمان بہت کم خرچ کرتے تھے، لیکن آج مسلمانوں میں اپنے مذہبی ورثہ کی حفاظت کا نہایت ہی خوش آئند رجحان پیدا ہوا ہے، غرض طلبہ اور تجار سے لے کر عام مسلمانوں تک میں مذہبی وابستگی کے جذبات بڑھے ہیں۔ اس کیفیت کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

غرض کہ جہاں ہم نے اس صدی میں کھویا ہے وہیں پایا بھی ہے اور جہاں ہم پیچھے ہٹے ہیں، وہیں ہم نے اپنے قدم آگے بھی بڑھائے ہیں، جہاں یہ صدی ہماری بے عملی اور کوتاہیوں پر خندہ زن ہے وہیں اس امت کی استقامت و ثابت قدمی، دین پر مر مٹنے کی اتھاہ جذبات، اسلام سے بہ ہر قیمت اپنی وابستگی کو برقرار رکھنے اور ظلم کے طوفان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے آشیانہ کی بہر صورت حفاظت کرنے اور اس کے

لئے سب کچھ مٹا اور گنوا دینے پر گواہ بھی ہے۔ خدا کرے کہ اکیسویں صدی اسلام، عالمِ اسلام اور امت اسلامیہ کی فتح و نصرت کی تاریخ رقم کرے اور حق کی سربلندی اور سچائی کی بالا دستی نیز ظلم و جور کی پسپائی اور اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کی ناکامی کی صدی ثابت ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ !

(۱۹،۱۲ / جنوری / ۲۰۰۱ء)

اپنی تاریخ کو بچایئے!

ہندوستان میں مسلمان اس وقت جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ بڑے صبر آزما اور تشویش ناک ہیں، یہ بات یقیناً بہت خوشگوار اور خوش آئند ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی جو شدت پہلے محسوس کی جاتی تھی، اب اس میں کمی آئی ہے، اور اس اعتبار سے بظاہر امن و امان کی فضا قائم ہو رہی ہے، ان حالات کو دیکھ کر بعض لوگ جو قومی اور ملی مسائل پر سطحی انداز سے سوچنے کا مزاج رکھتے ہیں، ایک گونہ مطمئن بھی ہیں، لیکن حقیقت بیں نگاہیں اس سے آگے دیکھ رہی ہیں، اور وہ موجودہ صورت حال کو زیادہ خطرناک اور مستقبل کے اعتبار سے کہیں زیادہ مضرت رساں سمجھتی ہیں۔

اور وہ یہ ہے کہ آر ایس، ایس نے اپنے اصل نظریہ پر کام کرنا شروع کر دیا ہے، فساد کا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمان ذہنی طور پر مرعوب ہو جائیں، اور ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، یہاں تک کہ بالآخر ذہنی طور پر وہ اکثریت کے سامنے سپر انداز ہو جائیں، اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں جذب کر لیا جائے، وہ اپنی شناخت سے محروم ہو جائیں، ان میں احساس کمتری پیدا ہو جائے، اس کے لئے وسیع الاطراف پروگرام بنایا گیا ہے، جواب آہستہ آہستہ بے غبار ہوتا جا رہا ہے، ایک طرف نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں، دوسری طرف ملک اور ملک کی آزادی کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے، تیسری طرف الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ہندو تصورات اور تہذیبی طور طریقوں کو تقویت پہونچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، یہ اتنے خطرناک اقدامات ہیں کہ جن کی سنگینی کا اندازہ مستقبل میں ہی ہو سکے گا، اگر بروقت ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو پھر اس کی تلافی شاید ممکن نہ ہوگی۔

سرکاری تاریخی ادارے انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ نے ملک کی آزادی پر ایک دستاویزی کتاب ''ٹوورڈس دی فریڈم'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کی ہے، جسے ممتاز مورخ پروفیسر کے این پانیکر نے ایڈٹ کیا ہے، حکومت ہند نے نظر ثانی کے نام پر اس کتاب کو شائع ہونے سے روک دیا ہے، حکومت کا مقصد ظاہر ہے کہ اس میں فرقہ پرستانہ مسموم فکر کو داخل کیا جائے، خود پروفیسر ہانیکر نے بھی واضح کیا ہے کہ مرکزی حکومت تاریخ کو توڑ مروڑ کر اس پر ''بھگوا رنگ'' چڑھانے کی کوشش کر رہی ہے، ظاہر ہے اس کا مقصد خاص کر مسلمانوں کو ملک دشمن اور قوم دشمن ثابت کرنا نیز ملک کی آزادی میں ان کے کردار کو غیر مؤثر ثابت کرنا ہے۔

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے، اور باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے حل کی طرف متوجہ ہوں، کسی بھی قوم کے لئے اس کی تاریخ بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی لئے تاریخ کو قوموں کا حافظہ کہا جاتا ہے، تاریخ سے انسان ہمت و حوصلہ حاصل کرتا ہے، تاریخ مایہ عبرت اور اثاثۂ موعظت ہے، ماضی کی تاریخ مستقبل کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہے، جو قومیں تاریخ سے محروم ہوں ان کی مثال بے نسب آدمی کی سی ہے، جو ہمیشہ احساس کمتری سے دوچار رہتا ہے، اور مقابلہ و مقاومت کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، غور کیجئے کہ قرآن مجید ہدایت و موعظت کی کتاب ہے، اور یہی اس کا موضوع ہے، لیکن قرآن کا ایک قابل لحاظ حصہ قصص و واقعات پر مشتمل ہے، اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار آیات واقعات وقصص سے متعلق ہیں، ۲۶ پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقوام اور دعوت حق سے ان کے انکار کا تو بار بار ذکر آیا ہے اور چھ سورتیں تو ایسی ہیں جو خاص انبیاء کے نام پر ہیں، اس کے علاوہ متعدد سورتیں کسی قوم، کسی شخصیت یا کسی اہم واقعہ سے موسوم ہیں، اور وجہ اس کی وہی ہے کہ تاریخ کسی بھی قوم کے لئے سامان حوصلہ بھی ہوتی ہے، سرمایہ عبرت بھی اور نقشِ راہ بھی، اسی لئے قرآن انبیاء اور اقوام کے قصص و واقعات کو نقل کرتے ہوئے عبرت و موعظت کے پہلو کی طرف بھی

اشارہ کرتا جاتا ہے، کبھی کہتا ہے فانظر کیف کان عاقبة المفسدين ،(النمل:۱۴) کبھی کہتا ہے: فانظر کیف کان عاقبة الظالمين :(القصص:۴۰) یعنی دیکھو کہ مفسدین اور ظالمین کا کیا انجام ہوا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہ سامان موعظت ہے، هذا ذكر ،(ص:۴۹) کبھی فرعون کی سرتابی اور اس کا انجام نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ اس میں اہل خشیت کے لئے عبرت ہے، ان في ذلك لعبرة لمن يخشى (النزعات:) اسی طرح احادیث میں انبیاء اور ان کی اقوام نیز عربوں کے ابتدائی حالات سے متعلق اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اس سے تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے یہاں تاریخ اور تذکرہ کا موضوع ہمیشہ سے اصحاب تصنیف کا ایک مقبول اور پرکشش موضوع رہا ہے، اور علم کی دنیا میں تاریخ کے موضوع پر جتنا بڑا سرمایہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے، شاید ہی کوئی اور قوم اس میں اس کی ہمسر ہو، اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ سے لے کر آج تک پوری اسلامی تاریخ روشنی میں ہے، اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ مستحکم اور استوار رکھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، خود ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے جو پُر جوش کردار ادا کیا اس میں بھی مسلم تاریخ نے ایک اہم محرک کی حیثیت سے تقویت پہونچائی ہے، مسلمانوں کا یہ احساس کہ انہوں نے کبھی غلامی کا جوا اپنی گردن پر برداشت نہیں کیا ہے، اور انہوں نے سر جھکانے کے بالمقابل آزمائش اور ابتلاء کے موقعوں پر سر کٹانے کو ترجیح دی ہے، ان کے جوش جنوں میں اضافہ کیا اور تمام تر بے سروسامانی کے باوجود انکو ایک ایسی قوم کے مقابلہ استقامت و پامردی عطا کی کہ جس کی حکومت میں اس وقت کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس لئے کسی قوم کو اس کی تاریخ سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے کی خاندانی شناخت گم ہو جائے، ایسے بچے کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور کسی دوسرے خاندان کے ساتھ ضم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہوتا، اسی طرح جب کوئی قوم اپنی تاریخ سے محروم ہو جائے یا اپنی تاریخ کے بارے میں احساس کمتری کی شکار ہو جائے تو اسے مرعوب کرنا اور

فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریتی اور طاقتور گروہ کے ساتھ جذب کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں، جس کی واضح مثال اس ملک میں دلت ہیں، جو اپنی کثرت تعداد کے باوجود زبردستی ہندو تہذیب میں جذب کر لئے گئے ہیں، اور برہمنوں کے لئے آلۂ کار اور خدمت گار ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ اسی تجربہ کو دوہرانا ہے، مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کی تاریخ مسخ نہیں کی، جن لوگوں سے صدہا برس ان کی جنگیں ہوئیں، جن قوموں کے ساتھ ان کے معرکے ہوئے اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ان کے ساتھ بھی مسلمان مورخین نے کبھی ناانصافی روا نہیں رکھی، اس لئے کہ قرآن مجید کی واضح ہدایت ہے کہ کسی قوم کی برائی، اس کے ساتھ ناانصافی کا جواز فراہم نہیں کرتی: لا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا (المائدہ:) خود ہندوستان پر عرب مورخین اور سیاحوں نے قلم اٹھائے ہیں، جو خامیاں تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، اور خود ہندو مورخین کو ان سماجی کمزوریوں کا اعتراف ہے، اور جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے، ہندوستان کے علم و حکمت، طب و معالجہ کی صلاحیت اور بہادری وغیرہ کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملک جس کو مسلمانوں نے وسعت و وحدت عطا کی، معاشی فراخی دی، امن و امان دیا، عدل و مساوات سے آشنا کیا، سماجی انصاف کی دولت دی، اس کے چپہ چپہ پر تاریخی عظمت کے نقوش سجائے اور اسی زمین کو اپنا مسکن اور مدفن بنایا، ان کی قربانیوں کو وہ لوگ مسخ کرنا چاہتے ہیں جن کے تلووں میں اس ملک کے بنانے، سنوارنے اور بچانے میں شاید ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم اس صورت حال کا قانون اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کریں، اور دوسری طرف مسلمان مؤرخین انصاف پسند غیر مسلم مورخین کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان کی آزادی اور اس کی تعمیر کی بابت مسلمانوں کی جد و جہد کی تاریخ مرتب کریں۔ اور درست علمی مواد قوم و ملک کے سامنے

پیش کریں، یہ ایک طرف اس ملک کے ساتھ بہی خواہی ہوگی، انصاف ہوگا، اس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی، لوگ حقائق سے واقف ہوسکیں گے، اور دوسری طرف خود مسلمان نوجوان اور آنے والی نسل احساس کمتری سے محفوظ رہے گی، اور اپنی تاریخ سے اس کا رشتہ مربوط اور استوار رہے گا، اگر اس وقت اس صورت حال پر توجہ نہیں دی گئی تو پھر آئندہ شاید ان مضرتوں کی تلافی ممکن نہ ہو۔

(..................)

صبر ایک تدبر ہے!

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے: ایک یہود، دوسرے منافقین۔ یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی اور منافقین بغلی دشمن تھے، جو ہمیشہ در پردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچاتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، عبداللہ ابن ابی ان کا سردار تھا، ابتداءاً اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا، بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، مگر اسلام کے بعد عبداللہ ابن ابی کا خواب پورا نہ ہو سکا، غالباً اس لئے بھی عبداللہ ابن ابی کے سینہ میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتشِ غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ ﷺ اپنے رفقاء "مہاجرین اور انصار" کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبد اللہ ابن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور انصاری صحابیؓ کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخصوں کا نہ رہا، بلکہ دو جماعتوں "انصار و مہاجرین" کا اختلاف بن گیا، آپ ﷺ نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن عبداللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین و انصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد (ﷺ) اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری

مثال عربی زبان کے اس محاورے کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تاکہ وہ تمہیں کو کھا جائے "سمن كلبك لتا كلك" پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی۔ ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبۂ ایمان کے تحت رسول اللہ ﷺ سے صحیح صورتِ حال عرض کردی، حضرت عمرؓ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا، انہوں نے آنحضور ﷺ سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر رہے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے براہِ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی، اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی، انصار میں سے اکابر اور سربرآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید تو بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی، بہرحال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہوگیا اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ ﷺ نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، آپ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے، لیکن خلافِ معمول آپ پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے، چلچلاتی ہوئی دھوپ، گرم ریت، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوگئی تھی اس کا اثر بھی جاتا رہا، دراصل یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر آپ ﷺ نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا، تاکہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں!

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبداللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آ گیا، حضراتِ انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہو گیا، تو عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے جو مخلص مسلمان تھے اور ان کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں، لیکن مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک منافق کی وجہ سے ایک مخلص مسلمان کا قتل ہو جائے؛ کیوں کہ میں اپنے والد کے قاتل کو شاید نہ دیکھ سکوں! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آپ ﷺ مجھے حکم فرمائیے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورتِ حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو سکتے تھے اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور در پردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں اور خود ان کا لڑکا اس کے قتل کے لئے تیار ہے، حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی اس دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کی رائے میں برکت رکھی ہے، **بارك الله في رأى رسوله** ۔

یہ ایک مثال ہے حسنِ تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن مجید نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے۔ صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسنِ تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں، صبر یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے؛ اس لئے کہ اشتعال اور غیظ و غضب کی حالت میں انسان کی قوتِ فیصلہ کم یا ختم ہو جاتی ہے اور فراست و دانشمندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، **لا يقضي القاضي وهو غضبان**؛ کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی

معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دوررس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ ﷺ نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا۔ صلح نامہ لکھتے ہوئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا گیا، اہل مکہ کے نمائندہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ پر "باسمك اللھم" لکھنا پڑے گا، آپ ﷺ نے اسے مان لیا، پھر صلح کے فریق کی حیثیت سے آپ ﷺ کا اسم گرامی "محمد رسول اللہ" لکھا گیا، دوسرے فریق نے "رسول اللہ" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ ﷺ اس پر بھی تیار ہوگئے، حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ اس کلمۂ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے خود محو فرما دیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہوکر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہوکر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے۔ یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں۔ یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار رکھنا بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جا رہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ ﷺ نے منظور فرمایا، اکثر صحابہ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہوسکا اور انہوں نے آپ ﷺ سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لئے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس

طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی "فتح مبین" قرار دیا۔ (فتح:۱) در اصل آپ ﷺ کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح و شام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کو معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف و دہشت کی فضاء میں کھل کر دعوتِ اسلام کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا، آپ ﷺ کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی اور جن لوگوں کو میدانِ جنت میں فتح نہیں کیا جاسکتا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب و اذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کے رفقاء کم و بیش چودہ سو تھے، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ ﷺ نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغازِ نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سوا ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوا لاکھ کے قریب تو خود آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دی تھی۔

آپ ﷺ کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالات سے گزر رہے ہوں، وہ سیاسی اور انفرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصاً، اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں۔ جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ و غضب پر صبر اور خوش تدبیری اور مناسب موقع و محل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک کر اٹھائیں، ایسا ردِ عمل

نہ ظاہر کریں جو خودکشی کے مترادف ہو اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے ۔ یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہو جانا فرقہ پرستوں کی سب سے بڑی کامیابی اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا، فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت ہے اور حقیقت میں فتح مبین!!

(۲۶؍ جون ۱۹۹۸ء)

پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے!

کئی سال پہلے کی بات ہے، میں دہلی سے حیدرآباد آرہا تھا، میرا ریزرویشن فرسٹ کلاس میں تھا، فرسٹ کلاس کے کیبن میں عام طور پر دو یا چار برتھ ہوتے ہیں، لیکن اتفاق سے یہ بوگی کے کنارے کا کیبن تھا، وہ ایک طرف سے کسی قدر دبا ہوا تھا، اس لئے اس میں تین برتھ تھے، دہلی سے ہم دو ہی آدمی اس کیبن میں سوار ہوئے، ایک طرف میں، اور ایک طرف میرے ہی ہم عمر ایک مسافر جو سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے، اس کی پیشانی پر سرخ وسفید قشقے ہندو مذہب پر اس کے ایقان اور اس کی مذہبیت کو ظاہر کررہے تھے، گاڑی جب بھوپال پہنچی تو ایک ہندو فیملی آئی، ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی، جس کی عمر اٹھارہ بیس سال رہی ہوگی، یہ لوگ اصل میں ناگپور کے رہنے والے تھے، اور کسی ضروری امر کے تحت لڑکی کو اچانک بھیج رہے تھے، لمبا راستہ اور تنہا ایک لڑکی کا سفر، اس سے وہ لوگ پریشان تھے۔

انہوں نے کیبن میں اس کا سامان رکھا، اور حالانکہ وہ ہندو بھائی میرے سامنے ہی بیٹھے تھے، اور میری شکل وصورت سے ان کے لئے یہ پہچاننا بالکل دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ایک مولوی واقع ہوا ہوں، اس کے باوجود وہ ہماری طرف مخاطب ہوئے، اور کہنے لگے: ''مولانا صاحب! اسے ناگپور جانا ہے، یہ اب آپ کی لڑکی ہے، اور ہم اسے آپ کے حوالہ کررہے ہیں'' گاڑی نے سیٹی بجائی اور انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی لڑکی کو رخصت کیا، میں برابر اس سے پوچھتا رہا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے، جب میں اپنے لئے پانی لینے کو اترتا تو اس کے پانی کا برتن بھی ساتھ لے لیتا۔

یہ لڑکی طالبہ تھی، اور کسی قدر شوخ بھی، کچھ دور بعد اس نے مجھ سے کچھ سوالات کئے، جب اسے معلوم ہوا کہ میں اسلامی علوم کی تدریس کا کام کرتا ہوں تو اس نے اسلام کے بارے میں بہت سے سوالات کئے، جن میں زیادہ تر قرآن اور نبی کی ضرورت سے متعلق تھے، اس نے مذہب کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

لیکن اس کے بعد اسلام میں خواتین کا کیا درجہ و مقام ہے؟ اس بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کردی، مجھے حیرت ہوئی کہ اس بارے میں اسے کافی مخالفانہ معلومات حاصل تھیں، تعدد ازدواج، طلاق، میراث، پردہ، عام طور پر وہ تھوڑی بحث کے بعد میرے جواب سے مطمئن ہو جاتی، آخر میں اس نے دیت (خون بہا) کے بارے میں سوال کیا، آپ کے مذہب میں عورتوں کے خون کی قیمت مردوں کے خون سے کم رکھی گئی ہے؟ مجھے تعجب ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے قانون دیت کے بارے میں علم نہیں ہوگا، لیکن اس نوعمر غیر مسلم لڑکی کو یہ معلومات حاصل ہیں، میں نے اس سے بتایا کہ دیت کا تعلق انسان کے درجہ و مقام سے نہیں، بلکہ اس میں دو پہلو ہیں، ایک تو قاتل کی سرزنش، دوسرے مقتول کے پسماندگاں کی معاشی مدد، صورتِ حال یہ ہے کہ مرد پر خاندان کی معیشت کا بوجھ ہوتا ہے، اگر وہ مارا جائے تو بچے ہوئے لوگوں کو دکھ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے زیر پرورش لوگوں کی گذر اوقات کا بھی مسئلہ ہو جاتا ہے، اگر عورت ماری جائے تو صدمہ تو بعض اوقات مرد کے قتل سے بھی زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ ایک بچہ کے دل میں ماں کی محبت باپ سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن معاشی مسائل پیدا نہیں ہوتے، اسی بنیاد پر مرد کی دیت زیادہ رکھی گئی، تا کہ قاتل کی سرزنش بھی ہو، اور مقتول کے لوگوں کے لئے جو معاشی مسائل پیدا ہوئے ہیں، کسی حد تک ان کا مداوا بھی ہو سکے، عورت کی دیت میں صرف قاتل کی سرزنش کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لئے مقدار کا یہ فرق مقتول کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے، نہ کہ درجہ و مقام کی بناء پر، اگر درجہ و مقام کی بناء پر دیت میں فرق کیا جاتا تو نیک و بد اور عالم و جاہل، حاکم اور محکوم اور مذہبی نقطۂ نظر سے

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان بھی کیا جاتا۔

اسکے بعد اس نے کہا کہ مجھے اسلام سے بڑی دلچسپی ہے، اور یہ میرے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ مجھے براہ راست ایک مسلمان اسکالر سے اسلام کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے، اس نے مجھ سے بار بار اشتعال انگیز اور غصہ دلانے والے سوالات کئے، لیکن میں نے ہمیشہ تحمل اور صبر کے ساتھ جواب دیا، اس بات نے خاص طور سے اسے متاثر کیا، اور کہنے لگی کہ کیا آپ کو غصہ آتا ہی نہیں ہے؟ میں نے اسے حضور کی وہ حدیث سنائی جس میں بار بار آپ سے جینے کا طریقہ دریافت کیا گیا، اور آپ ﷺ نے ہر بار ایک ہی بات ارشاد فرمائی کہ غصہ نہ کرو، لا تغضب، جب ٹرین ناگپور پہنچی تو اس کے ماموں وغیرہ پلیٹ فارم پر موجود تھے، اس نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ ''مولانا صاحب ہمارے گرو اور ہمارے پتا جی کے سمان ہیں''، یعنی ہمارے استاذ اور باپ کے درجہ میں ہیں، پھر ٹرین کھلنے تک وہ لوگ رکے رہے، اور میری تواضع کرتے رہے۔

یہ واقعہ ہمیں ہمیشہ یاد رہتا ہے، جہاں تک اسلام کے بارے میں سوال وجواب کی بات ہے، تو اس کی نوبت تو ٹرینوں اور سواریوں میں آتی ہی رہتی ہے، اصل میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ یہ کہ اس کیبن میں میرے برابر ہی میں ایک ہندو شخص موجود تھا اور اپنی ہندو پہچان کے ساتھ تھا، نیز اسے بھی حیدرآباد آنا تھا، انسان کے لئے عزت وآبرو کا مسئلہ جان ومال سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے، لیکن بہ مقابلہ اس غیر مسلم کے ہندوستان میں ہندو فکر کے سب سے بڑے مرکز ناگپور کے ہندوؤں نے ایک مسلمان مولوی پر زیادہ اعتماد کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور حاملین اسلام کے بارے میں سماج کیا سوچتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ سوچ تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔

۱۱/ستمبر کے واقعہ سے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کی گھٹائیں چھا گئی ہیں، لیکن خود میرے ساتھ بعض واقعات اس کے بعد ایسے پیش آئے جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، حیدرآباد میں ایک مارکٹ ٹرپ بازار ہے، جس میں الیکٹرک اشیاء اور تعمیری سامان کے علاوہ گیس کے چولہوں کی بھی بڑی

دکانیں ہیں، جمعہ کے دن مسجد جاتے ہوئے ایک چولہا خریدنے اسی بازار کی ایک دکان میں جانا ہوا، جو ہندو بھائی کی دکان ہے، ہم نے ایک چولہا پسند کیا، قیمت طے کر لی، اور اسے پیک کرا لیا، اب جو جیب میں ہاتھ ڈالا، تو متعینہ قیمت میں پانچ سو روپے کم تھے، میں بڑا شرمندہ ہوا، اور ان سے کچھ ظاہر کئے بغیر کہا کہ آپ ابھی اس سامان کو اسی طرح رہنے دیں، میں انشاء اللہ کل آ کر لے جاؤں گا، اس نے سبب پوچھا، میں نے ٹالنا چاہا، لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے صورت حال بتا دی، اس نے بلا تامل کہا کہ اس میں کیا بات ہے؟ جو پیسے ہیں دے دیں اور چولہا لے جائیں، آپ دھوکہ تھوڑا ہی دیں گے، میں ہچکچایا، لیکن اس نے اپنے ملازم سے چولہا میری گاڑی میں رکھوا دیا، اور کہا کہ کل ہی پیسہ لا کر دینا ضروری نہیں، آپ دو چار روز میں جب بھی اس طرف آئیں، اس وقت مجھے پیسے دے دیں، ظاہر ہے کہ اس کا یہ اعتماد مجھ پر نہیں، بلکہ داڑھی، ٹوپی، اور میری مولویانہ وضع پر تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے بدترین پروپیگنڈوں کے باوجود آج بھی مسلمان مذہبی طبقہ پر لوگوں کو کس قدر اعتماد ہے؟ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے، اور میری طرح بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی مسلمان جھوٹ بولتا تو غیر مسلم انہیں عار دلاتے کہ تو مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے؟ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی واقعات ہیں، اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور بہت سے لوگ عملی طور پر اس کے تجربہ سے گذرتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کے ذہن پر اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق کے تئیں ایک نقشِ جمیل اب بھی ثبت ہے۔

فرقہ پرست عناصر چاہتے ہیں کہ غیر مسلم اذہان سے اس نقش کو مٹا دیں، اور ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دیں کہ مسلمان قاتل، رہزن، لٹیرے، عورتوں پر ظلم و جور روا رکھنے والے، دھوکہ باز اور اپنی قوم کے علاوہ سبھوں سے نفرت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، مسلمان علماء اور اہل مدارس کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں عام تصور یہی تھا کہ یہ نیک اور انسانیت پسند لوگ ہوتے ہیں، اسی لئے خاص طور پر انہیں دہشت گرد اور شدت

پسند ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ ایسی صورتِ حال ہے کہ آزاد ہندوستان میں مدارس کے لئے کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی، اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی سطح پر مسلمان ایسی ''پروپیگنڈہ جنگ'' کا نشانہ نہیں بنے تھے، پروپیگنڈے کی یہ جنگ توپ وتفنگ کی جنگ سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ ہتھیاروں کی جنگ ہر جگہ نہیں کی جاسکتی، اور ہر شخص اس سے متاثر نہیں ہوتا، لیکن پروپیگنڈہ کے لئے کوئی سرحد اور کوئی دائرہ نہیں ہے، یہ بچے سے بوڑھے، مردوں سے عورتوں، اور دانش وروں سے جاہلوں تک ہر طبقہ کو متأثر کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی سے مغرب کی غلامی کی وجہ سے ہم اس موقف میں نہیں ہیں کہ ان پروپیگنڈوں کا مقابلہ ان ہی وسائل سے کریں جنھیں مغرب استعمال کررہا ہے، کیوں کہ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح مخالف اسلام لابی (Lobby) قابض ہے، عالم اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی کوئی منظم، عالمی نیوز ایجنسی بھی نہیں ہے، جو لوگوں تک صحیح خبریں پہونچائے، اور جھوٹی خبروں کا پردہ فاش کرے، ہندوستان میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی انگریزی اخبار نہیں، نہ مسلمانوں کا ایسا ٹی وی چیانل ہے جس کی رسائی دوسری چیانلوں کے مقابلہ کی ہو، اس غفلت کیش، بے سرو سامانی اور وسائل واسباب کے باب میں بے جا قناعت کے ساتھ ہم کیا خاک اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرسکیں گے؟

ہمارے لئے ایک ہی صورت ہے کہ ہم پروپیگنڈہ کا جواب عمل کے ذریعہ دیں، عمل کے جواب میں کچھ دیر لگتی ہے، لیکن اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں، پروپیگنڈہ کے ذریعہ بات جلد پھیلتی ہے، لیکن اس کا اثر دیر تک نہیں رہتا، مسلمان ایک منصوبہ کے ساتھ غیر مسلم بھائیوں سے حسن سلوک اور حسن اخلاق کا رویہ اختیار کریں، یہ کوئی مصنوعی اور نمائشی عمل نہیں ہوگا بلکہ اسلامی احکام اور نبوی ہدایات کے عین مطابق ہوگا۔ سفر کے درمیان جن غیر مسلموں کا ساتھ ہو، ان سے نرم گفتگو کریں، ان کے معاملہ میں ایثار سے کام لیں، کوئی عورت، یا عمر دراز شخص آجائے تو خود سمٹ کر یا اٹھ کر ان کو بٹھا

دیں، کسی کو پانی کی ضرورت ہو تو پانی پیش کریں، غیر مسلم فقراء کی اعانت کریں، محلہ میں کوئی غیر مسلم بیمار ہو تو اس کی عیادت کرلیں، غریب ہو تو علاج کے لئے کچھ پیسہ دے دیں، غیر مسلم بھائی کے یہاں شادی ہو، یا بچہ کی ولادت ہو تو جا کر مبارکباد دیں، کسی کے یہاں انتقال ہو جائے تو تعزیت کریں، ہسپتالوں میں جا کر بیمار غیر مسلم بھائیوں کو پھل پیش کریں، آپ ڈاکٹر ہوں تو ان میں جو غریب لوگ ہوں، مفت ان کا علاج کردیں، تاجر ہوں تو غیر مسلم گاہکوں کے ساتھ اکرام سے پیش آئیں،

اگر وہ اپنی نا سمجھی یا تعصب کی وجہ سے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے سوالات کرلیں تو بغیر اشتعال کے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیں، اگر کسی مسلمان اور غیر مسلم کا معاملہ ہو تو مسلمان کی بے جا طرف داری نہ کریں، بلکہ جو بات عدل و انصاف کی ہو وہ کہیں، ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہونچائیں، ان کے دیوی دیوتاؤں اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں سطح سے گری ہوئی باتیں نہ کہیں، آپ کے پڑوس میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اپنی جان و مال کی طرح ان کی جان و مال اور اپنی عزت و آبرو کی طرح ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کریں،

یہ ساری باتیں سیاست اور وقتی مصلحت کی نہیں ہیں، بلکہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول نے ان باتوں کا حکم دیا ہے، اور یہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جو ہم پر بہ حیثیت مسلمان عائد ہوتا ہے، اگر واقعی ہم دین کے ان احکام پر عمل کریں اور عملی زندگی میں اس کو ملحوظ رکھیں تو یہ عمل کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا جواب ہوگا، یہ جواب انشاء اللہ اس پروپیگنڈہ سے زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوگا۔ مکہ والے رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنی پروپیگنڈہ مہم کو تیز کئے ہوئے تھے، حج کا اجتماع، عکاظ کا تجارتی میلہ اور اسفار ہر جگہ وہ پوری قوت سے اس مہم میں سرگرم تھے، ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ سے پہلے یہ مواقع حاصل نہیں تھے، لیکن مدینہ کی بستی کو آپ نے اخلاق و محبت، مروت و رواداری اور انسانی شرافت کا گہوارہ بنا دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پروپیگنڈوں سے بدگمان رہتے، اور کسی مسلمان سے گھنٹہ دو گھنٹہ بھی ملاقات ہوتی تو ان کے دل کی حالت بدلنے لگتی، مکہ سے ہجرت کر کے

آنے والے مسلمانوں کی تعداد تین سو کے آس پاس تھی، لیکن جب فتح مکہ کے موقع سے مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد کم وبیش دس ہزار تھی، اور جان نثاروں کے اس نورانی لشکر کو دیکھ کر اہلِ مکہ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں، یہ کس چیز کا کرشمہ تھا؟ یہ وہی عمل اور حسن اخلاق کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا مقابلہ تھا، اس وقت یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم حسنِ عمل، حسنِ سلوک، حسنِ اخلاق اور حکمت ومصلحت کی تلوار سے اس جھوٹے پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں!

(..................)

دعوتِ دین سب سے اہم فریضہ

عہدِ صحابہ ﷺ کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمانوں کی تاریخ یہ رہی کہ جہاں وہ فاتحانہ داخل ہوتے وہاں صرف سیاسی غلبہ پر ہی نہیں اکتفا کرتے، بلکہ اپنے اخلاق و انسانیت دوستی اور دیانت داری کے ذریعہ مقامی لوگوں کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ دینی اور مذہبی لحاظ سے بھی ''اسلامی ملک'' بن جاتا، ایران، یمن، مصر اور سندھ وغیرہ کے علاقہ میں یہی صورت پیش آئی، عرب تاجروں ہی کے ذریعہ مالدیپ، ملیشیا اور انڈونیشیا کے باشندوں نے اسلام قبول کیا، ہندوستان میں بھی محمد بن قاسم یہی کرنا چاہتے تھے، مگر بنو امیہ کی باہمی خصومت نے ان کو اس کا موقع نہ دیا اور ان کی سپہ سالارانہ قابلیت واہلیت کا بدلہ ان کو ''دار ورسن'' کی صورت میں ملا۔

اس کے بعد ہندوستان کی زمام اقتدار عربوں کے بجائے عجمی خاندانوں کے ہاتھ چلی گئی، جن کو اپنی بادشاہی کے تحفظ کے سوا اسلام کی تبلیغ واشاعت یا اس کی اقامت وتنفیذ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں سے فیروز تغلق اور اورنگ زیب عالمگیر کو چھوڑ کر تمام بادشاہوں نے اپنی بہترین ذکاوت وصلاحیت اور غیر معمولی قابلیت وفراست کا استعمال محض اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے کیا اور اگر کچھ کام دعوت وتبلیغ کا ہوا بھی تو اس کا سہرا بڑی حد تک صوفیاء اور مشائخ کے سر ہے۔

لیکن دعوتِ دین سے غفلت اور اپنے ہی مفتوحہ ممالک میں عددی تناسب کے لحاظ سے کم ہونے کے باعث بالآخر سیاسی اعتبار سے بھی ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، اسپین میں عیسائیوں سے شکست کھانے کے بعد سوائے ان کی کچھ یادگار عمارتوں کے اور کوئی چیز باقی

نہ رہی، ہندوستان میں انگریزوں کے غلبہ کے بعد ہزار جد و جہد کے باوجود مشرق و مغرب کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی ہی ان کی قسمت میں آسکی اور ملک کے تین چوتھائی حصہ میں ان لوگوں کا غلبہ رہا جن کو درحقیقت قدرت نے ایک دسترخوان کی طرح مسلمانوں کے سامنے بچھا دیا تھا، کہ وہ اپنی اخلاقی قوت کے ذریعہ ان کو اسلام کے وجود میں ہضم کرلیں، مگر مسلمانوں نے اس ''معنوی نعمت'' کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ''مادّی نعمت'' کے ساتھ کیا تھا۔

لیکن انگریزوں کی تاریخ واضح طور پر اس سے مختلف ہے، سترہویں صدی میں جب ایک طویل عرصہ کے بعد مغرب نے انگڑائی لی اور پہلے علم وصنعت میں اور پھر اپنی غیر معمولی سائنسی صلاحیت کے جلو میں سیاسی اعتبار سے آگے بڑھنا شروع کیا تو اس کے باوجود کہ ماضی قریب میں یورپ میں مذہب اور سیاست کے درمیان طویل اور بھیانک جنگ ہوچکی تھی اور ''کلیسا'' کو شکست دے کر مغربی اہلِ علم ونظر سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے ایک بڑا معرکہ سر کرلیا ہے اور نا قابلِ تسخیر رکاوٹ کو مسخر کرلیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو ضروری جانا کہ مشرق میں جہاں بھی فوجی اور سیاسی اعتبار سے ان کے قدم مضبوط ہوں وہاں عیسائیت کے مبلغین اور داعیوں کی ایک فوج بھی پیچھے پیچھے ان کے ساتھ رہے اور وہ لوگوں کے دل اور دماغ فتح کرنے کے لئے سرگرم رہے، اس طرح نہ صرف یہ کہ عیسائیت کو وسعت حاصل ہو سکے گی بلکہ ان کی حکومت اور سیاسی قوت کو بھی استحکام حاصل ہو سکے گا ،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوا سو سال کے بعد مغرب کا سیاسی اقتدار تو ختم ہوگیا، مگر عیسائی مشنری نے ان ممالک میں جن لوگوں کو عیسائی بنایا تھا وہ مقامی لوگ باقی رہے اور مشنریاں بھی اپنے کام میں مصروف رہیں۔

عیسائیوں کے اس حملے کا زیادہ نشانہ تو بت پرست قومیں ہی بنیں، مگر ''امتِ محمدیہ'' بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکی اور مسلمانوں کی استقامت و ثابت قدمی اور دین کے معاملہ میں جماؤ کے مقابلہ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے عیسائی اداروں نے عالمی سطح پر اجلاس اور مذاکروں کے ذریعہ اپنا طریقۂ کار طے کیا اور منصوبہ بند اور منظم طور پر پورے

عالم اسلام میں اپنی جد و جہد شروع کردی، ان کے تحریصی اور ترغیبی حربہ سے ہندوستان سے مولوی صفدر علی، مولوی عماد الدین، مولوی برکت اللہ، تبریز سے مرزا ابراہیم اور بیروت سے کامل جیسے لوگ انکے دام میں گرفتار ہونے سے نہ بچ سکے۔

پاکستان جیسے مسلم ملک کے متعلق ــــ جو اسلام اور مذہب کے معاملہ میں نسبتاً زیادہ حساس اور بیدار سمجھا جاتا ہے اور جس کی تاسیس ہی اسلام کے نام پر ہوئی ہے ــــ بھی رومن کیتھولک چرچ نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۷ء ر ۱۹۵۸ء میں لکھا ہے:

> ''مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سب سے زیادہ شاندار کامیابی پاکستان میں حاصل ہوئی۔''

گو کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جن مسلم ممالک میں بھی عیسائیت کو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوسکی ہے، اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی جہالت اور ناواقفیت ہے، چنانچہ Ale Chatelier کا بیان ہے:

> ''عیسائی بننے والے مسلمانوں میں اکثریت عام لوگوں اور جاہلوں کی ہے۔''

یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد عقل و دانش سے دور ہیں اور مذہبی خوش گمانی اور غلو آمیز عقیدت کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو اس کو قبول کرسکے، خدا کے بارے میں تین (خدا، ابن خدا اور روح القدس) میں ایک اور ایک میں تین کا تصور کسی ''لال بجھکڑ'' سے کم نہیں ہے، حضرت مسیح ایک طرف خدائی کے منصبِ عظیم پر فائز نظر آتے ہیں، دوسری طرف اس قدر عاجز و درماندہ کہ صلیب پر نہایت ذلت کے ساتھ چڑھا دیئے جاتے ہیں اور ایک بے کس و بے بس انسان کی طرح خدا کے حضور جاں بخشی کے لئے فریاد کناں ہوتے ہیں۔ ''کفارہ'' کا عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی اور ان کی وساطت سے نسلِ آدم میں منتقل ہونے والی غلطیوں کا کفارہ ادا کردیا، ایک ایسی بات ہے جو صریح طور پر عقل کے خلاف ہے، کہ غلطی ایک کرے اور سزا ایک پائے اور یہ کہ غلطی حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور گنہگار ان تمام انسانوں کو سمجھا

جائے جوان کی نسل سے پیدا ہوتے رہے، حالاں کہ ہر آدمی ارادہ اور عمل کے لحاظ سے اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے مقابلہ اسلام عقل و مصلحت کے عین مطابق ہے اور جوں جوں علم وفن کا ارتقاء ہوتا جاتا ہے، اسلام کی عصریت اور عقل وحکمت سے مطابقت نمایاں ہوتی جاتی ہے، مستشرقین ہر چند کہ اسلام کے معاملہ میں بہت متعصب اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اور قرینہ ہائے دور دراز سے کبھی کبھی ایسی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی فہم ودانش پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، تاہم اب ان میں بھی ''موریس بوکائی'' جیسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں، جو موجودہ سائنسی اکتشافات کے لحاظ سے قرآن مجید کی واقعیت اور بائبل پر اس کے تفوق و برتری کا بہانگِ دہل اعلان کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ یہ بات اب قریب قریب پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام ہی واحد مذہب ہے، جو تفریق و امتیاز کی ساری دوریوں کو مٹا سکتا ہے اور پست طبقات کو دوسروں کا ہم قدم اور ہم دوش بنا سکتا ہے، ہندو سماج کا کہنا ہی کیا ہے، مغربی معاشرہ جو انسانی حقوق کے تحفظ کا سب سے بڑھ کر مدعی ہے، کالوں کو انسان کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ اور نظام مواصلات کو اس زمانے میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، شہنشاہیت کے بجائے اس عہد میں جمہوریت اور سیکولرزم کا غلبہ ہے، جو ہر شہری کو مذہب اور اظہار رائے کی آزادی عطا کرتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی دعوت وتبلیغ کا حق دیتی ہے، ماضی میں شاہی حکومتوں اور مذہبی تعصبات کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

یہ سب کچھ گویا خالق کائنات کی طرف سے امت مسلمہ کے لئے ایک بیش قیمت انعام ہے، جن سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں میں دعوت دین کا کام اس سے کہیں آسانی سے کیا جا سکتا ہے جن سے مسلمان عہد اوّل میں دو چار ہوئے۔ اسلام کی صداقت وراستی اور ضرورت اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دشمن اور ناقد سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی اپنا لب ولہجہ نرم کرنے پر مجبور ہیں اور اسلام کی بہت سی خوبیوں کا کھلے عام اعتراف

کرتے ہیں، مہاتما گاندھی جی جیسے ذہین، سنجیدہ اور تسلیم شدہ مذہبی وسیاسی ہندو قائد کا اہل وطن کو اپنے طرز حکومت میں ''ابوبکر وعمر'' کے طریق کار کی تقلید کی ترغیب دینا، دوسرے لفظوں میں اسلام کی عہدِ حاضر کے لئے موزونیت اور دوسرے مذاہب عالم کا زمانۂ اقتدار گذر جانے کا اعتراف ہے۔

خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ان ساری سہولتوں کے باوجود مسلمان اگر ''دعوتِ دین'' کا کام نہ کریں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ قدرت ان کے بجائے کسی اور قوم کو خدا کے دین کی سربلندی اور اشاعت کے لئے اٹھائے گی، اس لئے کہ یہ اب اس کے اہل باقی نہیں رہ گئے۔ (محمد: ۳۸) افسوس کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر جگہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار ہیں، یہ دشمن کہیں استعمار اور سرمایہ دار کی صورت میں ہیں، کہیں الحاد اور کمیونزم کے لباس میں، کہیں مذہبی تعصب اور تنگ نظری ہے، کہیں لسانی اور علاقائی مسائل ہیں، ہر جگہ احتجاج کے ذریعہ دشمنوں کا مقابلہ کیا جارہا ہے، مگر کوئی نہیں جو اس ''بے آواز لاٹھی'' کا سہارا لے جو مقابلہ کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ جس ہتھیار سے مدد لی تھی، جو دلوں کو فتح کرلے، جو لوہے کو موم کردے اور جو جان لیواؤں کو جاں نثار بنادے۔

بہت سے علاقوں میں آج جو لوگ جہاد کی بات کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ تلوار اور قوت کا استعمال جہاد کا آخری مرحلہ ہے، جسے مجبوری کے درجہ میں گوارا کیا جاتا ہے، جہاد کا پہلا مرحلہ جو اصل مقصود ہے۔ ''دعوت'' ہے، چنانچہ فقہاء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''دعوت'' دینے کے بعد ہی غیر مسلموں سے جہاد کیا جاسکتا ہے، **یجب ان یبدو المسلمون بالدعوة قبل القتال**، یہاں تک کہ قاضی ابوالحسن ماوردی نے اسلام کے نظام مملکت پر اپنی فاضل و معروف تصنیف ''الاحکام السلطانیہ'' میں لکھا ہے کہ جن لوگوں تک دعوت نہ پہنچی ہو اور استدلالی اعتبار سے ان پر اسلام کی حقانیت واضح نہ کردی گئی ہو، ان پر جہاد کا اقدام حرام ہے، **یحرم علینا الاقدام علی قتالهم** اور اگر اسلامی لشکر نے ان تک دین کی دعوت پہنچنے سے پہلے حملہ کر

دیا تو مقتولوں کا خون بہا اس کے ذمہ ہوگا، ضمن دیات نفوسهم۔

لیکن اس کے باوجود ملک کے طول وعرض میں مسلمانوں کی ہزاروں تنظیموں اور تحریکوں کے باوجود شاذ ونادر تنظیمیں ہیں جو اس مقصد کو سرانجام دینے کے لئے اٹھی ہو اور ہم وطنوں میں آخرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کررہی ہوں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اب تک ہندوستان میں متعدد ایسی زبانیں ہیں جن میں تعارف اسلام کی کوئی مناسب کتاب اور قرآن مجید کا ترجمہ تک نہیں، متعدد ایسی زبانیں ہیں جن کو مسلمانوں کی قابلِ لحاظ تعداد بولتی ہے، مثلاً تلگو، تمل، بنگلہ، اڑیا وغیرہ، مگر ان زبانوں میں اسلام سے متعلق جو لٹریچر ہے وہ کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے نہایت معمولی ہے، خود ہندی میں بھی، جو ملک کی اوّل درجہ کی قومی زبان ہے۔ اسلام سے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے والی کتابیں انتہائی ناکافی ہیں اور ان مقامی زبانوں میں اسلامیات کا جو کچھ سرمایہ ہے دعوتی اسلوب اور نفسیات کے لحاظ سے وہ غیر مفید اور غیر مؤثر بھی ہے، ان زبانوں میں اگر ہم ارکانِ اسلام سے متعلق مسائل جمع کردیں اور اس طرح کے کام کریں تو یہ مسلمانوں کے لئے تو مفید ہوگا مگر غیر مسلموں کے لئے اس میں کشش کا کوئی سامان اور غور وتدبر کی کوئی چیز نہ ہوگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مقامی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ، احادیث نبوی ﷺ کا عمدہ اور مؤثر انتخاب اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سادہ انداز میں سیرت پیش کی جائے، جس میں آپ ﷺ کے اخلاقی پہلو کو زیادہ نمایاں کیا جائے، اسلام کے عقائد اور اس کی معقولیت اور جدید اکتشافات کی روشنی میں اس کی صداقت اور واقعیت کو نمایاں کیا جائے، اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصول، ان کا توازن اور ان کی افادیت کو واضح کیا جائے، دوسرے مذاہب اور جدید نظریۂ ہائے حیات سے اسلام کا سنجیدہ تقابل کرایا جائے اور ایسی تحریروں میں معروضی اور مثبت اسلوب اختیار کیا جائے، مناظرانہ، جارحانہ اور منفی طرز تعبیر سے بچا جائے۔

اسلام سے متعلق پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات بھی کس قدر کم ہیں؟ اس

وقت اس کا اندازہ ہوتا ہے جب اسلامی زندگی کا کوئی پہلو قومی صحافت میں زیر بحث آتا ہے اور غیر مسلم دانشور اور چوٹی کے اہلِ قلم اس پر کچھ لکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس ''غلط بیانی'' کا پورا پورا قصور صرف انہیں کے ''فردِ عمل'' میں ڈال دیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت اس غلطی میں بڑا حصہ خود ان کی غفلت کا ہے کہ انہوں نے اب تک ملکی اور قومی زبانوں میں اسلام سے متعلق معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم نہیں کیا جس سے استفادہ کر کے غیر مسلم اہل قلم اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس کی بے غبار ترجمانی کر سکیں۔

زبان سمجھنے اور سمجھانے کا محض ایک ذریعہ ہے، زبان کبھی مقصود نہیں ہوتی، نہ زبان کا کوئی مذہب اور عقیدہ ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے زبان کے معاملے میں فراخ دلی اور وسیع النظری سے کام لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر عبرانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے صرف پندرہ دنوں میں عبرانی سیکھ لی، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید چھ زبانوں سے واقف تھے، روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فارسی زبان سیکھ لی تھی اور وہ اس سے آگاہ تھے۔

فارسی کوئی اسلامی زبان نہیں تھی، بلکہ مشرک، بت پرست اور آتش پرست اقوام کی زبان تھی اور فارسی میں اب بھی کثرت سے ایسی تعبیرات وتشبیہات موجود ہیں جن کی جڑیں شرک سے ملتی ہیں، لیکن جب اسلام ایران میں داخل ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کی دعوت واشاعت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی سیکھی اور اس میں اس درجہ مہارت حاصل کی کہ تحریر کے اپنے مستقل اسلوب اور طرز نگارش کی بنیاد رکھی، فارسی ہی زبان میں ایسے ایسے نئے محاورات، ضرب المثل اور تشبیہیں وضع کیں جو اسلام کے مزاج ومذاق سے مطابقت رکھتی تھیں اور اس زبان میں اس قدر لکھا اور اسلام کے مختلف علوم وفنون پر کام کیا کہ رفتہ رفتہ فارسی ایک اسلامی زبان بن گئی اور اسلام فارسی زبان پر اس طرح چھا گیا کہ آج اسلام کو الگ کر کے فارسی ادب اور شاعری کا تصور بھی دشوار ہے۔

لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اب بھی دینداروں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو عربی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو اچھوت اور بے برکت سمجھا ہوا ہے اور صرف اردو

زبان میں تھوڑا سا کام کر کے قانع اور مطمئن ہے کہ اس نے اسلام کی دعوت کا حق ادا کر دیا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام اس وقت کیا جانا چاہئے جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے اور خود مسلمانوں کا معاشرہ ایک مکمل اسلامی معاشرہ بن جائے، یہ دراصل شدید غلط فہمی اور اپنی ذمہ داری سے گریز ہے، اسلام نے ایسی کوئی ترتیب قائم نہیں کی ہے کہ غیر مسلموں کو دعوت دینے کی ذمہ داری اسی وقت مسلمانوں پر عائد ہوگی جب خود ان کا پورا معاشرہ اسلامی ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ یہ دونوں کام انجام دیے ہیں اور قرآن معاشرتی اور خانگی زندگی کے احکام کی تکمیل سے پہلے ہی سے غیر مسلموں کو اپنی دعوت کا اولین مخاطب بناتا رہا ہے، عہد رسالت میں بیک وقت اسلام لانے والوں کی تربیت وتعلیم کے لئے بھی اہلِ علم صحابہؓ کو بھیجا جاتا تھا اور غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کے لئے بھی صحابہؓ وتابعین روانہ کئے جاتے تھے۔

مسلم معاشرہ کو اسلامی بنانے کے بعد غیر مسلموں کو دعوتِ دین کا مخاطب بنانے کا مطلب عملاً اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ پوری توانائی صرف مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کر دی جائے اور اسی پر قناعت کرتے رہا جائے، اس لئے کہ مسلمانوں کو مکمل اسلام پر لانا کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانے سے زیادہ دشوار ہے، کیوں کہ اسلام خدا کے وجود اور اس کی توحید کی کائناتی حقیقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے اور یہ اصحابِ ضمیر کے لئے آسان ہے، جب کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی اسلام پیدا کرنا اپنے نفس کی مکمل سپردگی سے عبارت ہے اور یہ آسان نہیں ہے۔

اس پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں، شرعاً خود ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو سمجھیں: ان کے اندر دین کی طلب ہو اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ ہو اور اگر وہ سب جان بوجھ کر بھی اپنی کوتاہ عملی میں مبتلا رہیں تو عند اللہ خود ہی جواب دِہ ہیں، اس کے برخلاف جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں، ان کے متعلق مسلمان ذمہ دار ہیں اور عند اللہ مسئول ہیں کہ انہوں نے خدا کا دین ان تک پہنچانے سے تغافل کیوں برتا؟

افسوس کہ اتنی اہم ذمہ داری جس کے لئے امتِ محمدیہ برپا کی گئی (آل عمران: ۱۱۰) جو خدا کی نصرت و مدد کا ہتھیار اور مسلمانوں کی کامیابی کا اثاثہ ہے، جو جہاد کا نقطۂ آغاز ہے، جو انبیاء کی بعثت کا مقصود ہے اور جس سے گریز انسانیت کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی اور خدا کے دین کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہے، جو اسلام کے پیغام کو آفاقی اور اس کے نبی عربی ﷺ کی رحمت کو عام و تام کرتا ہے اور جو خود مسلمانوں کے لئے خدا کی طرف سے حفاظت و سلامتی کی کلید ہے، کس طرف سے ملتِ اسلامیہ ہند غافل ہے۔

پھر کیا کچھ دل ہیں جو اس فریضہ نبوت کی ادائے گی سے غفلت پر لرز اٹھیں اور کیا کچھ خریداران آخرت ہیں جو سیاسی شہرت سے دور گوشۂ گمنامی میں رہ کر اسلام کا شجرۂ طوبیٰ لگانے پر آمادہ ہوں؟

(۲۰/۶/۲۰۰۱ء)

ایک اہم فریضہ جس سے ہم غافل ہیں!

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیشہ سماج میں دو طبقے موجود رہتے ہیں، ایک ان لوگوں کا جنہوں نے کسی ذریعہ سے بالاتر حیثیت حاصل کر لی ہے، دوسرے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ جو ان کے استحصال کا شکار ہوں۔ اس دوسرے طبقہ کو قرآن نے ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے۔ (النساء:۷۵) قرآن نے مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ وہ ان کمزور، دبے کچلے مردوں، عورتوں اور بچوں کو نجات دلانے کے لئے جہاد کیوں نہیں کرتے، جو دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نجات عطا فرمایئے اور ہمارے لئے اپنے پاس سے حمایتی اور مددگار عطا فرمایئے۔'' (النساء:۷۵)

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ابتداءً انہوں نے اپنے اس کردار کو نبھایا اور اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی سعی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کے باشندوں میں سے ایک بڑے گروہ نے ان کو ابرِ رحمت سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور وہ اس ملک کی اکثریت کے لئے نگاہوں کا نور اور دل کا سرور بنے رہے، لیکن افسوس کہ مسلمان زیادہ دنوں تک اپنے اس کردار کو باقی نہ رکھ سکے اور کم ہی عرصہ میں وہ دعوتی مزاج سے محروم ہو کر جامد اور عیش و عشرت پرستار قوم کی طرح برادرانِ وطن کے مسائل اور احوال سے بے تعلق ہو کر رہ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب کوئی مذہب نہیں ہے اور مختلف قوموں کا جو انبوہ ہندو دھرم کے نام پر اکٹھا ہو گیا ہے، اس میں معمولی درجہ کی فکری وحدت بھی موجود نہیں ہے، ہندو قوم زبردست تضادات کا مجموعہ ہے۔ برہمن اونچی ذاتیں اور نچلی ذاتوں کے درمیان جو فاصلے ہیں، بعض مصلحین نے ان کو پاٹنے کی بہت کچھ کوشش کی، لیکن چوں کہ طبقاتی

تقسیم کا تصور محض ایک سماجی اور رواجی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کی جڑیں فکر وعقیدہ میں پیوست ہیں، اس لئے اس کی اصلاح شاید سماج کے اس دائرہ سے باہر نکلے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آج کے جمہوری دور میں اور ہندوستان جیسی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں بھی پوری کے شنکراچاریہ علی الاعلان کہہ سکتے ہیں کہ: ''اچھوت ہندو نہیں ہیں'' تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نچلی ذاتوں کے بارے میں برہمنوں کے یہاں کیسی شدید نفرت پائی جاتی ہے۔

اس نفرت کا نتیجہ ہے کہ برہمن جو ملک کی کل آبادی کا زیادہ سے زیادہ ۵ر فیصد ہیں، انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں کلیدی عہدوں پر قبضہ کر کے دوسرے لوگوں کو عملاً غلام بنا رکھا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں ایوان اقتدار میں ۵ر فیصد برہمنوں کا تناسب کیا تھا؟ اور ملک میں اقتدار اور معیشت کے اہم مواقع پر برہمنوں کا کیا تناسب تھا؟ اس کا اندازہ حسب ذیل اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

(۱)	لوک سبھا	۴۸	فیصد برہمن
(۲)	راجیہ سبھا	۳۶	فیصد برہمن
(۳)	گورنر۔ لیفٹنٹ جنرل	۵۰	فیصد برہمن
(۴)	لیفٹنٹ جنرل کے سکریٹری	۵۴	فیصد
(۵)	مرکزی کابینی سکریٹری	۵۳	فیصد برہمن
(۶)	وزراء کے چیف سکریٹری	۵۴	فیصد برہمن
(۷)	وزراء کے نجی سکریٹری	۷۰	فیصد برہمن
(۸)	جوائنٹ راسپیشل سکریٹری	۷۲	فیصد برہمن
(۹)	یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر	۵۱	فیصد برہمن
(۱۰)	سپریم کورٹ کے جج	۵۶	فیصد برہمن
(۱۱)	ہائی کورٹ رایڈیشنل جج	۵۰	فیصد
(۱۲)	سفراء۔ قونصل	۴۱	فیصد برہمن

(۱۴) پبلک سیکٹر اداروں کے سربراہان:

(الف) مرکزی	۵۷	فیصد برہمن
(ب) ریاستی	۸۲	فیصد برہمن
(ج) بینک	۵۷	فیصد برہمن
(د) ایرلائنس	۶۱	فیصد برہمن
(ہ) آئی اے ایس افسران	۷۲	فیصد برہمن
(و) آئی پی ایس افسران	۶۱	فیصد برہمن
(ز) ریڈیو۔ٹی وی	۸۳	فیصد برہمن
(ح) سی بی آئی۔کسٹمز، ایکسائز	۷۲	فیصد برہمن

(وائس آف دی ویک: اکتوبر ۱۹۸۹ء)

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی حیثیت اقتدار کے لئے سیڑھی کی ہے اور ادھر چند انتخابات سے سیاسی شخصیتوں اور جماعتوں کو اونچا اٹھانے اور نیچا گرانے میں اس نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ اس اہم ترین وسیلۂ طاقت پر بھی برہمنوں کا قبضہ ہے۔ ''انڈین اکسپریس'' کے عملہ میں ۹۲ رفیصد، ''ہندو'' کے عملہ ۹۷ رفیصد اور ''ٹائمز آف انڈیا'' کے عملہ میں ۷۳ رفیصد برہمن ہیں۔ ملک کے ان تین بڑے اخبارات سے دوسرے اخبارات ورسائل کے بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندو مذہبی کتابوں کے مطابق شری رام جی نے سمبو کو محض اس لئے قتل کیا کہ وہ شودر ہونے کے باوجود سنسکرت کا علم حاصل کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخصیتیں کسی مذہب اور اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے آئیڈیل ہوں، جب انہی کے عمل میں نفرت کا یہ پیغام موجود ہو تو اس قوم میں ایک طبقہ کے استحصال کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوگا۔ نچلی ذاتوں کے لوگوں کو طویل عرصہ سے اقتدار سے محروم رکھنے اور غلام بنا کر رکھنے کی وجہ سے خود ان میں بھی خوئے غلامی پیدا ہوگئی ہے، اونچی ذاتیں ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتی ہیں، ان کو اختلاف وانتشار کا شکار بنا کر رکھتی ہیں اور خود اس کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے

پچاس سال کا عرصہ گذر چکا، ملک کی آزادی سے پہلے ہی برہمن فکر نے آر،ایس،ایس کی بنیاد رکھی، جس نے طویل المدت منصوبے بنائے اور بالآخر وہ بامِ اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اقتدار کو انہوں نے صرف کسبِ مال کا وسیلہ نہیں بنایا، بلکہ اپنی کھوئی فکر اور مذموم عزائم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے نئی منصوبہ بندی کی ہے اور سبک خرامی کے ساتھ غیر محسوس طریقہ پر وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

مسلمانوں نے حکومت واقتدار کا ایک طویل عہد پایا، اگر وہ اس مدت میں نا انصافی کو مٹانے اور ہزاروں سال کے ستم رسیدہ انسانوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتے تو آخرت میں تو اجر پاتے ہی، دنیا میں بھی اس طویل وعریض علاقہ کے تاج دار ہوتے۔ بالآخر ہم نے اپنی غفلت کی سزا پائی اور جو لوگ تختِ اقتدار کی زینت تھے، وہ تختۂ دار کی زینت بنے، ملک آزاد ہوا اور تقسیم ملک کی وجہ سے ایک طوفان تھا جو امتِ مسلمہ کے سر سے گذر گیا، لیکن جمہوری نظام کے تحت ہم اس ملک کے اقتدار میں حصہ دار تھے، ہمیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور دوسرے بھائیوں تک اللہ کا دین پہنچانے کے وسیع مواقع حاصل تھے، یہ وقت تھا کہ مسلمان اس ملک کے مستضعفین کو اپنے ساتھ لیتے، ان کی یاوری کرتے، ان کو ظلم کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کرتے اور ان کے دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش کرتے، اس سے دوہرے فوائد حاصل ہوتے، ایک طرف اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ کھلتی اور وہ کام انجام پاتا جس کام کے لئے یہ امت مبعوث ہوئی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی اعتبار سے طاقت حاصل ہوتی، اگر وہ بادشاہ نہ ہوتے تو بادشاہ گر ہوتے، اس ملک میں کوئی فیصلہ شاید ان کی مرضی اور منشا کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن افسوس کہ ہم نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ ہم نے بھی ان کو اچھوت اور انسانیت کا ایک گرا ہوا طبقہ تصور کیا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا نہ کوئی سیاسی وزن ہے اور نہ سماجی مقام، نہ تعلیم میں انکی حیثیت نمایاں ہے اور نہ معیشت میں، مسلمانوں کو دہشت گرد، انتہا پسند اور بنیاد پرست مشہور کر کے اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ ایک قابلِ نفرت قوم بن گئے ہیں،

لیکن ان سے خوف کھاتے ہیں، عجب نہیں کہ بعض گھروں میں مائیں اس سے اپنے بچوں کو ڈراتی بھی ہوں۔ نچلی ذاتوں کی جو قیادتیں ادھر چند سالوں میں اُبھری ہیں، برہمنوں نے یا تو انہیں اتنا بدنام کر دیا ہے کہ وہ بے اثر ہیں یا ان کے درمیان اتنا انتشار برپا کر دیا ہے کہ وہ بکھر کے رہ گئے ہیں اور جب کوئی طاقت بکھر جاتی ہے تو اس کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور اپنا آلۂ کار بنا کر رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ لالو پرساد یادو، کانشی رام، ملائم سنگھ اور رام ولاس پاسوان وغیرہ اس کی واضح مثال ہے۔

آج بھی مسلمانوں کے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ پوری نیک نیتی کے ساتھ دبے کچلے لوگوں کو اپنے ساتھ لیں، ان کو ظلم سے نجات دلانے کی جدوجہد کریں اور سیاسی مفادات اور اقتدار کی حرص کرنے کے بجائے اس تعلق کو اسلام کی اشاعت وحفاظت کے لے استعمال کریں۔ اس کے بغیر ہمارے لئے اس ملک میں اپنے ملی وجود کو باقی رکھنا شاید دشوار ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو انصار یہودیوں کے استحصال کا شکار تھے، مسلمانوں کا قافلہ جب روم کی سرزمین میں پہنچا تو وہاں کی عوام نے خیر منائی، جب اہلِ ایماں کا کارواں ایران پہنچا تو اس نے یہی کہا کہ ہم تم کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنے آئے ہیں، جب بادشاہ کے تاج کی قیمت لاکھوں ڈالر ہوتی تھی اور غریب کسان گراں بار ٹیکسوں کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لینے پر مجبور تھے، ان حالات میں مسلمان ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے ان ملکوں میں پہنچے اور انہوں نے بے جان زمینوں پر قبضہ کرنے سے زیادہ لوگوں کے قلوب کو فتح کرنے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت زندگی کی راہ یہی ہے کہ وہ ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئیں اور نقش دیوار پڑھ کر اپنے لیے ایک ایسا منصوبہ بنائیں جو دیر سے سہی لیکن منزل مقصود کو پہنچاتا ہو اور محض حقیر اور وقتی مفادات پیش نظر نہ ہوں۔

مسلمانانِ ہند کا ایک اہم فریضہ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے، تو عام طور پر ان کا سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک ''ملأ قوم''، یعنی قوم کے سربرآوردہ لوگ، جن کو باعزت اور بلند مرتبت سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے ''اراذل قوم'' یا ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور کمزور لوگ، جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، ہر نبی کی دعوت اپنی قوم میں ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے ابھرتی ہے، قوم کے سربرآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں جو لوگ حقیقت پسند اور نیک خو ہوتے وہ اپنی بڑائی کو قربان کر نبی کی دعوت پر لبیک کہتے، لیکن ابتداءً ان کی تعداد بہت کم ہوتی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوتِ حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ پہل کرتے اور پھر ظلم و جور کی بھٹی میں تپائے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظام غیبی کے تحت ہوتا، کہ چونکہ وہ پہلے سے مظلوم وستم رسیدہ ہوتے، اس لئے ان کے لئے ظلم وزیادتی اور تحقیر وتذلیل کا رویہ کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوت حق کو قبول کرنے میں سردارانِ قوم ہی اصل میں رکاوٹ بنتے ہیں، اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کی کس قدر مخالفت کی، اس لئے نظامِ غیبی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سرداران مکہ جمع کر دیئے گئے، اور وہ سب بدر میں ہلاک ہوئے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دیئے ہیں، بدر کے بعد اہلِ مکہ کے دو ہی قابلِ ذکر سردار باقی رہ گئے، ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، مدینہ میں جو اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہوئی، تو اس کی ایک وجہ وہی تھی جس کی طرف

حضرت عائشہؓ نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے اوس وخزرج کی خانہ جنگی میں عبداللہ بن ابی کے علاوہ صفِ اول کے تمام قائدین لقمۂ اجل بن چکے تھے، اس لئے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظم طاقت موجود نہیں تھی، عبداللہ بن ابی نے اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، لیکن انصار مدینہ پر نشۂ ایمانی چڑھ چکا تھا، کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے غیبی نظام کے تحت بعثت محمدی سے پہلے ہی سرداران مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لئے نرم وہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورتِ حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو یہی طبقہ ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے معاند تھے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، حالاں کہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں، **قالوا أنومن لك واتبعك الارذلون** (الشعراء:۱۱۱) شیخ الھند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ''ارذلون'' کا ترجمہ ''کمینے'' سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قومِ نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے، کہ سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں، اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں، **وما نرى اتبعك الا الذين هم أراذلنا** (ہود:۲۷)

ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو 'ملأ قوم' بنا رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بسا دیا ہے کہ وہ فرمانروائی اور حکمرانی ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازوؤں سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انہوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کم تر ہیں، وہ دوسروں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہموں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے، لیکن وہ ملک میں ۶۵ ر فیصد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں، اور

اقتدار کے در و بام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملأ قوم ہیں، جن کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں عدل و انصاف اور سچائی کے سامنے سر خمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ ''دلت'' کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں ''اراذل قوم'' کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انہیں نیچ، گنوار اور کم تر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم و جور کی چکی میں پسی جا رہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے، انہیں تحفظات دیئے جا رہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انہیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگا دیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیر اعظم نہیں بن سکے، کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، اور ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لئے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتایئے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے!

جو لوگ مظلوم، دبے کچلے، اور دبائے ہوئے ہوں ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے صرف سیاسی مصلحت نہیں بلکہ دینی اور ملی فریضہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں لڑتے جو مغلوب ہیں، مرد، عورتیں اور بچے (النساء:۷۵)

قرآن نے یہاں مغلوبوں کے لئے ''مستضعفین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے ''مستضعفین'' ہیں تو شاید

بے جانہ ہو، اس لئے ان کو ساتھ لینا اور اس ملک کے ظالموں کو مشترک تدبیر کے ذریعہ ظلم سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، بدقسمتی سے ہم نے اس اہم کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی، بلکہ ہندوؤں کی اونچی برادری سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کم وبیش یہی رویہ اختیار کیا، بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں بھی مختلف دیواریں کھڑی کرلیں، بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہو جاتی ہیں کہ پاس کا آدمی نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہونچایا ہے، ایک تو اس ملک میں دعوت اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اگر ہم اس طبقہ سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہو سکتے تھے، ہر قوم میں دعوتِ حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے، کہ پہلے ایسے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے، پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا تو بالآخر جو طبقہ انہیں نیچ گردانتا تھا، اس کے لئے بھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا، پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا، پھر اہلِ مدینہ نے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اہلِ مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہوئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے، یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے، کالے، گورے، عرب، عجم کی کوئی تفریق نہیں، ایک ہی مسجد میں سب کو خدا کی عبادت کرنی ہے، جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو، وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو، اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو، انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں، بلکہ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے، یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور مبنی بر انصاف ہے کہ جن قوموں کو نیچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لئے بہت بڑی رحمت باور کرتی ہیں، اگر اسلام کے اس عظیم اصولِ زندگی کو ان محروم ومظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوں، اور اس ابرِ رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں، مگر افسوس، اور صد ہزار افسوس! کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اعتبار سے ہم خود اچھوت ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جاتے، جن کی تعداد ملک میں ساٹھ، پینسٹھ فیصد سے کم نہیں، تو اگر ہم بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں، اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلت ہی کو اپنا ہتھیار اور آلۂ کار بناتے ہیں، اگر ہم انہیں قریب کرلیں، تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہو جائیں۔

وقت ابھی بھی گیا نہیں ہے، اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہئے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہئے کہ دلت سیاسی وسماجی قائدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں، انہیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، یوپی کے حالیہ الیکشن میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا، گو بعض سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستی اور اقتدار کی بڑھتی ہوئی حرص کی وجہ سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ بی جے پی کو سخت صدمہ پہونچا، اور اس کی وجہ سے پورے ملک میں اس کی ساکھ متاثر ہوئی، اس لئے مسلمان قائدین کو اعلیٰ سطح پر دلت قائدین سے ربط قائم کرنا چاہئے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے!

سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انہیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انہیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیرِ انتظام اسکولوں میں انہیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں، پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کرلیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی

کے ساتھ آپ کی طرف راغب ہو جائیں گے، ایک ایسی قوم جو انسان تسلیم کئے جانے کے لئے جد و جہد کر رہی ہے، اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل جیتنے کے لئے کافی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایک ٹھکرائی ہوئی قوم کو سینہ سے لگائیں، اور انہیں محبت کی سوغات دیں، اس میں ہماری جان و مال کی حفاظت ہے، عزت و آبرو کا تحفظ ہے، سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے دعوت کے وسیع مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔

کاش ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!

اخبارات کی ایک خبر یقیناً پڑھنے والوں نے حیرت کی آنکھوں پڑھا ہوگا اور چشم تعجب سے اسے دیکھا ہوگا، اور وہ خبر ہے ایک ایسے شخص کے ایمان لانے کی جو نہ صرف بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا بلکہ مسجد شہید کرنے والے مجرمین کی قیادت کر رہا تھا، آپ بھی اس خبر کو ایک مقامی اخبار کی زبان میں پڑھیں:

> ۶ رڈسمبر ۱۹۹۲ء کو جب ایودھیا میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو اس گھناؤنے کام میں شیوسینکوں کی ٹولی پیش پیش تھی اور اس ٹولی نے مسجد کے گنبدوں پر چڑھ چڑھ کر انہیں شہید کیا تھا، شیو پرساد نامی ایک نوجوان جو کہ فیض آباد میں رہتا تھا، بجرنگ دل کی اس ٹولی کا سرغنہ تھا جسے مسجد کی شہادت کے کام کی نگرانی سونپی گئی تھی اور اس نے اس مقصد کے لئے ۴ر ہزار والینٹروں کو تربیت دی تھی، اس دن مسجد کے عالیشان میناروں کو دیکھ کر شیو پرساد نے ''رام رام'' کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن ۷رسال بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی اس شرمناک حرکت کے لئے معافی کا طلبگار ہے، ۷رسال بعد ۶ رڈسمبر ۱۹۹۹ء کو شیو پرساد بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی میں اپنی شمولیت پر نادم وشرمسار ہے اور اس نے اسلام قبول کرلیا ہے، شیو پرساد کا نیا اسلامی نام ''محمد مصطفیٰ'' ہے۔ ''ملیالم نیوز'' کے ۷رڈسمبر ۹۹ء کے شمارے میں شائع کردہ ایک خبر کے مطابق شیو پرساد کا باپ ٹی راما ناتھن سنگھ پریوار کے اہم کارکنوں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کا پورا خاندان بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا۔ مسجد کی شہادت کے فوری بعد سے

ہی شیو پرساد کو شدید بجرم ضمیری کا احساس ہونے لگا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں وہ شارجہ چلا گیا لیکن ملازمت میں بھی اس کا ذہن منتشر رہتا تھا۔ ۴؍دسمبر ۱۹۹۸ء کو جب کہ وہ شارجہ کی سڑکوں سے گذر رہا تھا، اس نے جمعہ کے دن ایک مسجد میں ہونے والے وعظ کے الفاظ سنے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کی تقریر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیام نے اس کے دل میں انقلاب برپا کر دیا اور جب اس نے مسلسل وعظ سننے شروع کیے تو اس کے دل کی کایا پلٹ ہوگئی، الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے اسے راہِ راست دکھادی اور اس نے گمراہی کو ترک کر کے سیدھا راستہ اختیار کر لیا ہے، جب شیو پرساد نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے خاندان والوں نے جو کہ آر ایس ایس کے کٹر حامی ہیں، اسے خاندان سے خارج کر دیا لیکن اس کے باوجود شیو پرساد کی دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خاندان والوں کو بھی راہِ راست دکھادے، شیو پرساد کا کہنا ہے کہ اڈوانی اور اشوک سنگھل نے بابری مسجد کی شہادت کی کارروائی کی قیادت کی تھی اور شہادت کے دن پولیس اور سی آر پی ایف نے بی جے پی، آر ایس ایس اور بجرنگ دل قائدین سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اسے یاد ہے کہ اس دن اشوک سنگھل نے فوجی یونیفارم پہن رکھا تھا اور ہدایات دے رہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد انہوں نے فیض آباد کے مسلم علاقوں میں جا کر " جئے شری رام " کے نعرے لگائے تھے لیکن اب قرآن پاک کی ۱۷ سورتیں حفظ کر لینے کے بعد وہ ایک سچا اسلامی مبلغ بننے کا خواہاں ہے تا کہ گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لا سکے، انشاء اللہ اس کا ارادہ پورا ہوگا اور جن ہاتھوں نے بابری مسجد کو شہید کیا تھا، وہی اس کی دوبارہ تعمیر کریں گے۔"

یہ خبر بظاہر خلافِ توقع اور حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن جو لوگ اسلام کی تاریخ سے

آگاہ ہیں اور جنہوں نے خصوصیت سے اسلام کی دعوت واشاعت کی داستانیں پڑھی ہیں ان کے لئے یہ کوئی نئی اور تعجب خیز بات نہیں!

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں صدائے توحید بلند کی تو قریش نے کس شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی؟ اور پھر صلح حدیبیہ تک اس شدت میں کوئی کمی نہیں آئی لیکن صلح حدیبیہ جس میں بظاہر آپ ﷺ نے دب کر صلح فرمائی، نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے، اسلام کو سمجھنے اور مسلمانوں کے ماحول کو جاننے کا جو موقع فراہم کیا، اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں کی ظاہری شکست کو اسلام کی فتح مبین میں تبدیل کر دیا اور جن دلوں کو تلوار کے ذریعہ مسخر کرنا ممکن نہیں تھا اسلامی تعلیمات کی قوتِ تسخیر نے اس کو اپنا گرویدہ اور غلامِ بے دام بنالیا،

عرب کے پڑوس میں جو مملکتیں تھیں ان میں سب سے بڑی طاقت ایران تھی جو مشرکانہ فکر واعتقاد کی نمائندہ تھی اور اس لئے اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت گویا ان کی گھٹی میں تھی، لیکن یہ اسلام کی کشش ہی تھی کہ نہ صرف اہلِ ایران نے اسلام قبول کیا بلکہ یہی ایران کا علاقہ ہے جس نے علومِ اسلامی کی جمع وتدوین اور حفاظت کا فریضہ انجام دیا، یہاں سے ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں جو پوری دنیا میں علوم اسلامی کی سب سے مستند ومعتبر ترجمان ونقیب سمجھی گئیں، اور جن کے سامنے عربوں نے بھی سر احترام خم کیا۔

اس سلسلہ کا سب سے اہم تاریخی واقعہ تاتاریوں کے قبول اسلام کا واقعہ ہے، یہ ایسی وحشی قوم تھی کہ جیسے انسان راہ کے سنگریزوں کو روندتا ہوا گذر جاتا ہے، اسی طرح اس قوم نے انسانوں کو روندتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھائے اور عالم اسلام کو ایسا پامال کیا کہ دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کیا اور بغداد جیسا شاد وآباد اور بارونق شہر ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا، یہاں تک کہ خود خلیفۃ المسلمین مستعصم باللہ گرفتار کئے گئے، اور انہیں لاتوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے مار مار کر ختم کر دیا گیا، پھر اس آفت بداماں آندھی نے شام کا رخ کیا اور دیکھتے ہی

دیکھتے یہی حشر شام میں بھی ہوا اور مسلمانوں پر ایسی قیامت ٹوٹی کہ ان صدمات اور مظالم کے بیان میں مبالغہ کے خوگر شعراء بھی الفاظ کے تنگئ داماں کی شکایت کرنے پر مجبور ہوئے، کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وحشی، ستم شعار اور مسلمانوں کی بدترین دشمن قوم کبھی مسخر بھی ہوسکے گی؟؟

لیکن تاریخ میں اس سے زیادہ غیر متوقع اور ناقابل قیاس شاید ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو، کہ اسلامی مملکت کے اس عظیم فاتح نے اسلام کے ہاتھوں شکست کھائی، اور زمین کی سلطنت کو زیر کرنے کے بعد اپنی فکر و نظر اور دل و نگاہ کی سلطنت اسلام کے حوالہ کر دی، چنگیز خاں کے چار بیٹوں کی الگ الگ مملکتیں قائم ہوئیں، اور ایک صدی کے اندر پوری قوم دامنِ اسلام کے اندر آ گئی، اس میں سب سے دلچسپ اور عبرت خیز واقعہ تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷ء-۱۳۶۳ء) کے قبول اسلام کا ہے، یہ کاشغر کا ولی عہد شہزادہ تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ شکار کے لئے نکلا، شکارگاہ میں کسی اور کے آنے کی ممانعت تھی، اتفاق سے شیخ جمال الدین نامی بزرگ نادانستہ اپنے رفقاء کے ساتھ اس ممنوعہ علاقہ میں آ گئے، شہزادہ نے اس جرم میں ان سبھوں کو مشکیں کسوا کر طلب کیا، شہزادہ کے ساتھ اس کا شکاری کتا بھی تھا، اس نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ سے پوچھا کہ تم بہتر ہو یا یہ بہتر ہے؟ شیخ نے جواب دیا: اگر میں ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ بہتر، شیخ کا یہ جواب تیر کی طرح بادشاہ کے دل میں چبھ گیا اور شکار کرنے والا خود شکار ہو گیا۔

اس نے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ شیخ نے نہایت ہی دل نشیں پیرایہ میں ایمان کی حقیقت سمجھائی اور ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کے مصداق تغلق پر شیخ کی بات کا گہرا اثر ہوا، اس نے خواہش کی کہ جب اس کی تخت نشینی عمل میں آجائے تو وہ اس کے پاس آئیں اور اس سلسلے میں گفتگو کریں، اس واقعہ پر ایک عرصہ گذر گیا یہاں تک کہ شیخ بیمار پڑے اور ان کی وفات کا وقت آ پہونچا، اپنی موت کے قریب شیخ نے اپنے صاحبزادے شیخ رشید الدین سے فرمایا کہ وقت آئے گا کہ تغلق تیمور تخت شاہی پر متمکن ہوگا

اس وقت تم ان کے پاس جانا اور انہوں نے مجھ کو جو وقت دیا تھا، یاد دلاتے ہوئے ان پر ایمان پیش کرنا، تغلق کے بادشاہ بننے کے بعد شیخ رشید الدین نے بادشاہ سے ملاقات کی بڑی کوشش کی، لیکن مسلمان اس وقت اتنے حقیر اور بے وزن تصور کئے جاتے تھے کہ کسی طور ایوان شاہی تک رسائی حاصل نہیں ہو پاتی تھی، آخر شیخ رشید الدین نے اس کے لئے ایک انوکھی تدبیر سوچی اور ایک دن شاہی خیمہ کے سامنے ٹھیک فجر کے وقت اذان دینی شروع کر دی، بادشاہ کی نیند میں خلل ہوا اور اس نے غضبناک ہو کر شیخ رشید الدین کو طلب کیا، شیخ آئے اور انہوں نے اپنے والد کا پیغام پہونچایا، بادشاہ کو اپنا پرانا وعدہ یاد آیا اور وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، پھر اس نے اپنی رعایا کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اس طرح چنگیزی سلطنت کا وہ حصہ جو چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد کے زیر تسلط تھا پورا کا پورا مسلمان ہو گیا، اقبال نے اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانہ سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانہ سے

کعبۂ اسلام میں دشمنوں کو جان نثار اور خون آشاموں کو اپنا فدا کار بنانے کی جو صلاحیت پہلے تھی، وہ اب بھی ہے، اور ''شیو پرشاد'' کا اسلام قبول کرنا اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے!

جمہوریت نے یقیناً مذہبی رواداری کا مزاج پیدا کیا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا سابقہ ایسی قوموں سے رہا جو کلمۂ حق سننے کے بھی روادار نہ تھے اور جب کوئی شخص یا قوم کسی بات کو سننے ہی کو تیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا اس سے متاثر ہونا اور اس دعوت کا قبول کرنا دشوار ہوتا ہے۔ آج یقیناً دین حق کی دعوت کے مواقع پہلے سے کہیں بڑھ کر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم میں آج شیخ جمال الدین اور شیخ رشید الدین موجود نہیں ہیں، تیرگیٔ شب کی آغوش سے سورج طلوع ہوتا ہے اور جب جھلسا دینے والی گرمی زمین کو جلا کر رکھ دیتی ہے تو رحمت کی گھٹائیں زمین پر نثار ہوتی ہیں، اسی طرح جب کسی قوم میں اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور نفرت کے شعلے

پوری طرح بھڑک اٹھتے نہیں تو اسی عداوت کی تاریکی سے محبت کی صبح طلوع ہوتی ہے اور نفرت کی خاکستر سے ایمان کے چشمے پھوٹتے ہیں، اس لئے مایوسی کی نہیں بلکہ خود احتسابی کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہم نے خیر امت کی حیثیت سے اپنا فریضہ ادا کیا ہے؟......

کاش! وقت کی چنگیزی طاقتوں کے مقابلہ کے لئے ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!!

(۲۳؍جون ۲۰۰۰ء)

نہایت اہم کام

۱۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے منصف میں آخری صفحہ پر ایک ایسی خبر شائع ہوئی ہے، جس نے یقیناً ہر اس شخص کو مسرور و شاد کام کیا ہوگا جو اپنے دل میں ایمان و یقین کی کوئی چنگاری رکھتا ہو، یہ خبر ہے جیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر ۷۶ سالہ ''مسٹر نڈم پلی وینکٹ بالا سبرامنیادت'' کے مشرف بہ اسلام ہونے اور ''محمد اسماعیل'' بن جانے کی۔ جناب دت کا تعلق برہمن گھرانے سے ہے۔ World University of Tuscon امریکہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، وہ اپنے نومسلم فرزند محمد نظیف (سابق نام: نڈم پلی راجہ راما) کی ترغیب پر ایمان لائے ہیں، جناب نظیف علی کو ایک سال پہلے ہی ایمان سے سرفراز ہوئے ہیں، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے مدتوں تلاش حق کا سفر کیا اور آخر انسانیت کے نام اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتابِ ہدایت'' قرآن مجید'' نے ان کو اس نعمت سے ہمکنار کیا، جس کے لئے ان کی روح بے تاب تھی۔

بھلے ہی اخبارات اور ذرائع ابلاغ کے لئے یہ معمولی خبر ہو، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک اہم واقعہ اور خدا کا ایک زندہ پیغام ہے، یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیشہ نا اُمیدیوں کی شب تاریک سے صبح اُمید طلوع ہوتی ہے، ملک کے سیاسی اُفق پر گو فرقہ پرستی کی گھٹا چھائی جارہی ہے، لیکن دلوں کی دنیا پر جھوٹے بازی گروں کی حکمرانی نہیں، اب بھی اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حقیقت پسند اور سچائی کے پرستار ہیں، محض ایک دستک ان کے دلوں کے بند دروازے کو کھول سکتی ہے اور قلب ونظر کی دُنیا کو فتح کر سکتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس

کے اندر نئے افکار و نظریات اور عقائد و تصورات کو قبول کرنے کی خاص صلاحیت ہے، اسی لئے بودھ مت، جین مت اور ہندو مت اسی ملک میں پیدا ہوا اور یہیں اس نے فروغ پایا، پارسی مذہب نے بھی ہندوستان کے سایہ میں اپنے آپ کو باقی رکھا ہے، ورنہ بظاہر اس کو اپنا وجود کھو دینا چاہئے تھا، سکھ مت کو اگر مستقل مذہب سمجھا جائے تو اس نے بھی ہندوستان ہی میں آنکھیں کھولیں اور یہیں پروان چڑھا، عرب سے چند ہزار مسلمان ہی سندھ کے ساحل پر اُترے تھے، ہندوستان نے اس دینِ حق کا بھی استقبال کیا اور اس کو اپنی چشم اعتقاد کا سرمہ بنایا، آج برصغیر میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، وہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس ملک نے کبھی بھی دعوتِ حق کو قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

اسلام اور اسلام کے اولین مرکز جزیرۃ العرب سے ہندوستان کا قدیم تعلق رہا ہے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں تیغ و شمشیر کے جلو میں آئے اور ان کی اصل دلچسپی دلوں کی کشور کشائی کے بجائے زر و زمین کو فتح کرنے سے تھی، لیکن یہ صحیح نہیں، عرب اور افغان مسلمان حکمراں یقیناً یہاں درۂ خیبر کی راہ سے آئے، لیکن اسلام اس ملک میں ساحلی علاقوں کے ذریعہ پہنچا اور اس نے یہ سفر فوجیوں اور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ طے کیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق اسلام سب سے پہلے عرب تاجروں کے ذریعہ جزیرۂ سرندیپ میں پہنچا اور مسلمان تاجروں سے متاثر ہو کر سرندیپ کا راجہ ۴۰ھ میں مشرف بہ اسلام ہوا، مشہور سیاح ''بزرگ بن شہریار ناخدا'' کا بیان ہے کہ راجہ سرندیپ کو کسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کا علم ہوا اور اس نے باضابطہ اپنا نمائندہ تحقیق حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس زمانہ میں سفر آج کی طرح آسان نہ تھا، راجہ کی فرستادہ کو مدینہ پہنچنے میں اتنی مدت لگ گئی کہ وہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پہنچا اور حضرت عمرؓ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا دوسرا راستہ، جزیرۂ مالدیپ، ہے۔ یہاں ہر مہینہ

سمندر سے ایک بلا آتی تھی، لوگ اس سے بچنے کے لئے ایک کنواری لڑکی کو بنا سنوار کر ساحلِ سمندر کے ایک بت خانہ میں چھوڑ آتے تھے، لیکن مراقش کے ایک شیخ ابوالبرکات بربری جو اتفاق سے یہاں آگئے تھے، کی دعاء سے یہ بلا ٹل گئی، وہاں کا راجہ اس سے بہت متاثر ہوا اور خود راجہ (جس کا نام شنوارزہ تھا)، اور اس کی رعایا شیخ کے ہاتھ پر ایمان لے آئی۔ اس طرح مالابار، کورومنڈل اور گجرات کے بعض علاقے ہیں جہاں مسلمان داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہنچی اور اس نے اپنی انسانیت دوستی، انصاف پر مبنی تعلیمات اور حقیقت پسندانہ نظریات کی بنا پر لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش کیا۔

مسلمان مجاہدین نے بھی جو بیک وقت میدانِ جنگ کے سپاہی بھی ہوتے تھے اور دردمند داعی اور مبلغ بھی، شروع ہی سے ہندوستان پر اپنی نگاہ رکھی، پیغمبر اسلام ﷺ کے وصال کے پانچ سال بعد یعنی ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ نے بحرین اور عمان کے علاقہ پر عثمان بن ابی العاص ثقفی کو گورنر مقرر فرمایا، انہوں نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کا ذمہ دار مقرر کر کے ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا، حکم نے کشتیوں کے ذریعہ دریائی سفر کی کٹھن منزلیں طے کیں اور ساحل گجرات پر قدم رکھا، اس فوج میں یقیناً بہت سے صحابہ بھی شریک تھے، جو شہادت سے سرخرو ہوئے اور بقول مولانا عبدالحی حسنیؒ یقیناً ممبئی اور بھروچ کے گردونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا، پھر حکم نے بھروچ پر حملہ کیا۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے خشکی کے راستہ سے سندھ پر قبضہ کیا، اس طرح گویا عہد فاروقی ہی سے ہندوستان مسلمان مجاہدین کا مرکز توجہ رہا ہے۔

جہاں ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ متعدد صحابۂ کرام اور تابعین عالی مقام کی خواب گاہ ہے، وہیں ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی البصریؒ، جو تابعین میں ہیں اور فن حدیث کے پہلے مصنف بلکہ ''کشف الظنون'' کے مصنف کے بقول تاریخ اسلامی کے اولین صاحب تصنیف گزرے ہیں، عباسی خلیفہ مہدی کے عہد میں واردِ ہند ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہوگئے، اس ملک کی سعادت مندیوں اور خوش بختیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ ہندوستان

ہی کے ایک راجہ مہروگ کی خواہش پر ۲۷۰ھ میں ہندی زبان میں کیا گیا ہے

(عرب و ہند کے تعلقات: ۱۴۱)

ان تاریخی حقائق سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان پر اہل دین اور داعیان اسلام کی کیسی کچھ توجہ تھی؟ چنانچہ حضرت علی بن عثمان ہجو یریؒ (م ۴۶۵ھ)، خواجہ معین الدین اجمیریؒ (م ۶۲۷ھ) اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م ۶۳۳ھ) جیسے اہل دل اسی ملک میں خیمہ زن ہوئے، رشد و ہدایت کی محفلیں آراستہ کیں اور یہیں آسودۂ خواب ہوئے، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان پر جن مسلمان قبائل کو حکمرانی کا موقعہ ملا، وہ عرب نہیں تھے اور ان میں سے اکثر حکمراں وہ تھے جن کو اقتدار محبوب تھا اور اسلام سے ان کا تعلق بہت کمزور اور معمولی تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین حکمرانوں کو چھوڑ کر عام طور پر ان سلاطین نے اسلام کی دعوت و اشاعت اور تبلیغ و توسیع پر کوئی توجہ نہیں دی اور ایک ایسی سرزمین جو ہدایت کی محتاج تھی اور جس کو معمولی سعی و کاوش کے ذریعہ اسلام کی طرف لایا جاسکتا تھا، ایمان سے محروم رہی، اسلامی تاریخ میں مشرک ممالک میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمانوں نے وہاں کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی ہو اور اس کے باوجود اس ملک کی اکثریت اسلام کی نعمت سے محروم رہی ہو۔

ہمارے ملک کا موجودہ جمہوری نظام اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس میں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں، لیکن آج بھی ہم نے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی ہے، حالاں کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے اہم کام یہی ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ جن قوموں کو جنگ کے میدان میں سرخمیدہ نہیں کیا جاسکا اور ایوانِ سیاست میں جن پر غلبہ حاصل نہیں ہوا، دعوتِ اسلام نے ان کو فتح کیا اور اسلام نے ان کے دل و دماغ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنالیا، اس کی سب سے بڑی مثال خود حیات نبوی ﷺ ہے، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، صلح حدیبیہ کے موقع سے جو رفقاء آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد چودہ سو تھی، اس صلح نے امن و امان کی فضا فراہم کی اور آپ ﷺ کو کارِ دعوت کی طرف توجہ کا موقع ملا، اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے بعد جب فتح مکہ کے موقعہ سے آپ ﷺ تشریف لائے تو اس وقت آپ کے رفقاء کی تعداد دس ہزار سے بھی متجاوز تھی اور فتح مکہ کے دو سال بعد حجۃ الوداع میں جو صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز تھی۔ غرض ۶ ہجری میں جو تعداد چودہ سو تھی صرف چار سال کے عرصہ میں وہ ایک لاکھ سے بھی آگے بڑھ گئی۔ ظاہر ہے یہ دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام ہی کا کرشمہ تھا کہ جن لوگوں کو بدر واحد اور خندق وحنین میں فتح نہیں کیا جا سکا، اسلام کی دعوت نے ان کو غلام بے دام بنا دیا۔

آج بھی ہندوستان میں اور پوری دُنیا میں مسلمانوں کے مسائل کا اصل حل یہی ہے۔ یہ وقت کا سب سے اہم کام ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ آج بھی اگر اس سمت میں تھوڑی سی سعی کی جائے تو منزل کو پانا دشوار نہیں:

در مئے خانہ وا ہے، سب کے لئے
شرط لیکن وفا ہے، سب کے لئے

(۳۰/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اس آگ کو بجھایئے!

اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو آبادی کے تمام لوگ آگ بجھانے اور گھر کو بچانے دوڑ پڑتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ایک ساتھ دو بالٹی اٹھاتا ہے، کوئی ڈول دوڈول لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی لوٹا دولوٹا ہی پانی ڈال دیتا ہے، چھوٹے بڑے امیر غریب جوان بوڑھے اور مرد وعورت ہر شخص اپنی طاقت اس بلاءِ ناگہانی سے بچنے بچانے میں صرف کر دیتا ہے، کیوں کہ اگر آگ پھیلی تو صرف اسی گھر کا نقصان نہیں ہوگا جس گھر میں آگ لگی ہو، بلکہ یکے بعد دیگرے سارے گھر جلیں گے اور پوری بستی خاکستر ہو کر رہ جائے گی، آگ ایسی کور چشم اور عدم نا آشنا ہے کہ اس کی سرشت میں من وتو کا کوئی امتیاز ہی نہیں، نہ امیر کا خیال کرتی ہے نہ غریب پر رحم کھاتی ہے، نہ طاقت اور حکومت والوں سے ڈرتی ہے نہ بے قصور رعایا اور کمزوروں پر اسے ترس آتا ہے، ایک بلاء بے درماں ہے جو زد میں آتا ہے اسے جلا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر دریا پانی سے لبریز ہو اور پشتہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو، تو سارے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی طاقت بھر پشتہ کو مضبوط کرنے اور پانی کو تھامنے کی تدبیر کرتا ہے، کیونکہ پانی بھی آگ ہی کی طرح بے رحم اور بے حس واقع ہوا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، خوش رنگ پھلواریاں ہوں، ہرے بھرے کھیت ہوں، پر رونق آبادیاں ہوں، آبادی میں معصوم بچے رہتے ہوں، بے زبان جانور ہوں، بیمار اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے لوگ ہوں، اس کی تلاطم خیز موجیں کودتی پھاندتی، دوڑتی بھاگتی، ہر شئے کو غرقاب اور تہہ آب کرتی پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لئے آگ لگ جائے اور سیلاب آجائے تو ایک دوسرے سے

برسرپیکار دشمن بھی اپنی عداوتوں کو فراموش کر کے اس مصیبت کا سدِ باب کرنے کے لے یک جٹ ہو جاتے ہیں۔

یہ آگ اور پانی کی مصیبتیں وہ ہیں جو ہمیں مادی نقصان پہنچاتی ہیں، جن کی وجہ سے ہمارے در و دیوار ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن ایک اور آگ ہے جس کا نقصان اس نقصان سے بھی بڑھ کر ہے اور ایک سیلاب ہے جس کی تباہکاری اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہے، وہ ہے بُرائی اور بے حیائی کی آگ، جو انسانی آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی ہے اور وہ ہے منکرات اور فواحش کا سیلاب، جس کی زد سے کوئی پکا اور کچا مکان محفوظ نہیں ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس آگ اور سیلاب کو بجھانے اور تھامنے کی ہمارے اندر کوئی فکر نہیں، یہ آگ گھر گھر کو سلگا رہی ہے اور یہ سیلاب اخلاق و کردار کی عمارتوں کو زمیں بوس کرتا جارہا ہے، لیکن نہ اس پر بے چین ہونے والے دل ہیں، نہ اس پر رونے والی آنکھیں ہیں، نہ اس کے لئے جنبش میں آنے والے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ سماج کے بزرگوں کو اس کی فکر ہے نہ نوجوانوں میں اس کے مقابلہ کا عزم۔

بُرائی کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہے، اس کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ جس قوت سے بُرائی پھیل رہی ہے اسی قوت سے بلکہ اس سے بڑھ کر بُرائی کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں، اسی تدبیر کا نام قرآن مجید کی زبان میں ''نھی عن المنکر'' ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ امتِ محمدیہ کا ایک بنیادی مقصد نہی عن المنکر ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس کو اقوامِ عالم میں خیر امت یعنی بہترین انسانی گروہ کا لقب دیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۰) مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ''وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اس دوستی کا حق یوں ادا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔'' (التوبہ: ۷۱) بُرائی سے روکنے والوں کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۴) اور ارشاد ہوا کہ: ''کم سے کم ایک ایسا گروہ ہمیشہ ضرور رہنا چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہو، بھلائی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، کہ یہی لوگ در اصل کامیاب ہیں۔'' (آل عمران: ۱۰۴)

قرآن کی اس تعبیر پر بھی غور کیجئے کہ بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا گیا ہے، معروف کے اصل معنی ایسی بات کے ہیں جو لوگوں میں مروج اور مشہور ہو اور جس کا چلن قائم ہو گیا ہو، اس کے مقابلہ میں منکر کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جو ان پہچانی اور نامانوس ہو، گاہے گاہے پیش آجاتی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں نیکیوں کا عام چلن ہونا چاہئے، وہ سماج کا مروج اور مشہور عمل ہو اور برائی کو سماج میں اتنا کم ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کے لئے اچنبھے کا باعث ہو، خلافِ معمول کبھی یہ بات پیش آجاتی ہو۔

اس تعبیر سے نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب بُرائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۷) دل سے روکنے کا مطلب دو ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ دل سے اس پر کراہت محسوس کرے، دوسرے یہ کہ دل میں اس بات کا عزم رکھے کہ جب اسے قدرت حاصل ہوگی وہ اس بُرائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، ہاتھ سے روکنے کا منشا مار پیٹ اور جنگ و جدال ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے اثر و رُسوخ اور اخلاقی دباؤ کا استعمال کرنا بھی اس میں داخل ہے، جیسے انسان دنیا کے مسائل میں اپنے رُسوخ اور اپنی حیثیت کو کام میں لاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں اسے اس سے بڑھ کر اپنی اخلاقی قوت استعمال کرنا چاہئے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ جن چیزوں کا برائی اور منکر ہونا متفق علیہ ہے اور جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی عوام تو کیا، اہلِ علم اور اہلِ دین بھی کھلے تساہل سے کام لیتے ہیں، اس سے کس کو اختلاف ہوگا کہ گانا بجانا حرام ہے، شادی بیاہ میں مروجہ تصویر کشی اور ویڈیو گرافی جس میں عورتوں کی بھی تصویریں محفوظ کر لی جاتی ہیں، ناجائز ہیں، اس سے کسے اختلاف ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بے جا مطالبات حرام ہے اور رشوت کے حکم میں ہے، کون نہیں جانتا کہ سودی کاروبار پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

لعنت ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سماج کے با اثر لوگ جب علانیہ ان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان بگھارتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ ہماری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، بلکہ ہم خود ان تقریبات میں شریک ہو کر رونق محفل میں اضافہ کرتے ہیں، ہم خود حرام اور ناجائز کاروبار کرنے والوں کی اہتمام اور احتشام سے معمور دعوتوں میں شریک ہو کر عملاً اس برائی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث میں اسی لئے برائی سے روکنے کو زبان کا جہاد (جہاد باللسان) قرار دیا گیا ہے، (مسلم، حدیث نمبر:۱۷۹) کیوں کہ نیکی کی دعوت آسان ہے، اگر آپ کسی کو نماز روزہ کی دعوت دیں، حج و زکوٰۃ کے لئے توجہ دلائیں تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے، لیکن جب کسی انسان کو اس کی برائی پر ٹوکا جائے تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ بے جا ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بہت بڑا گناہ ہے (اکبر الذنب) ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم اللہ سے ڈرو، تو وہ جواب میں کہے: تم اپنی فکر کرو، **علیك نفسك** ۔

(مجمع الزوائد: ۷؍۲۷۱)

جو چیز برائی پر ٹوکنے اور اس سے روکنے میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں، ایک دنیا کی محبت، دوسرے اہل ثروت اور اہلِ اقتدار کا خوف، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم میں دنیا کی محبت گھر کر لے گی تو تم نہ نیکی کا حکم دو گے اور نہ برائی سے روکو گے، اور نہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو گے۔ (مجمع الزوائد: ۷؍۲۷۱) اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: خبردار! کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق جاننے کے باوجود حق کہنے سے باز نہ رکھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر:۲۰۰۸) یہ اس امت کے ادبار اور پستی کی علامت ہے کہ اس میں برائی پر ٹوکنے والی زبانیں باقی نہ رہیں، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دین کے اقبال کی علامت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں دین کا فہم ہو، اس میں ایک دو برے لوگ

ہوں تو وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور اس دین کے ادبار کی علامت یہ ہے کہ عام لوگ گناہ میں مبتلا ہو جائیں، اکادکا اشخاص دین پر قائم ہوں، وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور بات کریں تو مطعون ٹھہریں، یہاں تک کہ علانیہ شراب پی جائے، ایک عورت قوم پر سے گذرے، قوم میں سے ایک شخص اس کی طرف کھڑا ہو اور دامن اٹھا کر اس طرح برائی کرے جیسے کسی مادہ جانور کی دم اٹھا کر نر اس سے جفتی کرتا ہے، اس دن جو شخص یہ کہے کہ تم نے اس کو اس دیوار کے پیچھے تو کر لیا ہوتا، تو وہ اس دن اس میں ویسے ہی ہوگا جیسے تم میں ابوبکر وعمرؓ، اس دن جو نیکی کی طرف بلائے اور بُرائی سے روکے، اس کے لئے ایسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا جس نے مجھے دیکھا ہو، میری اطاعت کی، مجھ پر ایمان لایا ہو اور میرے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۶۲) بُرائی کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ شاید اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

بُرائی سے نہ روکنے کا گناہ صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ دنیا سے بھی متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے نہ روکیں، تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سبھوں کو پکڑ لے گا اور جس قوم میں گناہ کیا جاتا ہو، کچھ لوگ اس سے دور کرنے پر قادر ہوں، پھر بھی وہ اسے دور نہ کریں، تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۵۳۸، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۶۸) رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے قریب ایک لشکر کے زمین میں دھنسا دیئے جانے کا ذکر کیا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: شاید ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں زبردستی لایا گیا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب میں تو سب شامل ہوں گے، آخرت میں نیتوں کے اعتبار سے معاملہ ہوگا (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۷۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل میں اس طرح بُرائی کا آغاز ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو اس برائی پر ٹوکتا اور کہتا کہ یہ حلال نہیں اور کل ہو کر اسی کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم نشیں بن جاتا، چنانچہ یہی چیزیں بنی اسرائیل پر عذابِ الٰہی آنے کا باعث ہوئی۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۳۳۶) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے پوری قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے ، بلکہ جب کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور اکثریت قدرت کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام وخواص سبھوں کی ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، فذاك حين يأذن الله في هلاك العامة و الخاصة (مجمع الزوائد: ٢٦٨/٧)۔

یہ ضروری ہے کہ سماج کا ضمیر زندہ ہو، وہ بُرائی سے ایسی ہی نفرت کرتا ہو جیسے انسان گندگی سے نفرت کرتا ہے، سماج میں جب کوئی بُرائی ہو تو کتنی زبانیں ہوں جو اس پر ٹوکنے کے لئے آمادہ ہوں، جب ایک ہاتھ ظلم کرے تو سینکڑوں ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، جب کوئی نگاہ بُرائی کرے تو کتنی ہی غضب آلود نگاہیں اس کے حوصلے پست کردیں، خدا کی نافرمانی پر انسان کو اپنی نافرمانی سے زیادہ طیش آئے، اپنے بھائی پر جب کوئی ظلم ہوتا ہوا دیکھے تو اسے محسوس ہو کہ یہ ظلم خاص اس پر ہو رہا ہے، جب وہ کسی آبرو کو لٹتے ہوئے دیکھے تو اسے خیال ہو کہ یہ عزت و آبرو کی مقتول عورت اس کی بہن یا بیٹی ہے، برائیوں کے بارے میں جب تک ضمیر زندہ نہ ہو حدود اللہ کی اہمیت انسان کے ذہن میں نہ ہو اور خدا کے خوف سے ہمارے سینے معمور نہ ہوں اس وقت تک برائیوں کے اس سیلاب کو تھامنا، بے حیائی کی اس آگ کو بجھانا اور بداخلاقی کی اس تیز آندھی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

......اور اب تبلیغی جماعت بھی

دہلی کے جنوب میں راجپوت نومسلموں کی ایک قدیم آبادی تھی، یہ میو کہلاتے تھے، اور اسی مناسبت سے یہ علاقہ میوات کہلاتا تھا، شجاعت و بہادری اور جنگ جویانہ صلاحیت متوارثا ان کے رگ و ریشہ میں سرایت تھی، مسلمانوں کے عہد حکومت میں دارالسلطنت دہلی پر آئے دن ان کی طرف سے لوٹ مار ہوتی رہتی تھی، اور حکومتوں کو گاہے گاہے ان کی سرکوبی کے لئے باضابطہ فوج کشی کرنی پڑتی تھی، غالباً اسی وحشت و جہالت کی وجہ سے یہ ایک فراموش کردہ گروہ تھا، جو ایمان اور کفر کے درمیان زندگی گذار رہا تھا، عیدین، محرم، شب براءت اگر ان کے مسلمان ہونے کی پہچان تھی، تو دسہرہ، دیوالی، جنم اشٹمی اور ہولی بھی وہ کم جوش و خروش سے نہیں مناتے تھے، وہ برہمن سے شادیوں کے لئے تاریخ لیتے اور برہمن اور قاضی دونوں کے اشتراک سے رسم نکاح انجام دیتے، دھوتی مردوں کا عام لباس تھا، اور مسجدیں ان کی آبادیوں میں خال خال ہوتی تھیں، وہ بھی نمازیوں کے لئے مرثیہ خواں۔

اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ کی اصلاح کا ایک غیبی نظام پیدا فرمایا کہ بستی نظام الدین دہلی میں (جو اس زمانہ میں گویا میوات کی سرحد تھی) ایک بزرگ مولانا محمد اسماعیلؒ قیام پذیر ہوئے، انہوں نے اس بھلائے اور ٹھکرائے ہوئے علاقہ کو اپنی کوششوں کی آماجگاہ بنایا، اور انہوں نے یہی ایک مکتب قائم کیا، وہاں میوات سے دینی تعلیم کے لئے بچوں کو لانے لگے اور اس علاقہ میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع کیا، اس طرح میواتیوں میں محبت کی چنگاری جل اٹھی، انہوں نے سوچا کہ یہ کون ہے جو ٹھکرائے ہوؤں کو گلے لگاتا ہے! اور اس

طرح اس سرکش قوم کا ایک گروہ بارگاہ اسماعیلی میں سرخمیدہ ہونے لگا، مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے بعد ان کے بڑے فرزند مولانا محمد صاحبؒ نے اس جگہ کو سنبھالا، اور اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا، محبت کی جو تخم بوئی گئی تھی، اس کی جڑیں کچھ اور مضبوط ہوئیں، مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد ایک ایسے شخص نے اس مسند کو سنبھالا جو محبت کا سوداگر تھا، جس کے رگ و ریشہ میں امت کا پیار سمایا ہوا تھا، جس کا دل دردمند ہر لحہ امت کے لے تڑپتا اور پھڑکتا رہتا تھا، اور جس کی آنکھیں انسانیت کے غم میں شب و روز آنسوؤں سے وضو کیا کرتی تھیں، جس کی زبان لکنت زدہ تھی، لیکن اخلاص و ایمان کی حرارت اور دردِ دل کی گھلاوٹ کی وجہ سے وہ لوہے کو موم اور شعلہ کو شبنم بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی، وہ شخصیت تھی مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی، جو مولانا محمد اسماعیل کے صاحبزادے اور مولانا محمد کے برادرِ خورد تھے۔

وہ اس وقت مظاہر علوم سہارن پور میں اچھے خاصے، کامیاب اور مقبول مدرس تھے، اور ہر طرح کے بارِ غم سے آزاد، لیکن خدا نے جس کو غم سہنے اور غم اٹھانے کے لئے پیدا کیا ہو وہ کیوں کر اس بوجھ سے آزاد رہ سکتا ہے؟ میواتیوں کی فکر اور ان کی بے دینی کا غم مولانا کو سہارن پور سے میوات لایا، اس وقت مولانا کے پاس سرمایہ زندگی کچھ بھی نہ تھا، البتہ اللہ پر توکل کی متاعِ گراں مایہ ساتھ تھی، اور بارہا ایسا بھی ہوتا تھا، کہ آپ فاقہ مستی کی لذتوں سے اپنے آپ کو شادکام فرماتے تھے، میوات میں مدارس کے لئے مالی وسائل فراہم کرنا تو دور کی بات ہے، لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے بھی روادار نہیں تھے، ان حالات میں آپ نے گاؤں گاؤں قیام مکاتب کی تحریک چلائی، اور بے شمار مکتب قائم فرمائے، لیکن میوات میں جہالت و بد دینی کا جو طوفان تھا، مکاتب کے یہ کمزور دیئے ان کو روکنے میں چنداں مؤثر ثابت نہیں ہوئے، اور مولانا کی بے قراری بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ جب ایک مکتب کا حافظ جذبۂ مسرت و افتخار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، اور آپ نے دیکھا کہ اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہے، اور وضع قطع میں کہیں مسلمانیت کا کوئی رنگ نہیں، تو آپ اور بے چین ہو گئے، اور اس نے امت کے اسیرِ غم کو اور بھی گھلانا شروع کر دیا۔

یہاں تک کہ شوال ۱۳۴۴ھ میں دوسری بار حج کے لئے روانہ ہوئے، جب مدینہ سے واپسی کا وقت آیا تو مولانا پر ایک عجب اضطرابی کیفیت طاری تھی، ایسی کہ جیسے ایک غلام نے طئے کرلیا ہو کہ اپنے آقا سے دامن مراد بھرے بغیر چوکھٹ چھوڑے گا نہیں، یہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں دعوت واصلاح کا وہ طریقہ ڈالا جو آج تبلیغی تحریک کے نام سے معروف ہے، مولانا کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے، تمہیں ہندوستان واپس جانا چاہئے، ۲۹ رذی قعدہ ۱۳۴۸ھ کو جامع مسجد سہان پور میں مولانا نے اس سلسلہ کا پہلا خطاب فرمایا، دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے افراد کی تشکیل کی، پھر انہی دِنوں میں دعوت کے اصول مقرر فرمائے، ابتداء میں آپ نے دعوت کے مضمون کو اتنی وسعت دی تھی کہ وہ ۶۰ رتک پہونچ گئے، لیکن ظاہر ہے کہ مولانا جس طرح امت کے ہر طبقہ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، ان کے لئے احکام دین کی اتنی طویل فہرست کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا، اس لئے تجربہ سے مختصر کرتے ہوئے، مولانا نے اس تحریک کو چھ نکات پر مرتکز فرمادیا، ایمان، اخلاص، نماز، ذکر، علم، اور اکرام مسلم، یہ ایسی باتیں ہیں، جن پر امت کے تمام طبقات کا اتفاق ہے، اور جس سے کسی مسلمان کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں، یہ گویا امت کے لئے کلمہ سواء کا درجہ رکھتا ہے۔

قدرت نے انسان کو پانی فراہم کرنے کے دو ذرائع رکھے ہیں، ایک کنواں، اور دریا جہاں پیاسے خود پہنچتے ہیں، دوسرے بادل جو پانی کی کشکول اٹھائے، در در کا چکر لگاتا ہے، اور خود پیاسوں کو پانی پہونچاتا ہے، مولانا چاہتے تھے کہ جیسے مدارس اور خانقاہیں، علم و اصلاح کے سرچشمے اور سمندر ہیں ویسے ہی علم کا ایک بادل بھی اٹھے اور وہ بے طلبوں تک دین کا آبِ حیات پہونچائے، کہ انبیاء کے یہاں اشاعت دین کے یہ دونوں طریقے موجود تھے، ایک طرف لوگ دار ارقم (مکہ) اور صفہ (مدینہ) پہونچ کر انوار نبوت سے اپنے سینے معمور کرتے تھے، تو دوسری طرف مکہ کی گلیوں، طائف کے بازاروں اور عرب کے دور دراز قبیلوں تک خود آفتاب نبوت پہونچتا تھا، اور جو لوگ نورِ حقیقت سے نا آشنا تھے، ان میں اس کی طلب پیدا کرتا تھا۔

مولانا کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ دعوت الی اللہ کا جو نہج رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا، وہی سادہ طریقہ مفید و کارآمد ہے، اس لئے سادگی اور رسمیات سے آزاد ہو کر کام کرنے اور اللہ کے سامنے رونے دھونے، گڑگڑانے، مانگنے اور تڑپنے، التجا کا ہاتھ پھیلانے اور رات کی تنہائیوں کو نالۂ نیم شبی اور آہ سحرگاہی سے آباد رکھنے کے ذریعہ ہی اس کام کو تقویت حاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ اسی طریقہ و نہج پر مولانا نے اس تحریک کو شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک امت کے غم میں گھلتے، اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے فکرمند رہے، اور اسی کے برگ و بار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ۲۱؍رجب ۱۳۶۳ھ شنبہ کو ٹھیک اذان فجر کے وقت جب صبح صادق طلوع ہو رہا تھا، اصلاح امت کی فکر میں اپنے سینہ کو جلانے والا یہ چراغ بجھ گیا اور تحریک کے بزرگوں کے مشورہ سے آپ کے فرزند ارجمند، داعی الی اللہ مولانا محمد یوسف صاحب کو آپ کا جانشیں منتخب کیا گیا، اور آپ کا عمامہ بزرگوں کے ہاتھوں مولانا یوسف صاحب کے زیب سر ہوا۔

مولانا یوسف صاحب کو ابتداء کار دعوت سے کچھ زیادہ اشتغال نہیں تھا، لیکن اپنے والد ماجد کی آخری زندگی میں اس طرف توجہ ہوئی، پھر تو وہ اس تحریک کے لئے یوسف مصر بن کر درخشاں ہوئے، اور ان کے روئے عالمتاب سے مشرق و مغرب تک اس تحریک کی روشنی پہونچی، ۲۹؍ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ کو ایک دعوتی سفر کے دوران آپ کی وفات ہوئی، مولانا کو امت کا درد اور ان کی فکر والد ماجد سے بکمال و تمام میراث میں ملی تھی، انہیں کم مدت ملی، لیکن، اس پوری مدت وہ ایک ''سکوں نہ آشنا پارہ'' کی طرح تڑپتے، اور میکدۂ عشق کے دیوانوں کو تڑپاتے، اگر مولانا الیاس صاحب کو لکنت موسیٰ سے نسبت حاصل تھی تو مولانا محمد یوسف صاحب نے بلاغت ہارون سے حصہ پایا تھا، اور ان کا خطاب دلوں کی دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتا تھا، مولانا نے اپنے آخری خطاب میں جو فکر انگیز باتیں فرمائی، ان سے بالکل صرف نظر کر کے گذر جانا طبیعت کو گوارہ نہیں، آپ نے فرمایا:

امت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والے کا نام نہیں،
بلکہ سینکڑوں، ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر امت بنتی ہے، جو کوئی

کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے، وہ امت کو ذبح کرتا ہے، اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اور حضور ﷺ اور صحابہ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے، امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پہلے خود ہم نے ذبح کیا، یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا، اگر مسلمان اب بھی امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کرسکیں گی، ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کرسکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم! ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچاسکیں گی۔ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی، امت میل ملاپ اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی، بلکہ جب بنے دوسروں کے لئے اپنا حق اپنا مفاد قربان کیا جائے گا، حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ وعمر ؓ نے اپنا سب کچھ قربان کرکے اپنے اوپر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا۔

(سوانح مولانا انعام الحسنؒ: ۱/۱۵۰)

غور کیجئے! اور ان الفاظ میں جھانکئے کہ ان کے ہر بُن مو سے امت کی محبت کا کیسا جذبۂ بے پایاں ظاہر ہوتا ہے!

مولانا کی وفات کے بعد مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ اس تحریک کے تیسرے امیر منتخب ہوئے، مولانا نہ صرف اس قافلہ کے اولین شرکاء میں تھے، بلکہ وہ مولانا الیاس صاحب کے وقت سے ہی گویا اس تحریک کے دماغ تھے، جنہوں نے مولانا عبید اللہ بلیاویؒ مولانا محمد عمر پالنپوریؒ اور دوسرے رفقاء کے ساتھ اس تحریک کو دنیا کے کونے کونے تک پہونچایا، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے عہد میں یہ تحریک دنیا کی سب سے وسیع الاثر تحریک بن گئی، اور اب شاید ہی کوئی ملک ہو جو اس کے فیض سے محروم ہو، ۱۰/محرم ۱۴۱۶ھ کو مولانا کا انتقال ہو گیا، اور اب تحریک نے اجتماعی قیادت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے

تحریک کے تین آزمودہ کار شخصیتوں کو اس کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے منتخب کیا، ان میں سے مولانا اظہار الحسن صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، اور اب دو جواں سال اور جواں حوصلہ ذمہ دار مولانا محمد سعد صاحب اور مولانا محمد زبیر صاحب اس عالمگیر تحریک کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے حوصلہ وہمت اور تدبر وفراست میں اضافہ فرمائے، اور اس سفینہ کو ساحل مراد سے ہم کنار رکھے۔

تبلیغی جماعت نے ہمیشہ سے اپنی یہ پالیسی رکھی ہے کہ پارلیمانی اور غیر پارلیمانی سیاست سے دور رہتے ہوئے خالص مذہبی امور کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے، اللہ کے بندوں کو اللہ کے گھر تک لایا جائے، ان میں خوف آخرت کے تحت عمل کا جذبہ ابھارا جائے، اسی لئے اس جماعت کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہاں آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے کی باتیں ہوتی ہیں، لیکن اب ہندوستان کی فرقہ پرست تنظیموں کو اس غیر سیاسی، شور اور شورش سے دور، خالص مذہبی جماعت میں بھی دہشت گردی کی بو آنے لگی ہے، ڈھاکہ، رائی ونڈ اور بھوپال کے اجتماع کو بنیاد پرستی کی جڑ قرار دیا جارہا ہے، اگر پروین تو گاڑیہ اور اشوک سنگھل جیسے اسیران نفرت ایسی بات کہیں تو کیا تعجب کہ چند ماہ پہلے کلدیپ نیر جیسے سیکولر خیال کئے جانے والے صحافی کے قلم سے بھی ایسی بے سروپا باتیں اخبارات میں آئیں، نہ معلوم ان حقیقت ناشناس اور سچائی سے عداوت رکھنے والے صحافیوں کے تیغ قلم سے کتنی سچائیوں کا خون ہوگا، اور اس خون ناحق سے جھوٹ اور نفرت کی کھیتی بارآور کی جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جس کا مقصد ایک ایسی تحریک کو نقصان پہونچانا ہے جو پر رونق شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریوں، دیہاتوں، اور کم آباد صحراؤں اور جنگلوں تک دین کو پہونچانے اور مسلمانوں میں اپنا مذہبی شناخت پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہے اور آج اس کا نفع ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر جگہ سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، میں دین کے تمام کاموں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مختلف تنظیموں اور تحریکوں کے کاموں کو اختلاف کار کے بجائے تقسیم کار خیال کرتا ہوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ

دعوت وتبلیغ کی یہ تحریک جتنی دور رس اثر کی حامل ہے، اور جتنی انقلاب خیز اور اثر انگیز اور طریقہ کار کے اعتبار سے سادہ اور آسان ہے اور جس طرح قدم قدم پر خدا سے لولگانے کا عادی بناتی ہے، وہ ایک نمونہ ہے، ایسا نہ ہو کہ اعداء اسلام کو مسلمانوں کے باہمی اختلاف بلکہ غلط فہمیوں سے فائدہ اٹھا کر امت کے اچھے کاموں کو نقصان پہونچانے کا موقع ملے، حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے، کہ مسلمانوں کا ایک گروہ باران حق کا امین اور سحاب رحمت بن کر بے طلبوں تک پہونچے اور ان میں طلب اور پیاس پیدا کرے اور یہ تحریک عملاً اس وقت اس کام کو انجام دے رہی ہے۔

(۳۰/۸/۲۰۰۲ء)

وقت کا جہاد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (الانفال:۶۰)

''اور جہاں تک ممکن ہو دشمنانِ اسلام کے مقابلہ کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے دشمنوں کو خائف کرسکو، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کے راستہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کو ناپسند کیا ہے، کہ وہ غفلت اور بے خبری کی زندگی بسر کریں۔ پھر قرآن نے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ دشمن کے مقابلہ اپنی بھرپور طاقت کو مجتمع رکھنا چاہیے، اس میں ایسی تعبیر اختیار نہیں کی گئی جس سے صراحتاً عسکری وفوجی قوت ہی مراد ہو، قوت میں عسکری اور غیر عسکری، مادّی اور معنوی ہر طرح کی قوت شامل ہے، البتہ آگے جنگی گھوڑوں سے خاص فوجی طاقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اس کی مخاطب ہیں جو دشمنوں سے برسرپیکار ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی بیان فرمایا کہ اس طاقت کا مقصود دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا اور دنیا کے امن و

آشتی پر غارت گری کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد دشمن کی حریصانہ نظر کو خوف زدہ کرنا اور ان کے جارحانہ حوصلہ کو توڑنا ہے۔ اسی کو قرآن نے تُرْهِبُوْنَ بِهٖ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایسی طاقت جو دشمن کو مرعوب کرنے والی ہو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، جس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ طاقت کی تیاری (اعدادِ قوت) میں سرمایہ اور مالی تعاون کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے جو کچھ خرچ کیا جائے، وہ اللہ کے راستہ ہی میں خرچ کرنا ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قیامت تک انسانیت کے لیے رہبر و رہنما ہے، اسی لیے قرآن میں ایسی تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں جو ہر دَور کا ساتھ دے سکیں اور ہر زمانہ کے وسائل پر ان کی تطبیق آسان ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں قوت مہیا رکھنے کی بات بہت ہی معنی خیز اور قابلِ توجہ ہے۔ ہر دَور میں طاقت کا ایک ہی سبب نہیں ہوتا، بلکہ مختلف ادوار میں آلاتِ قوت اور اسبابِ طاقت جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں ایک بہت بڑی طاقت ذرائع ابلاغ ہیں۔ ذرائع ابلاغ کسی گروہ کو بامِ اقتدار پر پہنچاتا بھی ہے، اور تختۂ دار پر لٹکاتا بھی ہے، وہ چاہے تو بے قصوروں کو جرم کے کٹہرے میں کھڑا کردے اور چاہے تو مجرموں کو معصوم و بے گناہ بنادے، سماج کا دل و دماغ ذریعۂ ابلاغ کی مٹھیوں میں ہے، اس لیے میڈیا اس دَور کی بہت بڑی طاقت ہے، اور یقیناً "اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" میں شامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے، تو آپؐ نے اس کے اعلان اور ایمان کی دعوتِ عام کے لیے خاص طور پر صفا کی چوٹی کا انتخاب فرمایا۔ یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ اہل مکہ کا طریقہ تھا کہ جب بھی کسی اہم بات کی خبر دینی ہوتی، صفا کی چوٹیوں پر چڑھ کر آواز لگاتے، یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، جس سے لوگوں کو باخبر کرنا مقصود ہے، اس لیے تمام اہل مکہ اہتمام کے ساتھ جمع ہوجاتے اور گوش برآواز ہوکر اس اعلان کو سنتے، گویا یہ اس زمانہ میں مکہ کا سب سے بڑا ذریعۂ ابلاغ تھا۔ جس طرح آج پورے شہر تک کسی خبر کو پہنچانے کے لیے اخبارات کا سہارا

لیا جاتا ہے اور اس میں اشتہارات شائع کرائے جاتے ہیں، اسی طرح اس دور میں صفا کی پہاڑی سے اعلان کئے جاتے تھے۔

سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر بھی دعوتِ اسلام کا کام کیا کرتے تھے، حالانکہ اس زمانہ میں حج میں بہت سی منکرات اور برائیاں اہل مکہ نے اپنی طرف سے شامل کرلی تھیں، یہاں تک کہ بعض لوگ احترام کے نام پر کعبہ کی بے احترامی کرتے تھے اور مرد دن میں اور عورتیں رات میں بے لباس طواف کیا کرتے تھے، منیٰ اور عرفات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کے بجائے لوگ اپنے آباء و اجداد کی تعریف کے نغمے گاتے اور اشعار پڑھتے تھے، عکاظ کا میلہ تو خالص تجارتی میلہ تھا، اس میں وہ تمام رنگ رلیاں ہوا کرتی تھیں اور شراب و کباب کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں جو عیش کوشیوں اور سرمستیوں بلکہ بدمستیوں کے لوازم میں سے ہیں، لیکن اس میلہ میں بھی آپ پہنچتے اور لوگوں تک حق کی دعوت پہنچاتے، اہل مدینہ حج کے اجتماعات کے ہی برکت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے اور پھر ایسے جاں نثار ہوئے کہ تاریخ عالم میں ایسی جاں نثاری اور خود سپردگی کی مثال نہیں ملتی۔

ان اجتماعات میں جانا اور وہاں دعوتِ حق پہنچانا اس زمانہ کے طاقتور ترین اور وسیع الاثر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کی بہترین مثال ہے، اس لیے اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانا اور ان تک رسائی حاصل کرنا صرف مصلحت کا تقاضا نہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ افسوس کہ جہاں اور بہت سے پہلوؤں سے ہم نے غفلت کی راہ اختیار کی ہے، وہیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے ہماری بے توجہی بھی ایک قومی گناہ سے کم نہیں۔

یہودیوں کے کم تعداد میں ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر ان کے غلبہ کا اصل راز یہی میڈیا کی طاقت ہے، جس نے ان کی پروپگنڈہ کی صلاحیت کو بے پناہ کردیا ہے، دس سال پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق پوری ریاستہائے متحدہ امریکہ سے مجموعی طور پر یہودیوں کے ایک ہزار سات سو انسٹھ روزنامے شائع ہوتے ہیں، ماہنامے،

پندرہ روزے، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ جرائد اس کے علاوہ ہیں۔ (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۸) یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہودی اخبارات ورسائل صرف امریکہ اور یورپ میں چھپتے ہیں، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک ان کی آماجگاہ ہیں، خود عالمِ اسلام میں ترکی سے یہودیوں کے آٹھ ہفت روزے اور دو ماہنامے، مراکش سے دو ہفت روزے، دو ماہنامے اور چار سالنامے اور ایران سے ایک ہفت روزہ شائع ہوا کرتا ہے۔ سنگاپور اور فلپائن جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی ان کے جرائد ورسائل کی تعداد بالترتیب دس اور نو ہیں۔

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی پانچ کمپنیاں ہیں، ان میں سے چار یہودیوں کی ہیں، اے بی سی، سی بی ایس، این بی سی۔ ان کمپنیوں کے ذریعہ صرف امریکہ میں سات سو سے گیارہ سو تک ٹیلی چینل کام کرتے ہیں اور اپنے پروگرام پوری دنیا میں سیاروں کے ذریعہ نشر کرتے ہیں۔ (دیکھئے: مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۰) یہودیوں کے زیر اثر شائع ہونے والے اخبارات اپنی تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے صفِ اوّل کے اخبارات و رسائل ہیں، مثلاً نیویارک ٹائمس کی اشاعت بارہ لاکھ سے زیادہ ہے، مشہور سائنسی رسالہ ریڈرس ڈائجسٹ کی تعدادِ اشاعت پونے دو کروڑ کے قریب ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب محض ۲٫۹ فی صد ہے، لیکن ان کی ذرائع ابلاغ کی طاقت کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں کل ۶۵ / ملین روزنامے قارئین تک پہنچتے ہیں، ان میں سے ۶۲ / ملین اخبارات کے مالکین بھی یہودی ہیں، پھر اخبارات میں نوے فیصد کارکن یہودی ہیں اور ان کو پوری دنیا میں تقسیم کرنے کی سترہ سو پینتالیس ایجنسیاں اور اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب یہودیوں کے قبضہ میں ہیں۔ (مغربی ذرائع ابلاغ: ۱۲۹)

یہودیوں نے ذرائع ابلاغ پر غلبہ حاصل کر کے نہ صرف اپنی تجارت اور معیشت کو فروغ دیا، بلکہ اسے عیسائیت کی تباہی کا وسیلہ بھی بنایا۔ اس مقصد کے لیے یہودی ذرائع ابلاغ نے عریانیت اور آزاد جنسی تعلقات کی دعوت کو اپنا خاص موضوع بنالیا، مکالموں، نغموں اور تصویروں کے ذریعہ آبرو باختگی اور بے عفتی کو عیسائی معاشرہ میں اس درجہ رواج دیا کہ امریکہ و یورپ کا عیسائی سماج شراب و شباب کی بدمستیوں میں پوری طرح غرق

ہو چکا ہے اور اس طرح اس غفلت کوش، اپنے انجام سے بے خبر اور قوتِ عمل سے محروم معاشرہ پر یہودیوں نے مکمل معاشی غلبہ حاصل کرلیا ہے اور ان کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔

عیسائی دنیا کو تباہ کرنے کے بعد اب ان کا نشانہ عالم اسلام، عالم عرب اور مشرقی ممالک ہیں، مسلمانوں اور عربوں پر یہودی ذرائع ابلاغ کی دوہری یلغار ہے، ایک طرف فلموں، ڈراموں اور مکالموں کے ذریعہ تصور پیدا کیا گیا ہے کہ مسلمان عموماً اور عرب خصوصاً جاہل، شدت پسند، مجرم خو، قتل وخونریزی کے عادی، بے وقوف وکند ذہن، غریب وقلاش اور عیش پرست ہوا کرتے ہیں اور عرب، عورتوں کے دیوانے اور شہوت میں ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ انہیں اگر اس طرح کی کوئی رشوت دی جائے تو وہ فوراً رام ہوجاتا ہے۔ اسلامی شعائر کی بے حرمتی کے لیے بھی اشاعتی ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے، عریاں تصویروں کو قرآنی آیات کے ہالہ میں شائع کرنے کے کئی واقعات سامنے آچکے ہیں۔ مغربی میڈیا کا عربوں کے ساتھ کس قدر تمسخر آمیز اور توہین انگیز رویہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ C.N.N جیسی مشہور عالمی ٹی، وی کمپنی ایک صابن کا اشتہار اس طرح دیتی ہے: ''یہ صابن ہر چیز صاف کرسکتا ہے، حتیٰ کہ گندے عربوں کو بھی'' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی اور یہودی میڈیا اسلام سے، مسلمانوں سے اور عربوں سے کیسی نفرت کا صور پھونکتا ہے اور دنیا کے سامنے ان کی کیسی تصویر بناتا ہے۔

دوسری طرف ٹی، وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عالم عرب میں بے حیائی وفحاشی کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے، عالم عرب میں اپنی ذہانت اور قائدانہ صلاحیت کے اعتبار سے مصر کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی خطہ کو مغرب نے اپنا ہدف بنایا ہے۔ مصری ٹی، وی کے نو چینلوں سے روزانہ ۱۲۶/ گھنٹے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، ان میں دینی پروگراموں کا تناسب محض ساڑھے تین فیصد ہے۔ (مغربی میڈیا: ۲۰۳) مصر میں فلمیں اور ناولیں ایسے ناموں سے منظر عام پر آرہی ہیں کہ ان ناموں ہی سے شرم وحیا اور عفت وپاکبازی کا خون ہوتا ہے، اکثر عرب ممالک میں امریکی اور مغربی فلمیں (جو زیادہ تر یہودیوں کا نتیجہ

فکر ہوتی ہیں) دیکھی جاتی ہیں، یا ان کے عربی ترجمے ناظرین وقارئین تک پہنچتے ہیں۔ عالمِ عرب پر ان کا نہایت ہی منفی اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہندوستان پر حالیہ برسوں میں مغربی تہذیب وثقافت جس قوت کے ساتھ حملہ آوری ہوئی ہے اور جس تیزی سے مغربی فیشن ہندوستان کے مشرقی سماج کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے، وہ ایک کھلی حقیقت ہے اور شاید ہی کوئی حساس دل ہو جو اس کی کسک کو محسوس نہ کرتا ہو۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ذرائع ابلاغ کی طرف توجہ دیں اور میڈیا تک رسائی حاصل کریں۔ ہندوستانی میڈیا پر سنگھ پریوار کے غلبہ کی وجہ سے مسلمانوں کو گذشتہ نصف صدی میں جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ ناقابلِ تلافی اور ناقابلِ بیان ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسلمان اپنا اثر ورسوخ بڑھائیں، اس کے لیے منصوبہ بند طریقہ پر چند کام کرنے ہوں گے: اوّل ملک کے مختلف علاقوں سے ذہین و باصلاحیت مسلمان طلباء کو جرنلزم کا کورس کرانا اور انہیں انگریزی اور مقامی زبانوں کے اخبارات وغیرہ میں داخل کرنا، دوسرے جو لوگ صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہیں یا جو دوسرے ذرائع ابلاغ میں مصروفِ کار ہیں، وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات سے انہیں دعوت دینا اور مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے بارے میں ان کو صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنا، تیسرے اپنے مسائل آپ پیش کرنے کے لیے ایسے چینل قائم کرنا جس کی پالیسی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس کا خوشگوار تجربہ قطر کا الجزیرہ چینل ہے، جو غلط فہمیوں کو دور کرنے اور حقائق کو پیش کرنے میں بہتر کردار ادا کر رہا ہے اور خود مغربی ممالک تک بھی حقائق کو پہنچانے میں اس نے کسی قدر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو ایسی تدبیر اختیار کرنی ہوگی، تاکہ برادرانِ وطن کے قلوب میں شکوک وشبہات کے جو کانٹے چبھوئے جا رہے ہیں وہ انہیں نکالنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا انگریزی اخبار ایک خواب ہے، نہ معلوم کہ تعبیر اس کی قسمت میں ہے یا نہیں؟ یہ بات نسبتاً آسان ہے کہ مختلف علاقوں کی مقامی زبان میں مسلمان اپنا اخبار نکالیں، جیسا کہ اس وقت ملیالم اور گجراتی زبان میں مسلمانوں نے اپنا

اخبار نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ گجرات کے حالیہ فساد میں ظلم و جور کا جو رقص ہوا ہے، اس میں بعض شر پسند گجراتی اخبارات کا بنیادی کردار ہے، جنہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط طریقہ پر پیش کیا اور ہندو عورتوں کی عصمت ریزی کی غلط اطلاع نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان مقامی زبانوں خاص کر ہندی میں اپنا اخبار نکالیں، کم سے کم ہندی، تمل، مراٹھی، اڑیا اور بنگالی زبانیں ایسی ہیں کہ صرف مسلمان قارئین کے ذریعہ اخبار کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

غرض ذرائع ابلاغ عصر نو کا طاقتور ہتھیار ہے اور اس میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرنا اور اس رسوخ کو دینی اور قومی مفادات کے لیے استعمال کرنا وقت کا بہت بڑا جہاد ہے!

(۲۸ر جون ۲۰۰۲ء)

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

انسان کو جو چیزیں مخلوقاتِ عالم سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں وہ صلاحیتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ایک عقل اور دوسرے قوتِ اظہار۔ عقل کا مرکز دماغ ہے، جو واقعات اور ان وقعات سے ثابت ہونے والے نتائج کو سمجھتا ہے اور اظہار کا ذریعہ و وسیلہ زبان ہے، جو دماغ کی فکر اور دل کے احساس کو دوسروں تک پہنچاتی ہے۔ کون انسان ہے جو اپنے خیالات اور جذبات کو ظاہر نہ کرتا ہو، لیکن سلیقۂ اظہار بھی بڑی چیز ہے۔ ایک شخص اپنا فسانۂ غم سناتا ہے تو انسان کا دل بھی نہیں پگھلتا اور یہی داستانِ الم اس شخص کی زبان سے سنئے جو زبان و بیان کا سلیقہ رکھتا ہو تو لگتا ہے کہ پتھر بھی موم ہو جائے گا، چہ جائے کہ انسان کا دل اپنی دھڑکنوں اور آنکھیں اپنے آنسوؤں پر قابو رکھیں، اسی سلیقۂ کلام و بیان کا نام ادب ہے۔ غرض ادب اپنے افکار اور احساسات کے ایسے اظہار کا نام ہے جو دل کی انگیٹھی کو سلگا سکے اور ذہن و دماغ کو اپنا اسیر بنا سکے۔

پس ادب اظہار کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ انسان اچھے مقاصد کے لئے بھی اس کو استعمال کر سکتا ہے اور اسی سے فساد و بگاڑ پھیلانے کا بھی کام لے سکتا ہے، لیکن افسوس کہ انسان نے اپنی اس عظیم اور امتیازی صلاحیت کا استعمال بہتر اور تعمیری مقاصد کے لئے کم اور خراب اور تخریبی مقاصد کے لئے زیادہ کیا ہے۔ اسلام سے پہلے شعر و ادب کے جو مکاتب گذرے ہیں، قریب قریب ان سب نے شعر و سخن کا موضوع ایسی چیزوں کو بنایا ہے جو نہ انسان کی فکر و اخلاق کی تعمیر میں معاون تھا اور نہ انسان کے حقیقی مسائل کو ابھارنے میں، روم و یونان ہو یا عرب و ایران۔ چار صنفیں تھیں جو ادیبوں کے فکر و خیالات کا محور بنی ہوئی تھیں ایک تو رجزیہ نظم و نثر، جس میں جنگ و جدال پر اُبھارا جاتا، اپنے ممدوح کی

بہادری اور شجاعت کا اظہار ہوتا اور اپنی فتح اور دشمنوں کی شکست کے مافوق العادت نقشے کھینچے جاتے، خود ہندوستان میں رامائن اور گیتا ایسے ہی ادب کا نمونہ ہے۔

دوسرا موضوع مرثیہ اور نوحہ و ماتم کا تھا، عرب شاعری نے بھی اس میں بڑا حصہ پایا ہے، کسی شخصیت کی موت کا ایسا نقشہ کھینچا جاتا گویا اس کی وفات سے زمین میں بھی زلزلہ بپا ہو گیا اور آسمان میں آنسوؤں کی برسات بہہ پڑی۔ ادب کا تیسرا موضوع تملق اور خوشامد ہوتا تھا، ادباء اور اربابِ سخن اپنی کاہلی اور سست گامی کے لئے مشہور تھے، بادشاہوں، رئیسوں، نوابوں کی خوشامد میں اشعار کہتے، انشائیہ لکھتے اور زمین کو آسمان سے ہم آغوش کر کے ایسی تعریفیں کرتے جو عقل و فہم سے بھی ماوراء تھے اور انعام و اکرام کی صورت میں اس کی قیمت وصول کرتے، اس لئے جھوٹ اور مبالغہ لوگوں کی عام بول چال میں ایک سنگین برائی ہے، لیکن شعر و سخن کی دنیا میں یہی سب سے بڑی خوبی، بلکہ ادب کا امتیازی وصف ہے۔ شعراء اور ادباء کا چوتھا موضوع حسن و عشق اور شراب و شباب رہا ہے، جن اخلاق سوز اور حیا باختہ باتوں کو کوئی شریف انسان اپنی مجلسِ احباب میں بھی نہیں کہہ سکتا، شعر و ادب کے نام پر انہی باتوں کو ادیبوں اور شاعروں نے مجمع عام میں گنگنانا اور اپنی تحریروں کے ذریعے چار دانگِ عالم میں پھیلانے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ یہ موضوع جوان سب میں زیادہ بگاڑ اور فساد کا موجب تھا، مشرق و مغرب کے ادب میں اسی قدر محبوب و مطلوب قرار پایا۔ کمیونزم کے ابھرنے کے بعد ادب میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا، جس نے بغاوت کا لب ولہجہ اختیار کیا اور پیٹ کو اپنا لیلائے مقصود بنایا۔ پیٹ ہی سے اس کی ابتداء ہے اور پیٹ ہی پر اس کی انتہاء ہے۔

ادب کی یہ ساری صنفیں انسانی سماج کو اخلاقی بگاڑ اور فکری انتشار کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں، یہ انسان کو باغی اور دہشت گرد بناتی ہیں، خوشامد اور چاپلوس بناتی ہیں، محبوب کے گیسو و رخسار کا اسیر کرتی ہیں اور انسان کے سفلی جذبات ہی کو ان کا مقصدِ وجود بنا دیتی ہیں، یا پھر مال و دولت کا حریص اور ایک بھوکے جانور کی طرح شکم پروری کے لئے مضطرب و بیقرار کر دیتی ہیں۔ کیا ایسی شاعری اور ایسا ادب انسانی سماج کو کوئی نفع پہنچا سکتا

ہے اور کیا اس سے کسی سماج کی تعمیر اور کردار سازی میں مدد مل سکتی ہے؟ اسلام نے اس مزاج کو بدلا اور ایک ایسے ادب کو وجود بخشا جو صالح انقلاب کا داعی تھا، جو انسان کے اندر اپنے خالق و مالک کی محبت پیدا کرتا ہے، بغاوت کے بجائے محبت و ایثار کی تعلیم دیتا ہے، خوشامد کے بجائے حقیقت پسند بناتا ہے، محبوب کے نقش و نگار اور خد و خال کو بے پردہ کرنے کے بجائے شرافت و پاکیزگی اور حیا کی تعلیم دیتا ہے، زندگی کے حقیقی مسائل کو ابھارتا ہے اور پاکیزہ اخلاقی جذبات کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ ادب برائے ادب اور شعر برائے شعر کا قائل نہیں، بلکہ ادب برائے تعمیر و اصلاح کا قائل ہے۔

شعراء ادب کے اسی فرسودہ تصور کے اسیر ہو کر رہ گئے، جس کا مقصد خیالی شاعری اور خیالی جذبات نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ آج کا ادیب و شاعر آسائش گاہوں میں بیٹھ کر غریبوں کا فسانہ بیان کرتا ہے اور جشن و طرب کی بزم سجا کر نوحۂ و ماتم کرتا ہے۔ ایسے ادب میں دلوں کی دنیا کو بدل دینے اور برف میں آگ لگانے کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے، جس شاعری میں اور ادب میں خونِ جگر شامل نہ ہو، جس کی تہوں میں درد انگڑائیاں نہ لیتا ہو، جس کے الفاظ کے پس پشت حقیقی معنوں میں درد کسک نہ ہو، اس ادب سے کان کی لذت کا سامان تو ہو سکتا ہے، دلوں کی دنیا نہیں بدل سکتی۔

اردو زبان اسلام کے آغوش میں پلی، اخلاق و شائستگی کی گود میں اس نے پرورش پائی، لیکن بدقسمتی سے اردو شاعری نے بھی جلد ہی حسن و عشق کی غلامی کو قبول کر لیا، یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کو کہنا پڑا:

> ”یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے، یعنی مضامین عاشقانہ، میخوارئ مستانہ، بیگل و گلزار، وہی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصال موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، ...... حسن و عشق، کے ...... مضمون اس قدر مستعمل ہوئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ...... گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، انہیں کو چباتے ہیں

اور خوش ہوتے ہیں، خیال کرو، اس میں کیا مزا رہا، حسن و عشق، سبحان اللہ، بہت خوب، لیکن تابہ کے؟ گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے، حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ سو برس کی بڑھیا ہوگئی۔'' (آبِ حیات)

یہی بات مولانا حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں کہی ہے اور اسی کو شاعر حق ترجمان علامہ اقبالؔ نے فرمایا:

ہند کے شاعر وصورت گرو افسانہ نویس

آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اردو ادب میں اس بے سمتی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغربی دنیا سے اتنے مرعوب ہوئے کہ شعر و سخن اور زبان و ادب میں بھی ہم نے انہیں کو کعبۂ تقلید بنا رکھا ہے۔ ہندوستان کے اہلِ علم و نظر مغرب سے کس درجہ مرعوب تھے، اس کا اندازہ سرسید مرحوم جیسے صاحب نظر اور دردمند شخص کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے، جو ان کے خط کا اقتباس ہے۔ یہ خط اکتوبر ۱۸۶۶ء میں لندن سے لکھا گیا تھا۔

''بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، عالم سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت اور لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو۔'' (مکاتیب سرسید: ۱۸/)

اسی لئے اقبالؒ کو ہندوستان کے ادباء و شعراء کو یہ آواز دینی پڑی کہ ؎

اٹھا نہ شیشہ گراں فرنگ کے احسان

سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

اسلامی ادب اور اسلامی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سچی حقیقتوں اور صداقتوں کی ترجمان ہوتی ہے اور سماج کی اصلاح و تربیت کی خدمت انجام دیتی ہے، منظر نگاری اور

نظامِ فطرت کی عکاسی ادب کا ایک اہم حصہ ہے، عام شعراء اس سے آتشِ ہوس کو بھڑکاتے ہیں اور اسلامی شعروادب کا ترجمان اسی سے خدا کی یاد دلاتا ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑتا ہے، غرض ایک ہی واقعہ کے بیان میں دونوں اپنے اپنے مزاج کے مطابق صالح اور فاسد فکر کا پیغام دیتے ہیں۔ اگر شعروادب کی زلفیں سنوارنے والے اور لوح وقلم کی بزمیں سجانے والے انسانیت کی تعمیر، سماج کی اصلاح اور انسانوں کے حقیقی مسائل کو پیش کرنے کی سعی وکوشش کو اپنی منزل بنالیں تو یقیناً ان کے ذریعہ ایک صالح انقلاب آسکتا ہے اور دلوں کے درمیان تلاطم پیدا ہوسکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ہندوستان کے ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور اہلِ نظر سے اس موضوع پر تفصیلی خطاب کیا ہے، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ کاش! اقبالؔ کی یہ نوائے درد ہمارے ادیبوں اور ادب دوستوں کے کانوں سے ٹکرا کر نہ رہ جائے، بلکہ دل کی دنیا تک پہنچے۔ آپ ان اشعار کو پڑھئے اور دامن دل سے باندھئے!

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئی کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا،
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

۱۷/مارچ کے اخبارات میں ایک خبر چھپی ہے کہ بی۔ جے۔ پی کے سینئر قائد ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، پڑھے لکھے سیاسی لیڈر ہیں اور بی۔ جے۔ پی کے صدر بھی رہ چکے ہیں، آج کل سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ پنڈتوں اور جیوتشیوں سے بھی بڑے پیمانہ پر ملاقات کر کے مبارک اور منحوس کے ''فتوے'' حاصل کر رہے ہیں۔ پنڈتوں نے بڑے غور وفکر کے بعد انہیں بتایا کہ پارٹی کے مرکزی دفتر (جو ۱۱/اشوک روڈ، دہلی میں واقع ہے) کے باب الداخلہ کے سامنے نیم کا درخت بی۔ جے۔ پی کے منزل اقتدار تک پہنچنے کے لئے راستہ کی رکاوٹ بنا ہوا ہے اور پورے ملک میں فرقہ پرستی کا رقص کرنے اور ظلم وجور کی آگ لگانے والے اس معمولی کڑوے درخت کے سامنے ایسے بے بس ہیں کہ اس کے نحس کو راہ سے ہٹا نہیں سکتے، چوں کہ اس درخت کے کاٹنے میں وقت در پیش تھی اس لئے باب الداخلہ کو بند کر دیا گیا ہے اور دوسری سمت کے دروازہ سے آمد و رفت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

واجپائی جی کی حلف برداری کے لئے بھی دس بج کر نو منٹ کا وقت مقرر ہوا ہے اور اس کو ''شبھ گھڑی'' مانا گیا ہے، کہیں وقت کے اندازے میں غلطی نہ ہو جائے، اس کے لئے خصوصی طور پر ٹائم پیس خرید کی گئی ہے اور وہ بھی چار عدد۔ ایک پارٹی کے دفتر میں رہے گی، ایک راشٹر پتی بھون میں، ایک واجپائی جی کے پاس اور ایک اڈوانی جی کے پاس۔

''شبھ گھڑی'' کا انتخاب کوئی نئی بات نہیں ہے، ملک کے آٹھویں وزیر اعظم نرسمہا راؤ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، کئی زبانوں کے ماہر تھے اور دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، گو ملک کے سیکولر اور جمہوری کردار کو جو نقصان ان سے پہنچا ہے، وہ کسی ڈاکو اور غارت گر سے

بھی نہیں پہنچا، انہوں نے بھی اپنی حلف برداری کے لئے باضابطہ جیوتشیوں سے وقت لیا تھا اور ان کی دانشوری اس میں کچھ بھی مانع نہ ہوسکی۔ وزارت عظمیٰ ان کے لئے ایسی ''مبارک'' ثابت ہوئے کہ کسی طور کرسی صدارت سے اُترنے کو تیار نہ تھے، بالآخران کے رفقاء نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کران کو اس کرسی سے نیچے اُتار پھینکا۔ اس کے بعد پارلیمانی پارٹی کی صدارت کا مرحلہ تھا اس عہدہ سے بھی وہ کسی طور سے سبکدوش ہونے کے لئے آمادہ نہ تھے، لیکن ان رفقاء نے بہ قول ان کے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جیسے بھرے دربار میں ''درو پدی'' کی ساڑی کھینچنے کی کوشش کی گئی اور کوئی اس کی حمایت کرنے والا نہ تھا، آخر ''بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' کے مصداق انہوں نے اس عہدہ کو خیر باد کہا اور آ کل اپنے گناہوں کے جال میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ کسی طرح چھٹکارا نہیں پاتے اور صورتِ حال یہ ہے کہ ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!''

اس سے بھی زیادہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ملک کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو (جو بہت روشن خیال تصور کئے جاتے تھے) نے بھی حلف اٹھانے کے وقت جیوتشیوں سے مشورہ کیا تھا اور اسی لئے ۱۲؍ بجے شب سے ۵؍منٹ پہلے حلف لینے کی خواہش کی تھی، ماؤنٹ بیٹن کے لئے بھی نہرو کی یہ بات خلافِ توقع اور باعثِ حیرت تھی، وہ نہرو جیسے سائنٹفک ذہن کے آدمی سے اس کی ذرا بھی توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن نہرو جی نے جیوتشیوں کے فلسفہ نفع ونقصان کے سامنے سرِتسلیم خم کردیا۔

سائنس نے آج کتنی ترقی کرلی ہے، انسانی قدم نے چاند کے کلیجے کو روند دیا ہے، مریخ پراس نے کمند ڈالا ہے، سمندر کی موجوں کو چیر کر وہ اس کی تہہ تک پہنچ گیا ہے اور کائنات کی ایک ایک شئی کو وہ اپنے علم وتحقیق کی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے، یہاں تک کہ اس نے حیوانات کی پیدائش کے لئے ایک مصنوعی نظام کا اختراع بھی کیا ہے، لیکن اگر انسان عقیدہ وایمان سے محروم ہو تو علم وتحقیق بھی اس کو اوہام کی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا، وہ دنیا کی ان حقیر چیزوں کو اپنی تقدیر کا مالک تصور کرنے لگتا ہے جو اس کی ٹھوکروں میں ہیں اور جن کو خدا نے خود اس کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اسلام نے انسانیت کو توحید کا جو عقیدہ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے لئے بڑا اعزاز ہے۔ توحید یہ ہے کہ انسان صرف خدا ہی کو اس کائنات کا رب اور نفع و نقصان کا مالک تصور کرے اور اس بات کا یقین رکھے کہ خدا نے اس کے لئے جو کامیابی لکھی ہے، کوئی سازش اسے ناکامی سے بدل نہیں سکتی ہے اور خدا نے جو ناکامی مقدر کر دی ہے، کوئی تدبیر اس کو اس سے بچا نہیں سکتی۔ دریا ہوں یا پہاڑ، درخت ہوں یا مہر و ماہ، ستارے ہوں یا کوئی سا وقت اور مکان، یہ انسان کی قسمت اور تقدیر میں کوئی دخل نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو توہمات کی دیوار کو زمین بوس کر سکتا ہے اور انسان کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور اپنی کتابِ تقدیر ان کے ہاتھ میں دینے سے بچاتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی بعض مہینوں، جانوروں اور پرندوں کو منحوس خیال کیا جاتا تھا، لیکن عقیدۂ توحید نے اس قسم کے اوہام و خرافات کی ظلمتوں کو چاک کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ تیمور نے ہندوستان کو فتح کیا اور جمنا پار کرنا چاہا تو جیوتشیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ نامبارک وقت ہے، تیمور کچھ زیادہ لکھا پڑھا آدمی تھا، نہ سائنسی علوم حاصل کئے تھے، نہ کسی زبان کا ماہر تھا نہ کسی یونیورسٹی کا فاضل تھا، لیکن مسلمان تھا، اس نے برجستہ انکار کیا اور کہا کہ اس طرح کی بات پر مشرکین اور تثلیث کے ماننے والے (عیسائی) یقین رکھتے ہیں، ہم مسلمان اور اہل توحید ایسی باتوں کا یقین نہیں کرتے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے عہد میں مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر میں مشرکانہ مذاہب مروج تھا۔ مصر کی زراعت کا دارومدار دریائے نیل پر تھا، اتفاق کہ مسلمانوں کے قبضہ کے بعد دریا خشک ہو گیا، گورنر سے اہل ملک نے کہا کہ دریا قربانی کا خواستگار ہے، ہم لوگ ہر سال ایک کنواری لڑکی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، اس کے بعد ہی پانی جاری ہوتا ہے، گورنر نے حضرت عمرؓ کے پاس اطلاع بھیجی، آپؓ نے ایک تحریر لکھی، یہ تحریر دریا کے نام تھی کہ ''اگر تو خدا کے حکم سے بہتا ہے تو جاری ہو جا، ورنہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جا!''، آپؓ نے ہدایت فرمائی کہ اسے دریا میں ڈال دیا جائے، ایسا ہی کیا گیا اور دریا کا پانا ایسا جاری ہوا کہ پھر خشک نہ ہوا۔ (دیکھئے محمد رضا: الفاروق عمر بن خطاب ط: مصر ۲۷۲)

اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ نہ کوئی وقت منحوس ہے اور نہ کوئی جگہ، نہ کوئی درخت نامبارک ہے اور نہ کوئی جانور، برکت اور نحس کا تعلق خود اپنے عمل سے ہے۔ انسان کا برا عمل اور انسانیت کے ساتھ غیر انسانی رویہ سب سے بڑا نحس ہے اور حق اور سچائی پر استقامت اور انسانیت کے ساتھ بھلائی سب سے بڑا سبب برکت اور ''شبھ'' ہے۔ جیوتشیوں سے مبارک و منحوس کے بارے میں استفسار کرنے سے بہتر ہے کہ انسان خود اپنے ضمیر سے (بشرطیکہ بالکل مردہ نہ ہو) اپنے اعمال اور رویہ کے بارے میں استفسار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات لمحۂ فکریہ ہے کہ توحید کا عقیدہ کتنی بڑی رحمت ہے، اس عقیدہ نے ایک خدا کے سامنے انسان کی جبین احترام کو ضرور خم کیا ہے، لیکن اس نے کتنے ہی دروازوں پر جھکنے سے انسان کو بچایا ہے اور کتنے ہی توہمات کی پرستاری اور غلامی سے اسے نجات بخشی ہے۔ اسی کی طرح شاعر حق شناس علامہ اقبال نے اشارہ فرمایا ہے کہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰/اپریل ۱۹۹۸ء)

کامیابی کی کلید

طوفان اس لئے آتے ہیں کہ اپنی تباہ خیزیوں کے ساتھ گذر جائیں، موجیں اس لئے متلاطم ہوتی ہیں کہ ساحل کو روند کر واپس چلی جائیں، آتش فشاں اس لئے پھوٹتے ہیں کہ زمین کے سینہ میں جولاوے چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آ کر ساکت و جامد ہو جائیں، ان کی ہلاکت خیزیاں اور تخریب انگیزیاں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ ان کے پنجۂ استبداد سے بچ نہیں سکے گا، لیکن ان کو ثبات و دوام حاصل نہیں ہوتا، انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی میں بھی ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ جس سے دل لرزنے اور قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، لیکن اصل میں یہ اس کے لئے آزمائش کے لمحات ہیں، اگر وہ کچھ دیر اس میں استقامت کا ثبوت دے، کم ہمتی سے دوچار نہ ہو، جذبات سے مغلوب نہ ہو اور رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو کر کوئی غیر دانشمندانہ اقدام نہ کر بیٹھے، تو یہی مصیبت اس کے لئے راحت کا مقدمہ اور یہی وقتی پستی اس کے لئے سربلندی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مؤمن کو قرآن نے ایسے مواقع پر دو باتوں کا حکم دیا ہے، صبر اور صلوٰۃ ___ صبر کیا ہے؟ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی عزیز و قریب کی موت پر رونے دھونے سے اجتناب کا نام "صبر" ہے، لیکن حقیقت میں صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، صبر کے معنی برداشت کرنے کے ہیں، قوت برداشت بہت بڑا جوہر ہے اور اس قوت سے محرومی بہت بڑا عیب ہے، جس آدمی میں قوت برداشت ہوتی ہے، اس میں تدبیر کی صلاحیت ہوتی ہے، اور وہ مخالفت سازشوں سے نمٹنے کی مؤثر کارروائی کر سکتا ہے، انبیاء کو چوں کہ سب سے زیادہ مخالف حالات سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے ان میں حلم و بردباری اور مخالفت کو سہنے کی صلاحیت من جانب اللہ سب سے زیادہ ودیعت ہوتی ہے،

میرا منشاء یہ نہیں ہے کہ صبر کا مطلب بزدلی اختیار کرنا، اور حوصلہ ہار جانا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حکمت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہئے، اور اپنے جذبات کو بے محل خرچ کرنے سے بچنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں، صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہلِ مکہ کی جانب سے ایک جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کیا جو کم و بیش چالیس افراد پر مشتمل تھا، ظاہر ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں کے جان کے درپے ہو کر حملہ آور ہوئے تھے، اور ان کی حقیقی سزا یہ تھی کہ یہ جس مقصد کے لئے آئے تھے، وہی رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جاتا یعنی انہیں قتل کر دیا جاتا یا کم سے کم وہ قید کر لئے جاتے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوں ہی رہا فرما دیا، کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس سے چاہے جانی یا مالی نقصان کسی بھی فریق کا ہوتا، لیکن عربوں میں اسلام کے تئیں نفرت اور بڑھ جاتی، کیوں کہ وہ حرم کا بے حد احترام کرتے تھے، انہیں خیال ہوتا کہ مسلمانوں نے اب حرم کی حرمت کو بھی پامال کرنا شروع کر دیا ہے، یہ ہوش کو جوش اور حکمت و مصلحت کو جذبات پر غالب رکھنے کی ایک مثال ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی کا ایک معرکہ ''غزوۂ بنو مصطلق'' کے نام سے معروف ہے، اس غزوہ میں ایک انصاری اور حضرت عمرؓ کے غلام کے درمیان معمولی سی بات پر کچھ تیز و تند، گفتگو ہو گئی، پھر انصاری نے اپنی مدد کے لئے انصار کو، اور حضرت عمر کے غلام نے مہاجر کو آواز دی، اور اس طرح دو افراد کا جھگڑا دو گروہ کا جھگڑا بن گیا، عبداللہ بن اُبی جو نفاق کے مرض میں مبتلا تھا، بلکہ گروہ منافقین کی قیادت کرتا تھا، اور کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، جس سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہونچے، اس نے اس موقع کو اپنی ناشائستہ حرکت کے لئے بہت غنیمت جانا، اور انصار کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ مہاجرین کے معاملہ میں تمہاری مثال عربوں کے اس محاورہ کی سی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو، کہ وہ تمہیں ہی کاٹ کھائے ''سمن کلبلک یاکلک'' عبداللہ بن ابی کی اس ریشہ دوانی کی اطلاع حضور کو ایک کمسن انصاری صحابیؓ نے دی، جب آپ نے عبداللہ بن ابی کو بلا کر استفسار فرمایا تو وہ صاف مکر گیا، کچھ دوسرے بزرگ انصار جو عبداللہ بن ابی

کے نفاق سے واقف نہیں تھے، انہوں نے بھی عبداللہ بن ابی کی حمایت کی، اس موقع پر قرآن مجید کی آیت ان کمسن انصاری صحابیؓ کی تصدیق میں نازل ہوئی، حضور ﷺ نے از راہِ شفقت ان کی گوش مالی کرتے ہوئے، ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی ہے۔

حضرت عمرؓ پر حق کا جوش غالب رہتا تھا، انہوں نے آپ سے اجازت مانگی، کہ عبداللہ بن ابی کی گردن ماردی جائے، اگر حضور ﷺ اس کی اجازت مرحمت فرماتے تو یقیناً یہ بجا ہوتا، کہ ''الفتنة اشد من القتل'' لیکن آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا تا کہ اگر میں ایسا کروں تو انصار کو غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اور لوگ بھی ایسا سوچیں گے کہ محمد ﷺ خود اپنے رفقاء کو قتل کرا رہے ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور صحابہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ اس پورے دن، رات اور آئندہ دن دوپہر تک خلاف معمول چلتے رہے، یہاں تک کہ صحابہ تھک کر چور ہو گئے تو آپ نے پڑاؤ کرنے کا حکم فرمایا، اس مسلسل سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اتنا تھک جائیں کہ انصار و مہاجرین کے درمیان جو تلخی وہاں پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر جاتا رہے، پھر ایک وقت آیا کہ خود عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ بہت مخلص مسلمان اور نبی کریم ﷺ کے خاص محبین میں تھے، انہوں نے درخواست کی کہ میں اپنے والد کے نفاق سے واقف ہوں، اور اگر آپ ﷺ کا حکم ہو تو میں خود انہیں قتل کرسکتا ہوں، آپ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ ﷺ کو مسلمان ظاہر کرے گا، میں اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا ہی معاملہ کروں گا، پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو یہ صورت حال بتائی کہ اگر ہم اس وقت عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دیتے تو اس سے بعض مخلص مسلمانوں کو بھی غلط فہمی ہوسکتی تھی، لیکن اب یہ صورتِ حال ہے کہ خود ان کے بیٹے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی رائے میں برکت رکھی ہے، بارك الله فی رای رسوله

یہ وہی حکمت و مصلحت اور ہوش کو جذبات اور جوش پر ہوش کو غالب رکھنے کی بات

ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس کی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں، موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو سمجھیں، اگر ہم نے مغلوب الجذ بات ہو کر چند پتھر پھینک دیئے، تو اس سے یقیناً دوسروں کا کچھ خاص نقصان نہیں ہوگا اور نہ اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا، البتہ اس سے آپ کے لئے بہت زیادہ نقصان و مضرت کا اندیشہ موجود ہے، کوئی انسان کتنا بھی ظالم اور بدخو ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو اپنے ظلم وجور کے لئے کوئی دلیل ہاتھ آجائے، خواہ وہ کمزور سے کمزور تر کیوں نہ ہو، شیطان نے بھی اپنی عدول حکمی کے لئے ایک دلیل دریافت کرلی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مادۂ تخلیق اس کے مادہ تخلیق سے کمتر ہے، اس لئے وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کرے گا۔

اگر ہم مشتعل اور بے برداشت ہوکر کوئی معمولی سی حرکت بھی کرگزریں تو جو لوگ اپنے سینوں میں بغض چھپائے رکھتے ہیں، ان کو اپنی زیادتی کے لئے سند جواز ہاتھ آجاتی ہے، گویا ہم اپنے ہاتھوں ان کو اشتعال کا ہتھیار دے دیتے ہیں، پھر لوگ واقعات اور اس کے اصل محرکات کو نہیں دیکھتے، بلکہ ظاہری سبب کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اس لئے ایسے مواقع پر سوچنا چاہئے کہ کون سا قدم ہمارے مقصد کے لئے مفید و معاون ہوگا، مثلاً یہی افغانستان پر امریکہ کے ظالمانہ حملہ کی بات ہے، اگر ہم حکومت سے نمائندگی کریں کہ وہ اس معاملہ میں مظلوم کی طرفداری یا کم سے کم غیر جانبداری کو برقرار رکھے، تو یہ ایک معقول بات ہوگی، اسی طرح مغربی اور عالم اسلام کے سفارت خانوں سے بھی ملاقاتیں کرسکتے ہیں اور ان کے سامنے اپنے جذبات رکھ سکتے ہیں، لیکن اگر ہم اس مقصد کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں تو اس سے ہمارے مقصد کو تو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوگی، لیکن فرقہ پرست طاقتوں کے کاز کو ضرور تقویت ملے گی، اور یہ ہمارے لئے کس قدر نقصاندہ ہوگا، وہ محتاج بیان نہیں۔

خدا کی مدد کا دوسرا ہتھیار ''صلوٰۃ'' ہے صلوۃ کے اصل معنی نماز کے ہیں، نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس میں انسان خدا کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچھادیتا ہے، اور پیشانی سے لے کر پاؤں تک انگ انگ خدا کی بندگی میں مشغول ہوتا ہے، اس لئے نماز

دراصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے، یعنی مشکل حالات میں انسان اپنے رب کی طرف پوری طرح رجوع ہو جائے، وہ خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھ دے، کہ ہم محتاج ہیں تو غنی، ہم فقیر ہیں تو داتا، تو ان ہاتھوں کو خالی واپس نہ فرما، خدا کی طاقت بے پناہ ہے، یوں تو روز و شب خدا کی قدرت کو ہم دیکھتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ قدرت اسباب کے پردہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے، کبھی کبھی خدا کی طاقت اسباب سے آزاد ہو کر بھی انسان کے مشاہدہ میں آتی ہے، غور کرو کہ جب حضرت موسیٰ اور قوم بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کے لئے فرعون کا لشکر جرار جمع ہو رہا تھا، اور کبر و غرور سے مغرور ہو کر نکل رہا تھا، تو لوگ یہی دیکھ رہے تھے کہ یہ لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے چل رہا ہے، لیکن اللہ کے یہاں یہ بات مقدر تھی، کہ ان کا یہ اجتماع خود ان کے نیست و نابود ہونے کا ذریعہ بن جائے گا چنانچہ وہی ہوا، بدر کے معرکہ میں بڑے بڑے سورما اور بہادر مکہ سے چلے آئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہارے سامنے ڈال دیا ہے، ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر لوگوں کو خیال گذرا ہوگا کہ یہ تو مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، لیکن کسے خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سورماؤں کو اس لئے جمع کر رہا ہے کہ خود ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور مکہ کو اپنے ضدی سرداروں سے نجات مل جائے، آئندہ اہلِ مکہ کے لئے دعوتِ حق کو قبول کرنا آسان ہو، غزوۂ احزاب میں اتحادیوں کی ایک پہاڑ جیسی فوج اس لئے جمع ہوئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ تمام اسلام مخالف طاقتوں کو متحد و مربوط کر دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ اس آخری کوشش کی ناکامی کے بعد ہمیشہ کے لئے ان کی ہمت ٹوٹ جائے، اور خود ان کی صفیں بکھر جائیں۔

اس لئے ہمیں خدا کی طرف اور اس کے خزانہ و طاقت سے مدد لینا چاہئے، پھر اس کے لئے نہ کوئی چیز انہونی ہے اور نہ کوئی بات ناممکن، وہ چاہے تو وقت کی سپر طاقتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے، اور اپنے کمزور بندوں کو آہن و فولاد سے زیادہ طاقتور، دعاء کا مقصد یہی ہے کہ مومن خدا کے غیبی خزانہ سے اپنا مدعا حاصل کریں، ____ یہی صبر اور رجوع الی اللہ اللہ کی مدد کی کلید اور کامیابی کا ہتھیار ہے اور بے صبری اور خالق کے بجائے، مخلوق

بھروسہ، مؤمن کے لئے ناکامی و نامرادی کا پیش خیمہ، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یہ آخری فقرہ صبر کی مزید تاکید کے لئے ہے، کیوں کہ صبر ایک مشکل کام ہے یہ اپنے جذبات کی آگ کو اپنے آپ بجھانا، اور نفس کے تقاضوں کو آپ قتل کرنے کے مترادف ہے، انسان کا کسی مقصد کے لئے یکبارگی جان دیدینا، نسبۃً آسان ہے، لیکن کسی کاز کے لئے گھٹ کر مرنا اور مسلسل اپنے جذبات کو تختۂ دار پر چڑھانا بہت دشوار، اسی لئے شاعر نے خوب کہا ہے:

سلگنا اور شئی ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ پروانوں سے کیا ہوگا

موجودہ حالات میں ہمیں اپنے آپ سلگنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے، ہمارے دل حوصلۂ و ہمت سے معمور ہوں، ہمارے جذبات کی لگام حکمت وشعور کے ہاتھوں میں ہو، ہماری پیشانی میں خدا کے یقین کا نور ہو، اور ہمارے ہاتھ اپنے خالق کے حضور اٹھے ہوئے ہوں، یہی ہمارے لئے کامیابی کا راستہ ہے اور اسی طرح ہم اللہ کی مدد کے مستحق ہوسکتے ہیں۔

(۹ر نومبر ۲۰۰۱ء)